ہر خاص و عام بالخصوص سکول و کالج،
دینی مدارس کے طلبہ و طالبات کو قرآن کریم کے
معانی و مطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سیکھنے کیلئے، لفظ بہ لفظ،
اردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دورانیہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دلنشین تعلیمی تفسیر

ذخیرۃُ البرہان فِی فہمِ القرآن

جلد 3

تِلْكَ الرُّسُلُ ③

سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر علم کا ایک باب سیکھ لے تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

ترتیب و تالیف: قاری محمد اکرام غفرلہ
مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

ہر خاص وعام بالخصوص سکول وکالج،
دینی مدارس کے طلبہ وطالبات کو قرآن کریم کے
معانی ومطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سیکھنے کیلئے، لفظ بہ لفظ،
اُردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دورانیہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دلنشین تعلیمی تفسیر

ذخیرۃُ البُرھان فِی فَھمِ القُرآن

جلد 3

تِلْكَ الرُّسُلُ ③

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر عمل کا ایک باب سیکھ لے تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

مرتب ومؤلف: قاری محمد اکرام غفر لہٗ
مدرس: مدرسہ فیض القرآن اودھروال (ضلع چکوال)

تمام حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: ذخِيرَةُ البُرْهَان فِي فَهْمِ القُرْآن

تِلْكَ الرُّسُلُ ③ (جلد 3)

صفحات: 386

ترتیب وتالیف: قاری محمد اکرام غفرلہٗ

مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

0300-5902896

ٹائٹل وکمپوزنگ: ظفر محمود ملک

النور مینجمنٹ چکوال 0334-8706701

ناشر: مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

تاریخ اشاعت: 24 صفر المظفر ہفتہ 1448ھ بمطابق 08 جولائی 2026

ویب سائیٹ: www.umarlibrary.org

فہرست مضامین

عرضِ مرتب 9
انبیاء کرام علیہم والسلام کے فضائل بیان کرنے میں
احتیاط/ تین انبیاء کرام علیہم والسلام کے خصوصی فضائل 11
خصائص وکمالات میں فرق 11
مجموعی اور کلی فضیلت اور جزوی فضیلت/ آپ ﷺ کی افضلیت
.... 15
خاص تین انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کا ذکر........ 17
آپ ﷺ کی رسالت عامہ 18
انفاق فی سبیل اللہ/ آیت الکرسی کے فضائل/
اور اس میں اللہ تعالیٰ کی گیارہ صفات 20
انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت 20
ظلم کے لغوی واصطلاحی معنی اور اس کی تشرح 21
آیت الکرسی قرآن کریم کی عظیم آیت 22
اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی گیارہ صفتوں کا ذکر 24
لفظ کُرْسِیُّہٗ کی تحقیق اور اہلِ سنت کا بنیادی عقیدہ 26
وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا کی تشریح وتفسیر 27
الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ اللہ تعالیٰ کے دو بابرکت اور صفاتی نام 27
لفظ "اللہ" واحد ہی رہے گا، اس کی نہ جمع بن سکتی ہے نہ تثنیہ 28
آیت الکرسی کی احادیث میں فضیلتیں 28
قبول اسلام میں کوئی جبر نہیں/ طاغوت کا مفہوم اور اس کے
مصداق/ ہدایت کا نور اور ظلمات کے اندھیرے 30
اسلام کا ایک اہم اُصول 30
خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طرز عمل 32
دین سے ارتداد پوری امت سے بغاوت 33
الطَّاغُوْت کا معنی ومطلب اور اس کی تحقیق 34
ایک قرآنی اور اسلامی استعارہ 34
لفظ ولی لغوی اور قرآنی مفہوم 35
حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک برگزیدہ نبی اور رسول/
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ 38
نور والوں کے پیشوا، اور تاریکی والوں کا پیشوا 38
شرک کی تین اقسام 40
ربوبیت کے بارے میں بَحث ومُباحَثہ 41
مکالمہ اور مناظرہ میں ایک باریک نکتہ 43
ظلم اور ہدایت میں تضاد 44
فلسفۂ موت وحیات، کون لوگ مَر کر بھی زندہ ہیں؟/
علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک کا مشاہدہ . 45
حیات بعد الممات کا مسئلہ اور اسلامی نقطہ نظر.......... 45
دنیا میں چار بادشاہوں کو پوری زمین کی بادشاہی ملی 47
موت کے بعد انسان قیامت تک کہاں ہوتا ہے؟.... 49
عالم برزخ کا مشاہدہ ممکن نہیں 49
قبر میں حیات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام پر اُمت اسلامیہ کا
اجماع 51
کسی چیز کو تسلیم اور یقین کر لینے کے تین درجے 54
کمال قدرت کا مشاہدہ/ پرندوں کی موت وحیات/ یقین کے
تین درجات کا مشاہدہ/ معجزہ اور کرامت 55
ایمان کی اعلیٰ ترین سطح (حق الیقین) 55
چار پرندوں کے زندہ ہونے کا ایمان افروز واقعہ 57
علم الیقین (علم اور دلیل) ابتدائی درجہ 58
عین الیقین (مشاہدہ اور بصیرت) درمیانی درجہ 58
حق الیقین (اعلیٰ ترین درجہ) 59
اجر وثواب کے درجات/ معیارِ قبولیت/ سائل کے ساتھ نرم
رویہ 63

فِیْ سَبِیْلِ اللهِ سے خاص جہاد مراد ہے 63
اسلام میں اعمال کی قبولیت کا بنیادی معیار 65
احسان جتلانا نیکی کو تباہ کر دیتا ہے 66
ناکام و نامراد لوگ 67
صدقہ کر کے احسان جتلانا حرام ہے 68
لفظ اقوات کا بنیادی معنی اور مفہوم 69
صدقہ باطل ہونے کی وجوہات اور صدقہ وخیرات کی قبولیت کا
معیار/ چٹان اور باغ کی مثال 70
انفاق کے مقبول ہونے کی لازمی شرائط 70
انفاق فی سبیل اللہ کی قبولیت اور اس کا ثواب پانے کا
دارومدار 73
"جَنَّةٌ" کی تفسیر اور اس کا قرآنی مفہوم 75
نام و نمود اور ریاکاری کی مذمت/ ریاکاری ایک معاشرتی
برائی 78
اخلاص کے ثمرات اور ریاکاری کے نقصانات 78
اعمال کی بربادی 80
ریاکاری مذموم وصف 81
صدقہ وخیرات کے مقبول ہونے کی چھ شرائط 81
شرکِ اصغر (چھوٹا شرک) 82
شیطان انسان کا کھلا دشمن 84
کمائی کی مختلف صورتیں/ راہِ خُدا میں پاکیزہ مال خرچ کرو/
زرعی پیداوار کا حکم/ خبیث مال قابل قبول نہیں 85
مشتبہ مال کی خیرات درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی 85
کمائی کی مختلف صورتیں 87
زرعی پیداوار میں عشر کی ادائیگی فرض 87
ایک شبہ کا ازالہ 88
شیطانی وسوسوں (ڈر اور بخل) کو رد کرنے کی ترغیب 90
اسلامی تناظر میں حکمت کی مختلف جہتیں/ منت/
نذر ماننے کے مسائل و احکام 92
حکمت کی تفصیل اور اس کا مفہوم 92
علم نافع کے متعلق نبی کریم ﷺ کی دعا 94
دین کی سمجھ آجانا حکمت اور سب سے بڑی دولت ہے 95
گناہ کے کام کی نذر پوری کرنا جائز نہیں 96
نذر کا مال غرباء و مساکین کا حق ہے 97
حاصل کلام 98
صدقہ خفیہ دینا بہتر ہے یا اعلانیہ؟/ صدقہ وخیرات کے
دنیاوی و اخروی فوائد/ غیر مسلم کے لیے صدقہ 100
صدقہ اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر دینے والا عمل
.... 100
صدقہ اسلام میں ایک انتہائی اہم اور فضیلت والا عمل 102
انسانیت کی خدمت اخلاقی فریضہ 103
صدقہ تمام بیماریوں کے لیے علاج اور شفاء 103
فرضی صدقہ اور نفلی صدقہ دینے کا طریقہ 104
رضائے الٰہی کے ذرائع 104
محصور فقراء مراد کون لوگ ہیں؟/
فقراء کی پہچان گداگری حرام ہے 107
صدقات کا بہترین مصرف 107
صدقہ وخیرات کے زیادہ مستحق 110
اکسابِ ضارہ کا معنی اس کا بنیادی مفہوم 113
سود کی ممانعت قرآن وحدیث کی رُو سے/
سود کی حرمت اور تباہ کاریاں 115
صدقات وخیرات کے احکام کا تتمہ 115
سود کھانے سے توبہ نہ کرنے والے لوگ جہنم میں جائیں گے
.... 120
سود کے متعلق نبی اکرم ﷺ کے ارشادات 121
سود! انسانوں کو ہلاک کرنے والا گناہ/ سود خوروں کے لیے
تعزیر/ حکومت وقت کی ذمہ داری 123
صدقات بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ
.... 123
مالِ حَرام بُود بجائے حَرام رَفت 124

اہل ایمان کے اوصاف اور ان کا انعام 125
ایجابی اور سلبی کا معنی ومفہوم 126
سود کی حرمت کے نفاذ کے دو طریقے 127
حکومت وقت کی ذمہ داری 128
سود خوری کے خلاف اللہ کا اعلان جنگ/سود کی حرمت
اور اس کی مختلف شکلیں 130
مسلمان حاکم کا فرض 130
مقروض تنگدست کو مہلت دینے کی فضیلت 132
اسلامی نظامِ معیشت کا بنیادی مقصد 133
قرآن پاک کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت
.... 134
سود کی بعض قسمیں 134
مضاربہ، مشارکہ، مرابحہ اور اجارہ کا مختصر اور جامع مفہوم .. 135
عصرِ حاضر میں ہم کیا کریں؟ 137
ایک اہم نکتہ 138
قرض کا اسلامی تصور اور موجودہ دور کی خرابیاں/
قرض لینے کے احکام وآداب 140
"آیَۃُ الْمُدَایَنَۃِ" قرآن کی سب سے لمبی آیت 140
قرض چکانے کے لئے ادھار میں معاملہ کرنے کا حکم . 142
قرض لینے کے احکام وآداب 144
قرض نادہندگی کے مسائل اور ان کا شرعی حل/
لوگوں کے قرض لینے کی چند بڑی وجوہات 148
قرض کے معاہدہ کو تحریر کیا جائے/گواہ بنانے کی حکمت .. 148
کیا تھوڑے قرضے کو بھی لکھا جائے؟ 151
قرض کے اسباب 153
قرض کی عدم ادائیگی کے اسباب 153
قرض کی ادائیگی کو کیسے محفوظ بنایا جاسکتا ہے؟ 154
رہن کی شرعی حیثیت اور اس کی مدت کا بیان نیز گروی رکھی
ہوئی چیز سے استفادے کا حکم 156
رہن کی شکلیں اور مالِ مرہون سے استفادہ 156
گواہی کا چھپانا کبیرہ گناہ 158
رہن اور تعذُّر کا بنیادی معنی ومفہوم 159
اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا ذکر 161
دل میں گزرنے والے خیالات پر محاسبہ نہیں 162
محاسبہ (احتساب یا جائزہ) معاقبہ (مواخذہ یا تادیب) . 163
اسلام کے تمام عقائد کا اجمالی تذکرہ 165
اسلام کے بنیادی عقائد 165
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف 169
کردارسازی (عملی نمونہ) 171
شریعتِ محمدی میں آسانیاں ہی آسانیاں/
سورۃ البقرہ کی فضیلت واہمیت 172
اللہ تعالیٰ کی رحمت وشفقت اور فضل وکرم کا تذکرہ 172
دین میں آسانی ہے 175
دِین میں آسانی کا مطلب 176
تین چیزوں کی درخواست 177
دعائیہ جملہ رضی اللہ عنہ کی تبدیلی کا طریقہ کار عربی گرامر کی رو سے
.... 177
سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتوں کی فضیلت 178
دُعائیہ آیتوں کے بعد 'آمین' 179
سورہ آلِ عمران کا بنیادی تعارف اور پس منظر/
علم محیط اور قدرت کاملہ کا عقلی تقاضا 180
اَلْحَیُّ اور اَلْقَیُّوْمُ اللہ تعالیٰ کی خاص صفات 182
پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے کا مطلب ومفہوم 183
فرقان کا معنی ومطلب 184
ہر چیز اللہ کی نظر میں 186
اللہ رب العزت کی قدرت کا بیان 186
تاویلات کی شرعی حیثیت/علمِ تاویل کی تعریف وتوضیح 188
آیات متشابہات اور تاویل کا معنی ومفہوم 188
فتنہ سے مراد شر وفساد ہے 191
من گھڑت تاویلات کا شرعی حکم 192

خلاصہ کلام.......... 194
استقامت اور رحمت کی دُعا/ خاتمہ بالخیر کی دعا 196
ہدایت پر استقامت 196
دعا کے فضائل و برکات 198
نظریہ آخرت 198
مال اور اولاد کی خاطر طرح طرح کی بدعنوانیاں 200
گناہوں میں مبتلا اور تکبر کرنے والوں کا انجام 201
چند ہی سال میں اسلام کا بول بالا/ فتح اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی
نشانیوں میں سے بڑی نشانی 204
یہود مدینہ بالخصوص اس آیت کے مخاطب 204
یہودِ مدینہ کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین 206
نصرتِ خداوندی.......... 208
جوان اور نوجوان کے درمیان بنیادی فرق 208
بصارت اور بصیرت سے مراد 209
دنیاوی زندگی گزارنے کا سامان/عورت جس قدر عفت مآب
ہوگی صاحب فضیلت اور صاحب کمال ہوگی.......... 211
من پسند چیزوں کی محبت 211
پارلیمان میں خواتین کی نمائندگی 213
اسباب ضلالت.......... 214
قرآن مجید کا تصور فلاح ونجات/ دنیا وآخرت میں
فلاح وکامیابی دلانے والے اعمال 218
انسان کی ابدی فلاح 218
اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی.......... 220
مومن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد 221
اہل تقوی کی صفات 222
وحدتِ دین نہ کہ وحدتِ ادیان/ دعوت کے کام میں استقامت
.... 225
کائنات کی تخلیق وتدبیر میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔
.... 225
اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا.... 227
داعی پوری دردمندی اور جذبہ دروں کے ساتھ دعوت دیتا
رہے.......... 230
انبیاء علیہم السلام کے قاتلوں اور حق وانصاف کے
دشمنوں کے متعلق حکم/ افتراء فی الدین 233
بنی اسرائیل کے تین جرائم 233
کفر کی کئی قسمیں.......... 234
شفاعت کا غلط عقیدہ 238
قانون جزاء وسزا کی وضاحت 239
زمین وآسمان کا مالک اور سارے جہان کا بادشاہ
اللہ ہی ہے/تغیرات اور تصرفات کرنے والی ذات ... 242
احادیث سے ثابت شدہ اسم اعظم.......... 242
نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشینگوئی.......... 244
مسلمانوں کا دنیا میں عدل وانصاف 245
رات دن اور موسموں کا تغیر وتبدل 247
کفار ومشرکین سے دوستی کی ممانعت/
تعلقات وسلوک کے تین درجات 249
غیر مسلم سے دوستی یا دلی محبت رکھنا 249
اضطراری حالت کے مسائل.......... 250
کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے 251
اہل بدعت رشتہ داروں سے تعلقات کا حکم 252
وسعتِ علمِ الٰہی.......... 254
کائنات کی ہر شے کا احاطہ.......... 255
اعمال کی مکمل حاضری.......... 255
انتباہ اور تیاری کا درس 256
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت، شرط ایمان/ اطاعتِ الٰہی
اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مراد.......... 258
محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معیار.......... 258
اطاعتِ الٰہی سے مراد 260
اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مراد.......... 261
انسان کی برتری اور فوقیت کا بنیادی راز.......... 262

سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ کا معنی ومفہوم 264
بچہ کی پیدائش کے بعد کے امور/ اسلام میں یتیموں کے حقوق
اوران کی اہمیت 266
مُحَرَّرًا کا معنی اوراس کی مختصر تشریح 266
نومولود کے لیے شرعی تقاضے 268
معجزہ اور کرامت میں بنیادی فرق 270
اولاد کا حصول انسان کے اپنے بس میں نہیں/
حضرت زکریا علیہ السلام کا حیرت واستعجاب 274
نیک اولاد کے لیے قرآنی دعائیں 274
اولاد کے لیے وظیفہ 275
حضرت یحییٰ عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام
کے چار اوصاف 276
اسباب کا فقدان 278
نشانی کی حکمت/ اہم روحانی پیغام 280
خواتین عالم میں پانچ خواتین کی خصوصی فضیلت/
کیا انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے پاس علم غیب تھا؟
.... 282
نیکی کے چار مراتب 282
قنوت کا معنی ومفہوم 284
قرعہ اندازی کی شرعی حیثیت 285
نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور علم غیب 288
حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی صفات/
کن بچوں نے دودھ پینے کی حالت میں بات کی ہے؟ 290
حضرت مسیح علیہ السلام سے مراد 290
ماں کی گود میں کلام کرنے والے بچے 292
حضرت مریم علیہا السلام کا حیرت واستعجاب 294
توراۃ وانجیل کا معنی ومفہوم 295
معجزات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام/
اسلام میں تصویر کا حکم/ معجزات کا انکار 298
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار معجزات 298
مختلف انبیاء علیہم السلام کے نمایاں معجزات 302
حلت وحرمت اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ 304
اعتقاد (یقین ونظریہ) اور عمل (کردار واطاعت)
ایک دوسرے کے لازم وملزوم 306
عَبْدِیَّت بندہ ہونے کا اقرار 306
الحَوَارِیُّوْنَ سے مراد اوراس کی تشریح 308
کتاب وسنت کے ساتھ اپنا تعلق محکم کرنا 310
مخفی تدابیر کا استعمال آدمی کی کمزوری کی دلیل 311
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور قادیانیوں کی غلط تاویل
رفع ونزول عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ 313
"مُتَوَفِّیْكَ" کا معنی اوراس کی تشریح 313
حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے پانچ وعدے 316
دنیاوی عذاب اور اخروی عذاب 317
ایمان کے تقاضے پورے کرنے والے 318
نبوت کے واضح دلائل 319
قرآن کریم میں عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور موجودہ عیسائیت
.... 320
عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں عقیدہ
.... 320
گمراہ کن عقیدہ لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ 322
نصاریٰ کی افسانہ طرازی 323
غلو آمیز عقائد پر مناظرہ 324
مُباہلہ کا عمومی مفہوم 325
مباہلہ کس میں ہونا چاہئے 326
عقائد کی صداقت پر وثوق 327
دعوت وتبلیغ میں حکمت وفراست کی اہمیت/ اصول مکالمہ
.... 328
تین مشترکہ باتوں کی دعوت 328
یہود ونصاریٰ کا دعویٰ 330
علم تاریخ کی اہمیت 331

ناحق بحث سے ممانعت 332
حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی تین صفتیں 333
فن کی آڑ میں فحاشی کا فروغ / تدارک کے لیے اجتماعی ذمہ داری / اہل کتاب کی مذہبی بدبختی کے بنیادی عوامل 335
اللہ کے برگزیدہ بندوں کی نسبت 335
ڈیجیٹل دور اور بے راہ روی 337
دیدہ دانستہ اللہ کی آیتوں کا انکار 339
اہل کتاب کی مذہبی بدبختی 340
دشمنانِ اسلام ہمہ وقت محوِ فکر و عمل ہیں 343
انتہا پسند کفار کی سازشیں 343
چھ سو سال تک دنیا میں مسلمانوں کا عروج 345
فضیلت اور برتری کے اصل حقدار 347
ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے سے نہ کھاؤ / اسلام میں ایفائے عہد اور وعدے کی پاس داری کی اہمیت 349
دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کا باطل فلسفہ 349
ایفائے عہد کی اہمیت و فضیلت 353
اہل کتاب کی بدعہدی 354
انبیاء کی بعثت انسانیت کی سب سے اہم ضرورت 357
تحریفِ لفظی، تحریفِ معنوی کا معنی و مفہوم 357
بشریت انبیاء انسانیت کا اعلیٰ ترین معیار 361
رَبّٰنِيّٖنَ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم 363
مخلوق کی طرف عبدیت کی غلط نسبت (شرک) 364
آیت کا استعجابی انداز 365
اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے کس بات کا وعدہ لیا؟ 367
اللہ تعالیٰ کے تین عہد 367
عربی زبان میں فَسَقَ کا مطلب و مفہوم 371
اللہ کا دین اور فطرت 372
کل انبیاء اور رسولوں کی تعداد / قرآن مجید میں سابقہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت رسول ﷺ کی پیش گوئیاں 374
بنی اسرائیل میں مبعوث ہونے والے انبیاء اور رسولوں کی تعداد 374
آپ ﷺ کی فرماں برداری اور اطاعت کا راستہ 378
مرتد شخص کافر سے زیادہ مجرم 379
ابدی خیر اور سکون سے محروم لوگ 380
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا کے تناظر میں بنیادی پیغام 381
توبہ کی قبولیت کا قانون / سچی توبہ کی قبولیت کی بنیادی شرائط 382
توبہ کے بعد اصلاح کی شرط! 382
جن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی 383
توبہ بندگی سے مشروط 385
روزِ قیامت دنیاوی مال و دولت، سفارش یا فدیہ کام نہ آئیگا 385

☆☆☆☆

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِيَّ بَعْدَهٗ!

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ نے امت کی رہنمائی کے لیے دو چیزیں چھوڑی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید، اور دوسرا اپنا طریقہ زندگی، جس کو ہم سنت رسول ﷺ کہتے ہیں۔ یہ امت جب تک ان دونوں سے اپنے آپ کو وابستہ رکھے گی، ان شاء اللہ راہ راست پر رہے گی، اور گمراہی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے گی، اسی لیے علماء امت نے ہر دور میں اور ہر زبان میں قرآن مجید کے تراجم اور حدیث پاک کی شروحات کی طرف توجہ کی ہے، جس سے امت کے افراد رہنمائی حاصل کر کے پاکیزہ زندگی گزار سکتے ہیں۔

بفضلہ تعالیٰ ذخیرۃ البرھان فی فھم القرآن پہلی جلد: الٓمّٓ دوسری جلد: سَيَقُوْلُ مقبول ہوئی، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ اس کے بعد حوصلہ مزید بڑھا تو اب یہ اسی سلسلے کی تیسری جلد: تِلْكَ الرُّسُلُ کا پارہ تیار ہو کر pdf کی صورت میں منظر عام پر ہے۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی اس عارضی حیات مستعار میں اس سلسلے کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیں، اور اس تفسیر کی طباعت کا انتظام واسباب مہیا فرما دیں۔ اور طلبائے عظام، علمائے امت، خطبائے کرام، مدرسین کو اس کی قدر دانی کی توفیق دے کر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اسے دنیا کے گوشے گوشے میں عام کرنا چاہیئے تاکہ قرآن کریم سے مسلمانوں کا رشتہ دوبارہ بحال ہو جائے۔

غلطیاں اور کوتاہیاں انسان کے خمیر میں ہیں، اور یہی دراصل کتاب اللہ اور کتاب الناس میں مابہ الامتیاز ہے، (یہ لفظ عربی زبان کا مرکب ہے۔اس کا لغوی اور بنیادی مطلب" وہ چیز یا خوبی جس کی وجہ سے دو چیزوں یا افراد کے درمیان واضح فرق یا پہچان ہو سکے یعنی یہ وہ بنیادی خصوصیت ہوتی ہے جو ایک چیز کو دوسری چیز سے ممتاز (الگ) کرتی ہے۔) انسان کے قلم و دماغ سے نکلنے والی وہ کون سی بات و کتاب ہے جس میں ذلت اور سہو کا امکان نہ ہو؟ اور اس کمترین غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخرَ کے لیے تو امکان ہی نہیں بلکہ اس کا ایقان ہے۔

لہٰذا قلم نے جو کچھ صحیح باتیں قرآن پاک کی تشریح کے ضمن میں لکھی ہوں وہ محض اللہ تعالی کی نوازش و توفیق اور والدین اساتذہ واہل خانہ کی دعاؤں نیز بزرگوں کی کاوشوں اور ان کے علمی ذخیروں سے استفادہ کا ثمرہ ہے۔لیکن خدانخواستہ اگر کچھ غلطی ہوئی ہو تو وہ خود راقم الحروف کی تقصیر اور کوتاہی ہے، جس کے لیے عند اللہ عفو و درگذر اور عند الناس صحیح و مشورہ کا طالب ہے۔ یا اللہ ہمیں اپنے دین کے کاموں میں لگا لیجئے! نفس و شیطان اور ہر شر سے بچا کر تمام تالیفات و خدمات کو شرف قبولیت عطا فرما دیجئے اور انہیں ہمارے لئے ہمارے والدین کیلئے، اولاد ازواج کیلئے اساتذہ و مشائخ کیلئے محسنین و متعلقین اور مرحومین کیلئے دارین کی سرخ روئی کا ذریعہ بنا دیجئے، اللہ تعالیٰ میری اس خدمت کاوش کو شرف قبولیت عطا فرماویں اور امت کے لیے اس کو نافع بنائیں اور آئندہ بھی اس طرح کی مفید خدمات کی توفیق عطا فرماتے رہیں۔

قاری محمد اکرام غفرلہٗ

مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

2 صفر المظفر شب جمعہ 1448ھ بمطابق 16 جولائی 2026

انبیاء کرام عَلَیۡہِمُ وَالسَّلَام کے فضائل بیان کرنے میں احتیاط/ تین انبیاء کرام عَلَیۡہِمُ وَالسَّلَام کے خصوصی فضائل

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ
دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ
شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ
اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ
اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۧ﴿۲۵۳﴾

خصائص وکمالات میں فرق

تِلْكَ	یہ	الرُّسُلُ	سب رسول	فَضَّلْنَا	ہم نے فضیلت دی		
بَعْضَهُمْ	ان کے بعض کو	عَلٰى بَعْضٍ	بعض پر				
مِنْهُمْ	کچھ ان میں سے	مَّنْ	(وہ ہیں) جن سے	كَلَّمَ اللّٰهُ	اللہ نے کلام فرمایا		
وَرَفَعَ	اور اُس نے بلند کیا	بَعْضَهُمْ	ان کے بعض کو	دَرَجٰتٍ	درجوں میں		
وَاٰتَيْنَا	اور ہم نے دیئے	عِيْسَى	عیسیٰ				

ابۡنَ مَرۡيَمَ	ابن مریم کو	الۡبَيِّنٰتِ	واضح دلائل (معجزات)
وَاَيَّدۡنٰهُ	اور اس کی تائید کی ہم نے	بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ	روح القدس (جبرائیل) کے ساتھ

وَلَوۡ	اور اگر	شَآءَ اللّٰهُ	چاہتا اللہ	مَا	(تو) نہ

اقۡتَتَلَ	باہم لڑتے	الَّذِيۡنَ	وہ لوگ جو
مِنۡ بَعۡدِهِمۡ	(ہوئے) اُن (رسولوں) کے پیچھے	مِّنۡ بَعۡدِ	اُس کے بعد
مَا جَآءَتۡهُمُ	کہ آئیں اُن کے پاس	الۡبَيِّنٰتُ	واضح نشانیاں
وَلٰـكِنِ	اور لیکن	اخۡتَلَفُوۡا	انہوں نے اختلاف کیا
فَمِنۡهُمۡ	پس کچھ اُن میں سے	مَّنۡ	(وہ ہیں) جو
اٰمَنَ	ایمان لائے	وَمِنۡهُمۡ	اور کچھ ان میں سے

مَّنۡ	(وہ ہیں) جنہوں نے	كَفَرَ	کفر کیا	وَلَوۡ	اور اگر

شَآءَ اللّٰهُ	چاہتا اللہ	مَا اقۡتَتَلُوۡا	تو وہ باہم نہ لڑتے

وَلٰـكِنَّ	اور لیکن	اللّٰهَ	اللہ	يَفۡعَلُ	کرتا ہے

مَا يُرِيۡدُ	جو وہ چاہتا ہے۔(253)

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اس آیت میں انبیاء کرام عَلَیہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی عظمت وشان کا بیان ہے،انبیاء ورسل عَلَیہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی سب سے بڑی فضیلت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت ورسالت عطا فرمائی۔اس لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا کہ مجھے کسی پیغمبر پر فضیلت نہ دو۔اور یاد رہے کہ نبی ہونے میں تو تمام انبیاء کرام عَلَیہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام برابر ہیں اور قرآن میں جہاں یہ آتا ہے کہ ہم ان میں کوئی فرق نہیں کرتے اس سے یہی مراد ہوتا ہے کہ اصل نبوت میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں البتہ ان کے مَراتب جدا گانہ ہیں،خصائص وکمالات میں فرق ہے،ان کے درجات مختلف ہیں،بعض بعض سے اعلیٰ ہیں اور ہمارے آقا صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم

سب سے اعلیٰ ہیں، یہی اس آیت کا مضمون ہے اور اسی پر تمام امت کا اجماع ہے۔ (خازن، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۲۵۳، ۱/ ۱۹۳، مدارک، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۲۵۳، ص ۱۳۰، ملتقطاً) یہاں آیت میں بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ بعض کو بعض سے افضل فرمایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ یوں نہیں کہنا چاہیے کہ بعض بعض سے ادنیٰ ہیں کہ یہ ادب کے مطابق نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام درجات میں مختلف ہیں اور فضیلت میں ایک دوسرے سے زیادہ ہیں، چنانچہ فرمایا: (وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ) [بنی اِسرائیل: 55] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی۔" مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ جیسے موسیٰ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے بارے میں آتا ہے: (وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا) [النساء: 164] "اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔" وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ: یہ بات اسی آیت میں پہلے بھی گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی، اب پھر فرمایا: "ان میں سے بعض کو درجات میں بلند کیا" اس سے ایک خاص شخصیت کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے، جسے سب جانتے ہیں، اس لیے نام لینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، جیسا کہ یہ آیت ہے: (سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ) [بنی اِسرائیل: 1] اس میں بھی اس بندے کا نام بتانے کی ضرورت نہیں پڑی اور وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

مجموعی اور کلی فضیلت اور جزوی فضیلت/ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت

تفصیل اس کی یہ ہے کہ فضیلت دو طرح کی ہے، ایک مجموعی اور کلی فضیلت اور دوسری جزوی فضیلت، یعنی کسی ایک چیز میں دوسروں سے بڑھ کر ہونا، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کہ وہ خود، ان کے والد، دادا اور پردادا نبی تھے، یہ فضیلت کسی اور رسول کو حاصل نہیں، چنانچہ اس لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں "أَكْرَمُ النَّاسِ" یعنی سب لوگوں سے زیادہ معزز فرمایا۔ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: (واتخذ اللہ۔۔): 3353] حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ (60) ہاتھ قد عطا کیا اور انھیں اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، یہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی جزوی فضیلت ہے، کلی اور مجموعی طور پر ہمارے رسول ﷺ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے افضل ہیں، یہی صحیح عقیدہ ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ خود آپ ﷺ نے فرمایا: (أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ) "میں آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد کا قیامت کے دن سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں۔" (ترمذی) آپ ﷺ کی افضلیت کے لیے قرآن مجید ہی کافی ہے۔ دوسرے تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے جبکہ قرآن قیامت تک باقی ہے۔ مفسرین بالخصوص رازی نے آپ ﷺ کی افضلیت کو دلائل سے ثابت کیا ہے اور اس سلسلہ میں شبہات کے جواب دیے ہیں، لیکن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی رسول اللہ ﷺ کا فرمان بظاہر اس کے خلاف ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے موسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے بہتر نہ کہو۔" [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب وفاۃ موسیٰ ...: 3408] اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللهِ "اللہ کے انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت مت دو۔" [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ ...: 3414] علماء نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں، جن میں سے واضح ترین جواب دو ہیں، ایک یہ کہ آپ ﷺ کی مراد ہے کہ میری فضیلت ایسے انداز سے بیان نہ کرو جس سے دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کسر شان کا پہلو نکلتا ہو، کیونکہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ مسلمان اور یہودی کے جھگڑے کے موقع پر فرمائے تھے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ کسی نبی کو ایک ایک چیز میں دوسرے انبیاء سے افضل نہ بتاؤ، کیونکہ جزوی فضیلت کسی بھی نبی کی ہو سکتی ہے۔ امام شوکانی لکھتے ہیں: "اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بعض پر فضیلت حاصل ہے، لیکن حدیث میں فضیلت دینے سے جو منع فرمایا ہے اس سے مراد مقابلہ کی صورت میں ہے، یا جزوی فضیلت مراد ہے، لہٰذا کتاب وسنت میں کوئی تعارض نہیں۔" (ابن کثیر، فتح القدیر) بہرحال جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے باہمی فضائل بیان کیے جائیں تو صرف وہ فضائل بیان کریں جو قرآن مجید، احادیثِ مبارکہ یا اولیاء و محقق علماء سے ثابت ہوں، اپنی طرف سے گھڑ کر کوئی فضیلت بیان

نہ کی جائے اور ان فضائل کو بھی اس طرح بیان نہ کیا جائے جس سے معاذ اللہ کسی نبی عَلَیْہِ الصلوٰۃ والسلام کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہو۔

خاص تین انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کا ذکر

اس آیت میں جملہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام میں سے بطورِ خاص تین انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کا ذکر فرمایا گیا۔ ایک حضرتِ موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر بلاواسطہ کلام فرمایا جبکہ یہی شرف سیدُ الانبیاء صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو معراج میں حاصل ہوا۔ دوسرے نبی جن کا اس آیت میں تذکرہ ہے وہ حضرتِ عیسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام ہیں جنہیں روشن نشانیاں عطا ہوئیں، جیسے مردے کو زندہ کرنا، بیماروں کو تندرست کرنا، مٹی سے پرندہ بنانا، غیب کی خبریں دینا وغیرہ، نیز روحُ القُدُس یعنی حضرتِ جبریل عَلَیْہِ السَّلَام کے ذریعے آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی تائید کی گئی جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ تیسری وہ ہستی ہے جن کے بارے میں فرمایا کہ کسی کو ہم نے درجوں بلندی عطا فرمائی اور وہ ہمارے آقا و مولا ملجاء و ماویٰ، حضور پرنور، سیدُ الانبیاء، محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ہیں کہ آپ کو کثیر درجات کے ساتھ تمام انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پر فضیلت عطا فرمائی، اس عقیدے پر تمام امت کا اجماع ہے اور یہ عقیدہ بکثرت احادیث سے ثابت ہے۔ اس آیت میں حضورِ اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی اِس رفعت ِمرتبہ کا بیان فرمایا گیا اور نامِ مبارک کی تصریح نہ کی گئی اس سے بھی حضورِ اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی بلندیِ شان کا اظہار مقصود ہے کہ ذاتِ والا کی یہ شان ہے کہ جب تمام انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پر فضیلت کا بیان کیا جائے تو سوائے ذاتِ اقدس کے یہ وصف کسی پر صادق ہی نہ آئے اور کسی اور طرف گمان ہی نہ جائے، حضور پُرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے وہ خصائص و کمالات جن میں آپ تمام انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پر فائق و افضل ہیں اور ان میں آپ کا کوئی شریک نہیں، بے شمار ہیں کیونکہ قرآنِ کریم میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ درجوں بلند کیا اور ان درجوں کا کوئی شمار قرآنِ کریم میں ذکر نہیں فرمایا گیا تو اب ان درجوں کی کون حد لگا سکتا ہے؟

آپ ﷺ کی رسالت عامہ

ان بے شمار خصائص میں سے بعض کا اجمالی اور مختصر بیان یہ ہے کہ آپ کی رسالت عامہ ہے یعنی تمام کائنات آپ کی امت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ’’وَمَا أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا‘‘ (سبا: ۲۸) اور اے محبوب! ہم نے آپ کو تمام لوگوں کیلئے خوشخبری دینے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: لِيَكُونَ لِلْعَٰلَمِينَ نَذِيرًا (فرقان: ۱) تاکہ وہ تمام جہان والوں کو ڈر سنانے والا ہو۔ مسلم شریف کی حدیث میں ارشاد ہوا ’’أُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً‘‘ میں (اللہ تعالیٰ کی) تمام مخلوق کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہوں۔ (مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، ص ۲۶۶، الحدیث: ۵(۵۲۳)) نیز آپ پر نبوت ختم کی گئی، قرآن پاک میں آپ کو خَاتَمَ النَّبِيِّينَ فرمایا گیا۔ (احزاب: ۴۰) حدیث شریف میں ارشاد ہوا ’’خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ‘‘ مجھ پر نبوت ختم کر دی گئی۔ (مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، ص ۲۶۶، الحدیث: ۵(۵۲۳)) نیز آپ کو تمام انبیاء کرام عَلَيْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام سے زیادہ معجزات عطا فرمائے گئے، آپ کی امت کو تمام امتوں پر افضل کیا گیا، حوضِ کوثر، مقامِ محمود، شفاعتِ کبریٰ آپ کو عطا ہوئی، شب معراج خاص قرب الٰہی آپ کو ملا، علمی وعملی کمالات میں آپ کو سب سے اعلیٰ کیا اور اس کے علاوہ بے انتہا خصائص آپ کو عطا ہوئے۔ (مدارک، البقرۃ، تحت الآیۃ) وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِن بَعْدِهِم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَٰتُ تو نبیوں کے بعد آنے والے لوگ واضح نشانیاں آجانے کے بعد نہ لڑتے۔ یعنی اگر مشیت الٰہی چاہتی تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتی اور وہ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا نہ کرتے۔ دوسری جگہ فرمایا: وَلَوْ شَاءَ لَهَدَىٰكُمْ أَجْمَعِينَ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ مگر لوگ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی کام پر مجبور نہیں کیا۔ بلکہ خیر وشر کے دونوں راستے دکھا کر انسان کو اپنے ارادے کے مطابق عمل کرنے کا اختیار دے دیا۔ ’’فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ‘‘ جو چاہے ایمان لائے اور جو

چاہے کفر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کے ارادے کو سلب نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان کی فضیلت باقی نہ رہتی۔ اس کا امتحان نہ ہو پاتا اور وہ بے جان چیزوں کی طرح مجبور محض قرار پاتا۔ چنانچہ ان لوگوں نے نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا انہوں نے اختلاف کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ کہ ان میں کچھ لوگ ایمان لے آئے۔ اور کچھ دوسروں نے انکار کر دیا۔ اور کفر کا راستہ اختیار کیا جب اختلاف پیدا ہوگا تو پھر لڑائی بھی ہوگی اہل ایمان اور کفار ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنا پروگرام نافذ کرنا چاہے گا۔ لہٰذا ان کے درمیان ضرور ٹکر ہوگی اور یہی جہاد ہے جو اہل اسلام پر فرض کیا گیا ہے کیونکہ جہاد کے بغیر فتنہ وفساد کا قلع قمع نہیں ہو سکتا۔ فرمایا وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے سب ایک ہی راستے پر ہوتے اور ان میں کوئی اختلاف رونما نہ ہوتا مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل اور قوت عطا کی ہے۔ اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور پھر اسے اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے ارادے سے جونسا راستہ چاہے اختیار کرے۔ اگر صحیح راستہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ایمان پر راضی ہوتا ہے کفر پر راضی نہیں ہوتا اہل ایمان کو نجات دے گا اور ان کو فلاح حاصل ہوگی۔ فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ وہ چاہتا تو یہ لوگ اختلاف کا شکار نہ ہوتے وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ مگر اللہ تعالیٰ وہ کچھ کرتا ہے جو اس کا اپنا ارادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اور اپنے بندوں کو آزما کر اس کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ لوگ ایمان کا راستہ اختیار کریں اور جو لوگ کفر کے راستے پر چل نکلیں ان کے شر وفساد کو مٹانے کے لیے ایمان والے جہاد کریں تا کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو اور اللہ کا دین اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

انفاق فی سبیل اللہ/ آیت الکرسی کے فضائل/ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی گیارہ صفات

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا
خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٥٤﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ
الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا
الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا
يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ
وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿٢٥٥﴾

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت

يٰٓاَيُّهَا	اے	الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا	وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو
اَنْفِقُوْا	تم خرچ کرو	مِمَّا	اُس میں سے جو
رَزَقْنٰكُمْ	ہم نے دیا تمہیں	مِّنْ قَبْلِ	اس سے پہلے
اَنْ يَّاْتِيَ	کہ آجائے	يَوْمٌ	وہ دن

لَّا بَيْعٌ	(کہ) نہ خرید وفروخت ہوگی	فِيْهِ	اس میں
وَّلَا خُلَّةٌ	اور نہ کوئی دوستی	وَّلَا شَفَاعَةٌ	اور نہ کوئی سفارش

وَالْكٰفِرُوْنَ	اور کافر لوگ	هُمُ	وہی	الظّٰلِمُوْنَ	ظالم ہیں (254)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ مال سے محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور اگر اس میں سے خرچ نہ کیا جائے تو یہ بات انسان کے لیے فتنہ اور اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتی ہے۔انسان پر سب سے زیادہ مشکل جان ومال کی قربانی ہے اور عموماً شریعت کے احکام کا تعلق ان دونوں سے ہے۔اس سورت میں پہلے (وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)[البقرۃ:246] فرما کر جہاد کا حکم دیا اور آیت: (مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ..)[البقرۃ:245] سے جہاد کے لیے مال خرچ کرنے کی ترغیب دی، اس کے بعد طالوت کے قصے کے ساتھ پہلے حکم کی تاکید کی اور اس آیت کے ساتھ دوسرے حکم کی تاکید کے لیے دوبارہ مال خرچ کرنے کا حکم دیا۔(رازی) مقصد یہ کہ انسان دنیاوی اسباب ووسائل کو چھوڑ کر اکیلا ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگا۔لہٰذا آخرت میں نجات کے لیے صدقہ وخیرات اور اس جیسے نیک اعمال کو وسیلہ بناؤ۔قیامت کے دن دنیاوی دوستی، رشتہ داری کا تعلق اور سفارش وغیرہ کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔(ابن کثیر)

ظلم کے لغوی واصطلاحی معنی اور اس کی تشرح

وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: اور کافر ہی ظالم ہیں ظلم کے لغوی معنیٰ "کسی چیز کو اس کے اصل مقام کے علاوہ کسی دوسری یا ناجائز جگہ پر رکھنا" ہیں۔اصطلاحی طور پر ظلم ناانصافی، حق تلفی، اور حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے؛ یعنی کسی کا حق چھین لینا یا کسی کے ساتھ انصاف کے خلاف کام کرنا ظلم کہلاتا ہے۔خالق کے حقوق میں ظلم (شرک): اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا قرآن کی رو سے سب سے بڑا ظلم ہے، کیونکہ اس کے ذریعے انسان بندگی کا حق کسی اور کو دیتا ہے جو کہ بہت بڑی ناانصافی ہے۔دوسروں کے حقوق میں ظلم: انسانوں کے ساتھ ناانصافی کرنا، کسی کی حق تلفی کرنا،

چوری، دھوکہ دہی، یا کسی بے گناہ کو سزا دینا ظلم کے زمرے میں آتا ہے۔ اپنی ذات پر ظلم: انسان خود اپنے گناہوں یا برے اعمال کے ذریعے اپنی روح اور دنیا و آخرت کو نقصان پہنچائے تو یہ بھی اپنی ذات پر ظلم کہلاتا ہے۔ کافروں کا ایمان کی جگہ کفر اور طاعت کی جگہ معصیت اور شکر کی جگہ ناشکری کو اختیار کرنا ان کا ظلم ہے اور چونکہ یہاں ظلم کا سب سے بدتر درجہ مراد ہے اسی لئے فرمایا کہ کافر ہی ظالم ہیں۔ ظلم کا متضاد انصاف اور عدل ہے۔ ظلم ایک انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے جس کے معاشرتی اور روحانی نقصانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ظلم کرنے والے کو قرآن و حدیث میں سخت تنبیہ کی گئی ہے اور اسے معاشرتی بگاڑ کا سب سے بڑا سبب مانا گیا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا منکر کافر ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منکرین زکوٰۃ سے جہاد کیا، جیسا کہ کفار سے کیا جاتا ہے۔ (قرطبی) ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے پہلے راہِ خدا میں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال خرچ کرلو۔ قیامت کا دن بڑی ہیبت والا ہے، اس دن مال کسی کو بھی فائدہ نہ دے گا اور دنیوی دوستیاں بھی بیکار ہوں گی بلکہ باپ بیٹے بھی ایک دوسرے سے جان چھڑا رہے ہوں گے اور کافروں کو کسی کی سفارش کام نہ دے گی اور نہ دنیوی انداز میں کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔ صرف اِذنِ الٰہی سے اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے شفاعت کریں گے۔ الغرض! آج یہ موقع ہے۔ یہ عمل کی دنیا ہے اس میں جو کچھ کر سکتے ہو کرلو۔ کل کو دار الجزاء میں جا کر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہاں تو بدلہ دیا جائے گا۔ اس روز نہ کوئی شخص نیکی خرید سکے گا۔ نہ کوئی دوستی کام آئیگی اور نہ کوئی سفارش کام آئے گی یہ سب کچھ بتلا دیا۔

آیت الکرسی قرآن کریم کی عظیم آیت

اَللّٰہُ	اللہ	لَآ اِلٰہَ		نہیں کوئی معبود (برحق)	اِلَّا ھُوَ	سوائے اس کے	
اَلْحَیُّ	ہمیشہ زندہ ہے		اَلْقَیُّوْمُ		سب کو سنبھالنے والا ہے		
لَا تَاْخُذُہٗ	نہ اسے آتی ہے	سِنَۃٌ	اونگھ	وَّلَا	اور نہ		

نَوۡمٌ	نیند	لَهٗ	اسی کا ہے	مَا	جو کچھ
فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں	وَمَا	اور جو کچھ		
فِي الۡاَرۡضِ	زمین میں ہے	مَنۡ	کون ہے؟	ذَا الَّذِيۡ	وہ جو
يَشۡفَعُ	سفارش کرے	عِنۡدَهٗۤ	اس کے پاس	اِلَّا	سوائے
بِاِذۡنِهٖ	اس کی اجازت کے	يَعۡلَمُ	وہ جانتا ہے		
مَا	جو کچھ	بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ	ان (لوگوں) کے سامنے ہے		
وَمَا	اور جو کچھ	خَلۡفَهُمۡ	ان کے پیچھے ہے	وَلَا	اور نہیں
يُحِيۡطُوۡنَ	وہ احاطہ کرسکتے	بِشَيۡءٍ	کسی چیز کا		
مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ	اس کے علم میں سے	اِلَّا	مگر		
بِمَا شَآءَ	ساتھ اُس چیز کے جو وہ چاہے	وَسِعَ	گھیر لیا ہے		
كُرۡسِيُّهُ	اس کی کرسی نے	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں کو		
وَالۡاَرۡضَ	اور زمین کو	وَلَا	اور نہیں	يَـُٔوۡدُهٗ	تھکاتی اس کو
حِفۡظُهُمَا	ان دونوں کی حفاظت	وَهُوَ	اور وہ		
الۡعَلِيُّ	بلند تر ہے	الۡعَظِيۡمُ	نہایت عظمت والا ہے۔(255)		

یہ آیت آیۃ الکرسی کے نام سے مشہور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمل معرفت بیان کی گئی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔اسی لیے یہ آیت قرآن مجید کی تمام آیتوں سے افضل ہے اس لیے کہ اس میں اللہ کی توحید اور اس کی صفات کا کامل اور جامع بیان ہے۔آیت الکرسی قرآن کریم کی عظیم آیتوں میں سے ایک ہے جس کے احادیث میں بہت زیادہ فضائل بیان کئے گئے ہیں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا تاؤ قرآن کریم میں کون سی آیت سب سے زیادہ عظمت والی ہے۔حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا آیت الکرسی۔ آپ ﷺ نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جواب

کو پسند فرمایا اور کہا کہ اے ابوالمنذر تمہیں علم و دانش مبارک ہو۔ یہ کنیت خاص طور پر جلیل القدر صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی ہے۔ وہ انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھنے والے بڑے اور نامور صحابی تھے۔ انہیں حضور نبی اکرم ﷺ نے سَیِّدُ الْمُسْلِمِین (مسلمانوں کے سردار) قرار دیا اور یہ اعزاز بخشا کہ قرآن کریم ان سے سیکھنے کی تاکید فرمائی۔

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی گیارہ صفتوں کا ذکر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی گیارہ صفتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے: ☆اَلْحَیُّ :: وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور باقی رہنے والا ہے اس کو فنا نہیں ہے۔☆ اَلْقَیُّوْمُ: وہ قائم ہے دوسروں کو قائم رکھتا ہے اور اپنے دست قدرت میں سب کو تھامے ہوئے ہے۔ ان دونوں صفتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام جھوٹے معبودوں کی نفی کر دی ہے جو نہ زندہ ہیں، نہ زندگی کا سرچشمہ نہ خود قائم ہیں اور نہ دوسروں کو قائم رکھنے والے ہیں وہ اپنی زندگی کے وجود کے لئے خود دوسروں کے محتاج ہیں۔☆ سِنَۃٌ : اونگھ۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے۔☆ وَّلَا نَوْمٌ نہ اس کو نیند آتی ہے۔ نیند کی ابتداء اونگھ ہے اور انتہا غفلت اور نیند۔ ان صفتوں میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اونگھ یا نیند سے پاک اور بری ہے، کیونکہ یہ چیزیں عیب ہیں اور اللہ تعالیٰ نقص وعیب سے پاک ہے۔ بائبل میں اللہ کے تھک جانے اور تھک کر آرام کرنے اور سستانے کا ذکر ہے، غالباً قرآن نے اسی باطل خیال کی تردید کی طرف اشارہ کیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کو نیند اور اونگھ آتی ہو اور جو تکان سے دو چار ہوتا ہو، وہ انسان کا معبود نہیں ہوسکتا۔☆ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ملکیت ہے، اسی کے اختیار میں ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف کرتا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں موجود ہر چیز کا وہی مالک ہے اور ساری کائنات میں اسی کا حکم چلتا ہے تو جب سارا جہان اس کی ملک ہے تو کون اس کا شریک ہوسکتا ہے، مشرکین یا تو ستاروں اور سورج کو پوجتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں یا دریاؤں، پہاڑوں، پتھروں، درختوں، جانوروں، آگ وغیرہ کی پوجا کرتے ہیں جو زمین میں ہیں تو جب آسمان و

زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مِلک ہے تو یہ چیزیں کیسے پوجنے کے قابل ہو سکتی ہیں ☆ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ایسا کون ہے؟ جو اس کے پاس سفارش کرے سوائے اس کی اجازت کے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اس کے بارہ میں سفارش کی مجال نہیں ہے البتہ کچھ مقبول بندے ہیں جن کو خاص طور پر کلام اور شفاعت کی اجازت دے دی جائے گی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ حشر کے دن میں سب سے پہلے ساری امتوں کی سفارش کروں گا۔اسی جگہ کا نام مقام محمود ہے۔یعنی قیامت میں انبیاء، شہداء اور بعض صالحین کو شفاعت کا حق دیا جائے گا؛ لیکن یہ شفاعت بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے تابع ہوگی، اللہ جس کی شفاعت کی اجازت دیں گے، ان ہی کے لئے یہ حضرات شفاعت کریں گے اور اس کے لئے اولین شرط ایمان کی ہے، جن لوگوں کی موت کفر و شرک پر ہوگی؛ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے خود اُصول مقرر کر دیا ہے کہ شرک کو معاف نہیں فرمائیں گے: ’’اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ ‘‘اس لئے ان کے لئے شفاعت کی اجازت بھی نہ ہوگی، اس میں مشرکین کے علاوہ ان مسلمانوں کے لئے بھی سخت تنبیہ ہے جو قبروں کو سجدہ کرتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یا اولیاء اللہ کو کائنات میں متصرف کہتے ہیں کہ یہ سب مشرکانہ افعال ہیں، اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائیں۔☆ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ یعنی وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔‘‘ یعنی ان کے گزشتہ اور آئندہ معاملات سے باخبر ہے۔یعنی وہ تمام معاملات کی تمام تفصیلات جانتا ہے یعنی اگلے پچھلے، ظاہر، پوشیدہ، غیب اور حاضر سب جانتا ہے۔ بندوں کو ان میں کوئی اختیار حاصل نہیں، نہ وہ ذرہ برابر معلومات رکھتے ہیں، سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ خود بتادے۔اس لئے فرمایا: ☆ وَلَا يُحِيۡطُوۡنَ بِشَىۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ فرمایا تمام کائنات کے ذرے ذرے کا علم محیط اس کو حاصل ہے یہ اسی کی خصوصیت ہے۔انسان یا کوئی دوسری مخلوق اس میں شریک نہیں ہے سوائے اس کے جو وہ اپنی مرضی سے کسی کو علم عطا کر دیتا ہے۔اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے ہمگر جتنا وہ چاہے۔

لفظ کُرْسِیُّہٗ کی تحقیق اور اہلِ سنت کا بنیادی عقیدہ

☆اسی لئے فرمایا:وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ: اس کی کرسی اتنی وسیع ہے کہ جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں اس کا یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اس کا اقتدار بلاشرکت غیرے ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے۔تفاسیر میں اس کی تشریح کے حوالے سے مختلف آراء ہیں: جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بشمول حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت یہ ملتی ہے کہ کرسی دراصل اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے کی جگہ ہے،اور عرش کی عظمت و حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔بعض مفسرین اور محققین کے نزدیک اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا لامحدود علم،اس کی کامل قدرت،اور سلطنت ہے۔بعض علماء کے نزدیک کرسی عرش کے سامنے ایک اور عظیم الشان مخلوق ہے،جبکہ بعض مفسرین (جیسے امام حسن بصری رحمہ اللہ) کے مطابق کرسی اور عرش ایک ہی چیز ہیں۔اس آیت کے جملے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کرسی آسمانوں اور زمین پر محیط ہے۔اہلِ سنت کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ کرسی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم الشان مخلوق ہے۔اس کی کیفیت انسانی عقل سے بالاتر ہے۔لہٰذا اس کی حقیقت کو بغیر کسی لفظی تحریف (تاویل) کے اور بغیر کسی کیفیّت کو بیان کیے،جوں کا توں ماننا فرض ہے۔

☆فرمایا اللہ تعالیٰ کو زمین اور ساتوں آسمانوں کی حفاظت کچھ بھی گراں نہیں ہے کیونکہ اس قادر مطلق کے سامنے یہ سب چیزیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔کیونکہ یہ کائنات اور اس کی وسعت لامحدود ہے اور اس کا احاطہ انسان کی بساط سے باہر ہے۔انسان جتنی طاقتور سے طاقتور دوربینیں ایجاد کرتا ہے،کائنات کی وسعت دیکھ کر اس کی حیرانگی میں مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔پھر بھلا وہ اس کے علم کا کیا احاطہ کر سکے گا۔انسان کا علم تو بس اتنا ہی ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عطا کیا یا پھر انسان نے خود بعض اشیاء پر تجربے کر کے حاصل کرلیا ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں پانی کی ایک بوند۔

وَلَا يَـُٔودُهٗ حِفۡظُهُمَا کی تشریح وتفسیر

☆وَلَا يَـُٔودُهٗ حِفۡظُهُمَا "حِفۡظُ" کا مطلب حفاظت کرنا،سنبھالنا یا نگہبانی کرنا ہے۔ جبکہ ضمیر "هُمَا" تثنیہ (دو کے لیے) ہے۔بعض مفسرین کے نزدیک "هما" کی ضمیر سے مراد خاص طور پر آسمان اور زمین ہیں۔تاہم بعض تفاسیر میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ان میں بسنے والی تمام مخلوقات ہیں یا پھر عرش اور کرسی ہیں۔ "آدَ ،يَؤُودُ" کا معنیٰ کسی چیز کا بھاری بوجھ بننا، مشقت میں ڈال دینا ہے۔کائنات کی اتنی وسیع وسعتوں اور آسمان و زمین کی دیکھ بھال اللہ تعالیٰ کے لیے ذرا بھی بوجھل نہیں۔ وَلَا يَـُٔودُهٗ کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کو اس نظام کو چلانے میں قطعی طور پر کوئی تھکن، مشقت یا کمزوری محسوس نہیں ہوتی۔یہ جملہ اللہ کی کامل قدرت، بے مثال طاقت اور اس کے قادر مطلق ہونے پر دلالت کرتا ہے۔کوئی بھی مخلوق خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، اللہ کے علم اور اس کی قدرت کی گرفت سے باہر نہیں۔مخلوق کتنی بھی بڑی ہو خود اپنی حفاظت نہیں کرسکتی جب کہ اللہ تعالیٰ کے لیے زمین وآسمان کی حفاظت کچھ بوجھ نہیں۔یعنی نہ وہ ان دونوں کی حفاظت سے تھکتا ہے۔"یعنی اس کے لئے ان کی حفاظت دشوار نہیں۔

الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ اللہ تعالیٰ کے دو بابرکت اور صفاتی نام

☆"وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ اللہ تعالیٰ کے دو بابرکت اور صفاتی نام ہیں۔"العلی" کے معنی سب سے بلند اور اعلیٰ ذات کے ہیں جبکہ"العظیم" کے معنی بے حد عظیم اور عظمت والے کے ہیں یہ دونوں نام اللہ کی لامحدود قدرت، بلندی اور کبریائی کو ظاہر کرتے ہیں۔الۡعَلِیُّ (سب سے بلند اور برتر) لغوی معنی: یہ'علو سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے بلندی۔مفہوم: اللہ تعالیٰ اپنی ذات، اپنی صفات اور اپنے اقتدار کے لحاظ سے تمام کائنات سے بلند و بالا ہے کوئی بھی مخلوق اس کے مرتبے یا مقام تک نہیں پہنچ سکتی۔اس کی بلندی مکان کی بلندی نہیں بلکہ شان اور مرتبے کی بلندی ہے۔الۡعَظِیۡمُ (سب سے زیادہ عظمت والا) لغوی معنی: یہ'عظمت سے ہے جس کا مطلب بڑائی اور کبریائی ہے۔مفہوم: اللہ تعالیٰ کی ذات تمام چیزوں سے بڑھ کر عظیم ہے۔اس کی عظمت کا احاطہ

کوئی انسانی عقل یا سوچ نہیں کر سکتی۔ وہ ہر عیب، کمزوری اور شریک سے پاک ہے۔ آیت الکرسی میں ان ناموں کی موجودگی اسے انتہائی بابرکت اور محافظ بناتی ہے۔ حدیث کے مطابق، اسے پڑھنے سے انسان ہر قسم کے شر اور شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہتا ہے عاجزی کا اظہار: ان ناموں کو یاد رکھنے سے انسان کے دل میں اللہ کی عظمت بیٹھ جاتی ہے، جس سے وہ اللہ کے احکامات کی اطاعت کرتا ہے اور تکبر سے دور رہتا ہے۔

لفظ "اللہ" واحد ہی رہے گا، اس کی نہ جمع بن سکتی ہے نہ تثنیہ

بلندی اور عظمت اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، مخلوق اللہ تعالیٰ کی بلندی اور عظمت کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ آخر میں اس آیت میں موجود ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ آیت باری تعالیٰ کے نام "اللہ" سے شروع ہوئی ہے، یہ نام تمام صفات کا جامع ہے، مخلوق میں سے کسی پر یہ نام نہیں بولا جاسکتا ہے۔ تمام مذاہب میں مذکور خداؤں کی تثنیہ و جمع بن سکتی ہے، مثلاً دیویوں، دیوتاؤں اور Gods وغیرہ مگر لفظ "اللہ" واحد ہی رہے گا، اس کی نہ جمع بن سکتی ہے نہ تثنیہ۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کی زبردست دلیل ہے، اگر اس نکتہ کو بھی شامل کرلیں تو آیت میں توحید کی بارہ دلیلیں موجود ہیں۔ اس آیت میں توحید الوہیت بھی ہے، توحید ربوبیت بھی اور توحید اسماء و صفات بھی۔ لہٰذا یہ آیت اکیلی ہی اللہ کے تمام اسماء و صفات اور تمام اسمائے حسنیٰ کے معانی کی جامع ہے۔

آیت الکرسی کی احادیث میں فضیلتیں

اور احادیث میں اس کی بہت فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، مثلاً: (1)...... آیتُ الکرسی قرآنِ مجید کی سب سے عظیم آیت ہے۔ (مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرہا، باب فضل سورۃ الکہف وآیۃ الکرسی، ص ۴۰۵، الحدیث: ۲۵۸ (۸۱۰)) (2)...... جو سوتے وقت آیتُ الکرسی پڑھے تو صبح تک اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے گا اور شیطان اس کے قریب نہ آسکے گا۔ (بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ البقرۃ، ۳ / ۴۰۵، الحدیث: ۵۰۱۰) (3، 4)...... نمازوں کے بعد

آیتُ الکرسی پڑھنے پر جنت کی بشارت ہے۔رات کو سوتے وقت پڑھنے پر اپنے اور پڑوسیوں کے گھروں کی حفاظت کی بشارت ہے۔وغیرہ وغیرہ (شعب الایمان، التاسع عشر من شعب الایمان، فصل فی فضائل السور والآیات، ۲/ ۴۵۸، الحدیث: ۲۳۹۵)۔

تیز رفتار دنیا میں جس میں ہم رہتے ہیں، روزمرہ کی زندگی کی ہلچل میں کھو جانا آسان ہے۔ہمیں مسلسل چیلنجوں، غیر یقینی صورتحال اور کمزوری کے لمحات کا سامنا ہے۔لیکن بحیثیت مسلمان، ہمیں قرآن کے تحفے سے نوازا گیا ہے جو ہدایت، سکون اور تحفظ کا ایک ابدی ذریعہ ہے۔اس کے ان گنت خزانوں میں سے آیت الکرسی بھی ہے، ایک ایسی آیت جو بے پناہ روحانی طاقت اور فوائد رکھتی ہے۔آیت الکرسی کی باقاعدگی سے تلاوت اللہ سے آپ کا رشتہ مضبوط کرتی ہے۔جب آپ ان الفاظ کو دہراتے ہیں، تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ آپ کا محافظ، محافظ اور آپ کی زندگی کے ہر پہلو کو کنٹرول کرنے والا ہے۔یہ روحانی تعلق آپ کے ایمان کو پروان چڑھانے میں مدد کرتا ہے، آپ کو یاد دلاتا ہے کہ چاہے آپ کو کتنی ہی مشکلات کا سامنا ہو، اللہ ہمیشہ آپ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔یہ آیت قرآن مجید کی سب سے طاقتور آیات میں سے ایک کے طور پر وسیع پیمانے پر پہچانی جاتی ہے۔یہ اللہ کے لامحدود اختیار، طاقت اور رحمت کو صرف چند سطروں میں سمیٹتا ہے، جو اسے سمجھ کر پڑھنے والوں کو خوف اور سکون کا احساس فراہم کرتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دیں آمین یارب العٰلمین

قبول اسلام میں کوئی جبر نہیں/ طاغوت کا مفہوم اور اس کے مصداق/ ہدایت کا نور اور ظلمات کے اندھیرے

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○
لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ
بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۵۶﴾
اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ‌ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا
اَوۡلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوۡتُ ۙ يُخۡرِجُوۡنَهُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۵۷﴾

اسلام کا ایک اہم اُصول

لَآ	نہیں	اِکۡرَاہَ	کوئی زبردستی	فِی الدِّیۡنِ	دین میں
قَدۡ	تحقیق	تَّبَیَّنَ	واضح ہو چکی ہے	الرُّشۡدُ	ہدایت
مِنَ الۡغَیِّ	گمراہی سے	فَمَنۡ	پس جو شخص		
یَّکۡفُرۡ	نہ مانے	بِالطَّاغُوۡتِ	گمراہ کرنے والے کو	وَیُؤۡمِنۡۢ	اور ایمان لائے
بِاللّٰہِ	اللہ پر	فَقَدِ	تو تحقیق	اسۡتَمۡسَکَ	اس نے تھام لیا

بِالْعُرْوَةِ	کڑا	الْوُثْقٰى	مضبوط	لَا انْفِصَامَ	نہیں ہے ٹوٹنا
لَهَا	اس کے لئے	وَاللّٰهُ	اور اللہ	سَمِيْعٌ	خوب سننے والا
عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا ہے۔(256)				

لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: ”(جاہلیت میں) اگر کسی عورت کے بچے زندہ نہ رہتے تو وہ یہ نذر مان لیتی تھی کہ اگر بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنادے گی، پھر جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان میں انصار کے کئی لڑکے تھے، انصار نے کہا: ”ہم انھیں نہیں چھوڑیں گے“ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔“ (أبوداؤد) اس آیت کریمہ سے اسلام کا ایک اہم اُصول معلوم ہوا کہ کسی کو مجبور کر کے اس کا مذہب تبدیل کرانا درست نہیں کیوں کہ مذہب کا تعلق دل کے اعتقاد و یقین سے ہے، جبر کے ذریعہ زبان سے تو اقرار کرایا جا سکتا ہے، دل کی دنیا نہیں بدلی جا سکتی، درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر و اکراہ ممکن بھی نہیں ہے اس لیے کہ ایمان کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے، اور جبر و اکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے اور جہاد و قتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہٰذا اس کے ذریعہ سے ایمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اسلام کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے، محض پروپیگنڈہ ہے، اسلام جب دنیا میں آیا تو ایک ہی شخص تھے، جو مسلمان تھے، وہی اسلام کا داعی اور خدا کے پیغمبر تھے، مکہ کا چپہ چپہ اُن کا مخالف تھا، پھر تیرہ سال تک مسلمان ان چند کمزور، نہتے اور مظلوم لوگوں کا مذہب تھا، جن پر کوئی ظلم وستم نہیں تھا جو روا نہ رکھا گیا ہو، اُس وقت اسلام کے پاس نہ تلوار تھی، نہ فوج، نہ سپاہ، آخر کونسی طاقت تھی جس کے ذریعہ اسلام نے چند ہی سال میں پورے جزیرۂ عرب کو مسخر کرلیا؟ یہ یقیناً اس کی عدل و انصاف پر مبنی، فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ اور عقل و دانش سے مطابقت رکھنے والی تعلیمات تھیں نہ کہ تلوار۔

خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طرز عمل

اسلام اور مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ کبھی کسی قوم یا فرد کو تلوار کی نوک پر مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ اسلام کو قبول کرے۔ بلکہ ظلم و بربریت کو مٹانے کے لئے حکم جہاد پر عمل کیا ہے۔ جنگ کے دوران نبی کریم ﷺ خلفاء راشدین، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طرز عمل یہ تھا کہ کمزوروں، بیماروں، عورتوں، زخمیوں، مذہبی پیشواؤں اور پرامن شہریوں پر تلوار اٹھانے یا گھر بار، کھیتی باڑی کو جلانے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ وہ لوگ جو اسلام کی دعوت میں آڑ اور رکاوٹ بننے کے لئے تلوار اٹھاتے تھے اسلام ان سے لڑنے کی اجازت دیتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ کے متعلق انگریزوں نے بڑا پراپیگنڈا کیا کہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بناتا تھا، مگر یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اورنگ زیب نے پچاس 50 سال تک ہندوستان پر حکومت کی، اگر وہ واقعی زبردستی اسلام میں داخل کرتا، تو کم از کم دہلی کے گردونواح میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہتا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، کہیں بھی غیر مسلموں کے ساتھ جبر کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسلام ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کا فروغ تبلیغ کے ذریعے ہوا ہے، تلوار کے ذریعے نہیں ہوا۔ برصغیر میں مسلمان آٹھ سو سال تک حکمران رہے ہیں۔ مگر کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا اسلام کے پاکیزہ اصولوں کی ترجمانی ضروری ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں کتنے غیر مسلم رؤسا تھے مگر کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی، کسی کو زبردستی دین میں داخل کیا جائے یہ تو اسلام کی تعلیم کے منافی ہے، کیونکہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ دین میں جبر نہیں ہے۔

قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ: ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں بالکل واضح ہو چکی ہے۔ انسان کو جو قوت ارادہ دی گئی ہے کہ وہ چاہے تو اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دے۔ ایسی ہی اطاعت کا نام دین ہے اور یہی ہدایت ہے اور دین کے عقائد اس آیۃ الکرسی میں وضاحت سے بیان ہو گئے ہیں اور چاہے تو اپنی اس قوت ارادہ کا آزادانہ استعمال کرے اور اسی کا نام کفر بھی ہے اور گمراہی بھی اور ان دونوں باتوں کی پوری وضاحت کر دی گئی ہے۔

دین سے ارتداد پوری امت سے بغاوت

اب ہر انسان دین اسلام کو اختیار کرنے کی حد تک تو آزاد ہے چاہے تو قبول کرے چاہے تو رد کر دے۔مگر اسلام کو قبول کر لینے کے بعد اسے اختیار نہیں رہتا کہ وہ دین کے احکام و ہدایات کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کر دے اور جو اسے معقول نظر آئے اسے تسلیم کر لے اور باقی کا انکار کر دے یا احکام میں سے کچھ پر عمل کرے اور جو اس کی طبیعت پر گراں گزریں یا ناپسند ہوں انہیں چھوڑ دے۔یہ بھی گمراہی ہے اور نہ ہی اسے دین اسلام کو چھوڑنے کا اختیار باقی رہتا ہے۔کیونکہ اسلام ایک تحریک ہے روائتی قسم کا مذہب نہیں۔لہذا دین سے ارتداد پوری امت سے بغاوت کے مترادف ہے۔اس آیت کی تفسیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں" جبر نیست برائے دین" یعنی دین اسلام میں داخلے کے لیے کسی شخص پر جبر روا نہیں ہے، تاہم اسلام میں فی الجملہ جبر موجود ہے اور اس سے مراد وہ تمام احکام ہیں جن کے ذریعے کسی پر سختی کی جاتی ہے۔مثلاً جہاد کا تعلق جبر سے ہے، جبر کے بغیر جہاد نہیں ہوسکتا۔اسی طرح حدود کا قیام ہے کوئی مجرم خوشی سے سزا قبول نہیں کرتا۔اسے اس کے کردہ گناہ کی سزا جبراً دینا پڑتی ہے زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔شرابی کو کوڑے مارے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ جبر کی اقسام سے ہیں اور یہ جبر بالکل جائز اور ضروری ہے۔البتہ کسی غیر مسلم کو طاقت کے ذریعے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، یہ اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔اسی لیے فرمایا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ایک عیسائی بڑھیا تھی۔امیر المومنین نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس عورت کو کہو کہ اسلام قبول کر لے جب اس کو یہ پیغام ملا تو کہنے لگی، میری عمر کا بیشتر حصہ عیسائی مذہب پر گزرا ہے عمر کے اس آخری حصہ میں میرا دل نہیں چاہتا کہ اس مذہب کو چھوڑ دوں جس پر زندگی گزاری ہے، مجھے یہ بڑا دشوار نظر آتا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس بڑھیا کو اس کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ دین میں جبر نہیں ہے۔

الطَّاغُوت کا معنیٰ و مطلب اور اس کی تحقیق

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ: طاغوت کا لغوی معنیٰ" حد سے تجاوز کرنا" یا" سرکشی کرنا" ہے۔ اسلامی اصطلاح میں ہر وہ شخص، قوت، یا نظام جو اللہ کی بندگی اور مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے اور خود کو معبود (جس کی پوجا کی جائے) یا مطاع (جس کی اندھی تقلید کی جائے) کے درجے پر فائز کر لے، طاغوت کہلاتا ہے۔ طاغوت کا لفظ بنیادی طور پر طغیان (بغاوت، سرکشی اور حد سے بڑھنا) سے نکلا ہے۔ اس کی جامع ترین تعریف امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کی ہے:" طاغوت ہر اس بندے کو کہتے ہیں کہ جس کے بارے میں بندہ (اطاعت، عبادت یا پیروی میں) اللہ کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کر جائے۔ طاغوت میں" واؤ" اور" تاء" مبالغہ کے لیے ہیں، یعنی جو اپنی حد سے بہت زیادہ آگے بڑھ جائے۔ تمام باطل معبود طاغوت ہیں، کیونکہ انھیں حد سے بڑھا کر اللہ تعالیٰ کے برابر کر دیا گیا ہے۔ اس تعریف کی رو سے، جو بھی انسان، شے، یا نظام اللہ کی حاکمیت کو چیلنج کرے اور لوگوں کو اللہ کی بندگی سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کرے، وہ طاغوت ہے۔ شیطان کو بھی اسی لیے طاغوت کہتے ہیں۔ جو شخص لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی بندگی اور اطاعت کرواتا ہے وہ بھی طاغوت ہے۔ خدا کے سوا جن کی پرستش کی جائے، جیسے: بت، یا جو انسان کے خدا سے سرتابی اور نافرمانی کا سبب ہو، جیسے: شیطان اور سرداران کفار، یہ سب' طاغوت' میں داخل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے لئے ضروری ہے کافر پہلے اپنے کفر سے توبہ کرے اور بیزار رہو، اس کے بعد ایمان لانا صحیح ہوتا ہے۔ اگر کوئی مرتد ہو جائے تو وہ بھی صرف کلمہ پڑھ لینے یا مسلمانوں والا کوئی دوسرا کام کر لینے سے مسلمان نہ ہوگا جب تک اپنے اس ارتداد سے توبہ نہ کرے۔

ایک قرآنی اور اسلامی استعارہ

وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ اور اللہ پر ایمان لایا فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى اس نے مضبوط کڑا پکڑ لیا اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى عربی زبان کا ایک قرآنی اور اسلامی استعارہ ہے۔ اس کے لغوی معنیٰ" مضبوط ترین کڑا، انتہائی قابل اعتماد سہارا یا نہ ٹوٹنے والی رسی" کے

ہیں۔اسلامی تعلیمات کے مطابق اس سے مراد" دین اسلام،توحیداور اللہ سے پختہ تعلق" ہے جو انسان کو گمراہی سے بچاتا ہے۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا: جوٹوٹ نہیں سکتا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔اس کا ہاتھ گویا ایسا مضبوط جگہ پر پہنچ گیا۔جہاں پر وہ محفوظ ہوگیا،اب اس کوکسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا،اور یہ ایسا مضبوط مقام ہے جو کمزور ہو کرٹوٹ بھی نہیں سکتا بلکہ یہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔مضبوط حلقہ سے مراد پوری شریعت اوراس کا نظام ہے اور یہی حلقہ ہے جو انسان کو ہر طرح کی گمراہی سے بچاسکتا ہے۔بشرطیکہ اس سے چمٹا رہے اور ادھر ادھر جانے والی پگڈنڈیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ایسا شخص یقینا کامیاب ہوگا۔اس آیت میں طاغوت سے بچنے کا جو فرمایا گیا ہے،اس سے معلوم ہوا کہ اسلام پر مضبوطی سے وہ ہی قائم رہ سکتا ہے جو بے دینوں کی صحبت،ان کی الفت،ان کی کتابیں دیکھنے،ان کے وعظ سننے سے دور رہے اور جو اپنے ایمان کی رسی پر خود ہی چھریاں چلائے گا اس کی رسی کا کٹنے سے بچنا مشکل ہے۔فرمایا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اللہ تعالیٰ ہر شے کو سنتا اور جانتا ہے،وہ انسان کے ارادے تک سے واقف ہے کہ وہ کوئی کام نیک نیتی سے کر رہا ہے یا بدنیتی سے وہ ہر ایک کی پکار کو سنتا ہے۔

لفظ ولی لغوی اور قرآنی مفہوم

اَللّٰهُ	اللہ	وَلِيُّ	مددگار ہے	الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کا جو
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	يُخْرِجُهُمْ	وہ انہیں نکالتا ہے		
مِّنَ الظُّلُمٰتِ	اندھیروں سے	اِلَى النُّوْرِ	روشنی کی طرف		
وَالَّذِيْنَ	اور وہ لوگ جنہوں نے	كَفَرُوْٓا	کفر کیا		
اَوْلِيٰٓـــُٔھُمُ	اُن کے دوست ہیں	الطَّاغُوْتُ	گمراہ کرنے والے (شیطان)		
يُخْرِجُوْنَهُمْ	وہ نکال لے جاتے ہیں اُن کو	مِّنَ النُّوْرِ	روشنی سے		
اِلَى الظُّلُمٰتِ	اندھیروں کے	اُولٰٓئِكَ	یہی لوگ		
اَصْحٰبُ النَّارِ	دوزخی ہیں	هُمْ	وہ	فِيْهَا	اس میں

خٰلِدُوْنَ	ہمیشہ رہیں گے۔(257)

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا : لفظ ولی (جس کی جمع اولیاء ہے) مادہ و، ل، ی سے نکلا ہے، جس کے بنیادی معنی قرب، نزدیکی، اور لگاؤ کے ہیں۔اس کے لغوی مفہوم میں دوست، مددگار، اور سرپرست شامل ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ مومنوں کا ولی (سرپرست ومددگار) ہے جوانہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست، رفیق، کارساز، مددگار یا ولی ہے۔ جو ایمان لائے۔لفظ ولی میں یہ سب معنی پائے جاتے ہیں جیسے فرمایا اَنْتَ وَلِیُّنَا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ دنیا اور آخرت میں تو ہی ہمارا کارساز ہے۔جب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھیں گے، کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ ہماری پرستش کرو۔تو وہ جواب دیں گے اے مولیٰ کریم اَنْتَ وَلِیُّنَا تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ہم لوگوں کو کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہماری پرستش کرو انہوں نے تو خواہ مخواہ شیطان کی بات مانی ہے، اسلامی اصطلاح میں ولی اُس متقی اور پرہیزگار انسان کو کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت کرے، گناہوں سے بچے اور اس کا دل اللہ کی محبت اور ذکر سے معمور ہو۔بہرحال فرمایا، اللہ تعالیٰ ہی مومنوں کا مددگار ہے اور وہ ان کی مدد اس طریقہ سے کرتا ہے یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔یہاں پر نور کو مفرد استعمال کیا ہے اور ظلمات جمع ہے، مقصد یہ ہے کہ توحید اور ایمان تو ایک ہی چیز ہے۔جب کہ کفر اور شرک بہت سے ہیں۔کوئی ستاروں کو پوج رہا ہے، کوئی انسانوں کی پرستش کرتا ہے۔کوئی جنات کو حاجت روا سمجھتا ہے اور کوئی بتوں کے آگے سجدہ ریز ہے۔یہ سب ظلمت کی قسمیں ہیں۔فرمایا: وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا اَوْلِیٰٓـئُھُمُ الطَّاغُوْتُ ان کے ساتھ طاغوت ہیں اور ان کا کام کیا ہے یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ وہ انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں ظاہر ہے کہ جب شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔تو کوئی انہیں کفر کی طرف لے جاتا ہے کوئی شرک کی طرف اور کوئی بدعت کی طرف اور کوئی ترغیب دلا کر معصیت کی طرف لے جاتا ہے، ایسے لوگ بہرحال دین وایمان کی روشنی سے نکل کر اندھیروں کی طرف ہی جاتے ہیں، فرمایا جو لوگ روشنی

سے نکل کر اندھیرے کی طرف جائیں گے۔ان کا انجام یہ ہے کہ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ○ یہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں ہی جلتے رہیں گے۔ وہاں سے نکلنے کی کوئی امید نہ ہوگی كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا مِنۡ غَمٍّ: ارشاد فرمایا کہ جب وہ کفار گھٹن کے سبب جہنم میں سے نکلنا چاہیں گے تو گرزوں سے مار کر پھر اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ آگ کا عذاب چکھو جس کا جلانا انتہائی شدید ہے۔(جلالین، الحج، تحت الآیۃ: ۲۲،ص ۲۸۰) ان کے مقابلے میں جو اہل ایمان ہیں، وہ کامیاب ہوجائیں گے، ان کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جنت ہوگا، وہ دائمی عیش و راحت میں ہوں گے کیونکہ انہوں نے دین اسلام کے مضبوط کڑے کو پکڑ لیا اور پھر اس گرفت کو کمزور نہیں ہونے دیا۔جہنم اللہ تعالیٰ کے جلال کا مظہر ہے اور اللہ تعالیٰ نے جہنم کو اس لئے پیدا فرمایا ہے تاکہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی کبریائی کا اندازہ ہوجائے اور لوگ اس سے ڈرتے رہیں اور اس کے خوف کی وجہ سے گناہوں سے باز رہیں۔(روح البیان، الحج، تحت الآیۃ: ۲۲،۶ / ۱۹) افسوس! آج لوگوں کے دل کی سختی کا یہ حال ہے کہ قرآنِ مجید میں جہنم کے انتہائی دردناک عذابات کے بارے میں پڑھنے کے باوجود ان سے ڈرتے نہیں اور بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ گناہوں میں مصروف ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت اور عقلِ سلیم عطا فرمائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک برگزیدہ نبی اور رسول/
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ
الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ
مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

نور والوں کے پیشوا، اور تاریکی والوں کا پیشوا

اَلَمْ تَرَ	کیا نہیں دیکھا آپ نے	اِلَى الَّذِىْ	اُس شخص کی طرف جس نے				
حَآجَّ	جھگڑا کیا	اِبْرٰهٖمَ	ابراہیم سے	فِىْ رَبِّهٖٓ	اس کے رب کی بابت		
اَنْ	(اس وجہ سے) کہ	اٰتٰىهُ اللّٰهُ	اسے دی اللہ نے	الْمُلْكَ	بادشاہت		
اِذْ قَالَ	جب کہا	اِبْرٰهٖمُ	ابراہیم نے				
رَبِّىَ الَّذِىْ	میرا رب وہ ہے جو	يُحْىٖ	زندہ کرتا ہے				
وَيُمِيْتُ	اور مارتا ہے	قَالَ	اس نے کہا				

اور میں مارتا ہوں	وَاُمِيۡتُ	زندہ کرتا ہوں	اُحۡیٖ	میں (بھی)	اَنَا
لاتا ہے	يَاۡتِىۡ	بیشک اللہ	فَاِنَّ اللّٰهَ	کہا ابراہیم نے	قَالَ اِبۡرٰهٖمُ
مشرق سے	مِنَ الۡمَشۡرِقِ	سورج کو	بِالشَّمۡسِ		
مغرب سے	مِنَ الۡمَغۡرِبِ	پس تو اسے لے آ	فَاۡتِ بِهَا		
جس نے کفر کیا (تھا)	الَّذِىۡ كَفَرَ	تو وہ ہکا بکا رہ گیا	فَبُهِتَ		
نہیں ہدایت دیتا	لَا يَهۡدِى	اور اللہ	وَاللّٰهُ		
اُن لوگوں کو جو ظالم ہیں (258)	الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ				

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِىۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِىۡ رَبِّهٖۤ گزشتہ آیت میں نور اور تاریکی والوں کا بیان ہوا تھا اب انہیں کی مثال بیان کی جارہی ہے۔نور والوں کے پیشوا سیدنا حضرت ابراہیم عَلَيۡهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام تھے اور تاریکی والوں کا پیشوا نمرود تھا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام جو اللہ کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر ہیں، جن کو خلیل اللہ (اللہ کا دوست) کہا جاتا ہے،تقریباً چار ہزار سال قبل عراق میں پیدا ہوئے۔تین بڑے مذاہب (یہودیت،عیسائیت اور اسلام) کے عظیم پیغمبروں میں سے ایک ہیں۔یہودی اور عیسائی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔مذہبِ اسلام میں ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے،چنانچہ قرآن کریم کی چودھویں سورت ''سورۃ ابراہیم'' ان ہی سے موسوم ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے احوال واوصاف بیان فرمائے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انہیں ''اُمت'' اور ''امام الناس'' کے لقب سے پکارا ہے اور انہیں متعدد مرتبہ ''حنیف'' بھی کہا ہے۔قرآن کریم میں انہیں ''مسلم'' بھی کہا گیا ہے۔قرآن کریم میں بہت سارے ایسے انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔نمرود کو اللہ تعالیٰ نے عظیم سلطنت عطا فرمائی لیکن اس نے اس پر شکر و طاعت کی بجائے تکبر و غرور اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا حتّٰی کہ اپنی ربُوبیّت یعنی رب ہونے کا دعویٰ کرنے لگا۔سب سے پہلے سر پر تاج رکھنے والا یہی ہے۔یہ شخص نمرود بادشاہِ

عراق تھا اور اس کا دار الخلافہ بابل تھا جہاں آج کل کوفہ آباد ہے خدائی کا دعویدار تھا یہ خود اور اس کی رعایا سب مشرک تھے۔

شرک کی تین اقسام

نمرود کی خدائی کس قسم کی تھی؟ یہ جاننے کے لیے تھوڑی سی تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے۔ شرک کی تین اقسام ہیں:۔

1۔شرک فی الربوبیت:۔ایسا شرک عموماً کوئی بھی نہیں کرتا۔مشرکین مکہ ہوں یا نمرود ہو یا فرعون ہو کسی سے بھی پوچھا جائے کہ یہ آسمان و زمین کس نے بنائے۔زمین سے پیداوار کون اگاتا ہے۔کائنات کو کس نے پیدا کیا اور شمس و قمر کا نظام چلانے والا کون ہے تو سب یہی جواب دیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہے۔البتہ ربوبیت کے منکر ضرور موجود رہے ہیں یعنی دہریہ قسم کے لوگ یا فلکیات کے ماہرین جو ساری کائنات کو مادہ کی بدلی ہوئی شکلیں اور ارتقائی پیداوار کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

2۔دوسری قسم شرک فی الصفات ہے۔آگے اس کی پھر دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق مافوق الفطری اسباب سے ہوتا ہے۔مثلاً دعائیں سننا اور انہیں قبول کرنا، حاجت روائی اور مشکل کشائی کسی کے رزق میں تنگی اور فراخی پیدا کرنا، بارش برسانا، کسی کو اولاد دینا وغیرہ وغیرہ، ایسا شرک عام پایا جاتا ہے۔مشرکین مکہ کے ہوں یا عراق کے ہوں، مصر کے ہوں یا ہندوستان کے، انہوں نے ایسے کاموں کے لیے لاتعداد دیوی یا دیوتا بنا رکھے تھے اور مندرجہ بالا کام انہیں کے سپرد تھے اور ان کے بتوں اور مجسموں کی پوجا کی جاتی تھی۔اس قسم کا شرک ہم مسلمانوں میں بھی عام پایا جاتا ہے۔فرق صرف یہ ہے ہم نے امور اپنے پیروں فقیروں اور بزعم خود اولیاء اللہ کے سپرد کر رکھے ہیں خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ ہو چکے ہوں۔

3۔اور شرک کی تیسری قسم وہ ہے جس کا تعلق شرک فی الصفات کی دوسری قسم سے ہے اور وہ فطری اسباب سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر طاغوت یا طواغیت سے ہوتا ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں آیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنی حکمرانی تسلیم کرواتے ہیں۔آج کی زبان میں اسے

اقتدار اعلیٰ کہتے ہیں۔ نمرود بھی اس قسم کا خدا تھا اور فرعون بھی اور ان جیسے اور بھی کئی خدائی کے وعدے کر چکے اور کر رہے ہیں۔

ربوبیت کے بارے میں بحث ومباحثہ

اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ کہ اسے اللہ نے حکومت دی تھی۔" تو وہ سرکشی اور بغاوت پر اتر آیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ رعیت کا حکمران بن گیا ہے تو اتنی جرأت کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ کی ربوبیت کے بارے میں بحث کرنے لگا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ جیسے کام کر سکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں عراق کے اندر شرک تقریباً اپنی ساری صورتوں کے ساتھ موجود تھا، بتوں کو وہ پوجتے تھے، سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش وہ کرتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ بادشاہِ وقت کو بھی رب مانتے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذمے ان سب صورتوں کی تردید کر کے لوگوں کو اکیلے رب کی عبادت کی دعوت دینا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد اور قوم کو بت پرستی چھوڑ کر ایک رب کی عبادت کی دعوت دی، نتیجے میں گھر سے نکلنا پڑا، پھر نہایت حکیمانہ طریقے سے سورج، چاند اور ستاروں کا رب نہ ہونا ایسا واضح کیا کہ قوم لاجواب ہوگئی۔ اب دربار میں پیشی ہوئی تو زیر بحث مسئلہ خدائی ہی کا تھا۔ دوران بحث فرمایا اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَ اُمِيْتُ تو نمرود کہنے لگا کہ یہ دونوں کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ایک بے قصور آدمی کو بلا وجہ قتل کروا دیا اور ایک ایسے قیدی کو جسے سزائے موت ہو چکی تھی آزاد کر دیا۔ اس نے جو دعویٰ کیا کہ میں زندگی اور موت دیتا ہوں اس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ ہونے کی وجہ سے جس کو چاہوں موت کے گھاٹ اتار دوں اور جس کو چاہوں موت کا مستحق ہونے کے باوجود معاف کر کے آزاد کر دوں، اور اس طرح اسے زندگی دے دوں، ظاہر ہے کہ اس کا جواب قطعی طور پر غیر متعلق تھا، اس لئے کہ گفتگو زندگی اور موت کے اسباب سے نہیں ان کی تخلیق سے ہو رہی تھی؛ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ یا تو موت اور حیات کی تخلیق کا مطلب ہی نہیں سمجھتا یا کٹ حجتی پر اتر آیا ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دیکھا کہ یہ شخص بحث میں

مغالطہ سے کام لیتا ہے اور ایسی باتیں کہتا ہے جو دلیل تو درکنار شبہ بننے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتیں تو ایک دوسری دلیل پیش کرتے ہوئے فرمایا: قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ ” اللہ سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے۔“ یہ حقیقت ہر شخص تسلیم کرتا ہے، حتی کہ وہ کافر بھی اس کا انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ابراہیم نے فرمایا: فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ پس تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ۔“ یہ الزامی دلیل ہے۔ اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہوتا تو یہ اس کے موافق ہوجاتی۔ جب آپ نے ایسی بات فرمادی جس میں شبہ پیدا کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ نہ اس کے پاس اس دلیل کا کوئی توڑ موجود تھا۔ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ”اس لئے وہ کافر حیران رہ گیا۔“ یعنی حیرت زدہ ہوگیا، اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کی دلیل غلط ثابت ہوگئی اور اس کا پیش کردہ شبہ کالعدم ہوگیا۔ جو بھی جھوٹا ضد اور عناد کے ذریعے سے حق کا مقابلہ کرنا چاہے، وہ اسی طرح مغلوب اور شکست خوردہ ہوجایا کرتا ہے۔ اس لئے اللہ نے فرمایا: وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ”اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ بلکہ انہیں کفرو ضلالت میں مبتلا رہنے دیتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے لئے خود یہ چیز پسند کرلی ہوتی ہے۔ اگر ان کا مقصد ہدایت کا حصول ہوتا تو اللہ انہیں ہدایت دے دیتا، اور ہدایت تک پہنچنے کے اسباب مہیا کردیتا۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اس مقام پر مزید بحث وتمحیص ہوسکتی تھی فرض کروا گر نمرود سورج کے طلوع وغروب کے متعلق ابراہیم (علیہ السلام) کو یہ جواب دیتا کہ سورج کو مشرق سے تو میں طلوع کرتا ہوں تم اپنے رب سے کہو کہ مغرب سے نکالے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ یقینا ابراہیم (علیہ السلام) کو سچا کر دکھاتا اور سورج کو مغرب سے طلوع کردیتا، مگر نمرود کو اپنی شکست کا یقین ہوگیا، لہٰذا اس نے خاموشی اختیار کرنے میں یہ مصلحت جانی۔ غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا دور برصغیر پاک وہند میں بھی پیش آیا تھا۔ مغل بادشاہ جہانگیر بھی اپنے آپ کو سجدہ کرواتا تھا حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اس کے سامنے سجدہ کیا جائے۔ مخلوق میں سے کسی کے لائق نہیں کہ اسے سجدہ کیا جائے۔ چنانچہ جہانگیر کے زمانے میں حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے سجدہ کی علی الاعلان مخالفت کی۔ بہر حال یہ آپ کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ جہانگیر جیسا اکھڑ مزاج بادشاہ بھی اس فعل سے تائب ہوگیا اور اس کا عقیدہ درست

ہوگیا البتہ اسکی بیوی رافضیہ تھی مگر وہ رافضیوں کا طرفدار نہیں بنا اور صحیح دین اسلام پر قائم رہا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ جہانگیر کے بعد شاہجہان مزید دین کی طرف راغب ہوا اور پھر اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ جیسا خوف خدا رکھنے والا بادشاہ بھی پیدا ہوا جس نے اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کو سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔وہ کمال قدرت کا مالک ہے،اس کی صفت اس کے فعل سے سمجھ میں آتی ہے، جب کوئی عجیب وغریب فعل سرزد ہوتا ہے،تو پھر پتہ چلتا ہے کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور کوئی نہیں کرسکتا اور جب یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے تو پھر اس کی توحید کی پہچان ہوتی ہے کہ ایسی صفت کا مالک اور کمال قدرت اور کمال صفت کا مالک صرف اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔گویا اس سارے واقعہ سے یہ بات نکلی کہ موت وحیات کا مالک اور نظام شمسی کو چلانے والا فقط اللہ تعالیٰ ہے۔وہ چاہے تو بڑے سے بڑا سرکش کو لاجواب کردے اور چاہے تو ریت کو غلہ میں تبدیل کردے،یہ سب اس کی کمال قدرت کے کرشمے ہیں جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔یہ آیت ایک قطعی دلیل ہے کہ اللہ ہی خالق ہے اور وہی مختار کل ہے۔اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عبادت اور ہر حال میں توکل اسی کا حق ہے۔

مکالمہ اور مناظرہ میں ایک باریک نکتہ

ابن القیم رحمہ اللہ نے فرمایا:"اس مکالمہ اور مناظرہ میں ایک باریک نکتہ ہے کہ دنیا میں شرک کا دارومدار ستاروں اور قبروں کی عبادت پر ہے۔بعد میں انہی کے نام سے بت تراشے گئے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں ان سب کی الوہیت کی اجمالاً تردید موجود ہے کیونکہ اللہ وحدہ لاشریک ہی زندہ کرتا اور موت دیتا ہے۔وہ زندہ، جو مرجانے والا ہے وہ زندگی میں معبود بننے کی اہلیت رکھتا ہے نہ مرنے کے بعد۔کیونکہ اس کا ایک رب ہے، جو قادر ہے، زبردست ہے، وہ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرتا ہے۔جو ایسا مجبور ہو وہ معبود کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کی صورت کا بت بنایا جائے اور اس کی پوجا کی جائے۔اسی طرح ستاروں کا حال ہے۔ان میں سے بڑا نظر آنے والا سورج ہے۔یہ بھی حکم کا پابند ہے،اپنے بارے

میں آزادی سے کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔بلکہ اس کا خالق و مالک ہی اسے مشرق سے لاتا ہے تو وہ اس کے حکم اور مرضی کے مطابق اطاعت کرتا ہے۔یعنی یہ بھی مربوب اور مسخر یعنی حکم کا پابند غلام ہے۔معبود نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔" فرمایا اللہ تعالیٰ کی صفات کی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا، تو پھر وہ پرلے درجے کا ظالم ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ "اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا یعنی ان کی رہنمائی نہیں کرتا پہلی آیت میں بھی آچکا ہے۔وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ کہ کافر لوگ ہی ظالم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں لاتے۔وہ مشرک ہیں اور شرک کی حقیقت یہ ہے۔اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے اور اس کے مرتکب ظالم لوگ ہیں۔

ظلم اور ہدایت میں تضاد

جو لوگ شرک جیسے ظلم عظیم میں پھنس جاتے ہیں، اللہ ان کو راہ راست کی طرف رہنمائی نہیں کرتا۔ یہ قرآنی تعلیمات اور الٰہی قوانین کے مطابق، اللہ تعالیٰ کی سنت (عام قانون) یہ ہے کہ وہ ظالم کو اس وقت تک ہدایت نصیب نہیں فرماتا جب تک کہ وہ خود ظلم کا راستہ ترک کرکے توبہ اور اصلاح کی نیت نہ کرلے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ ظالم کے لیے توبہ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے۔اگر کوئی ظالم اپنے ظلم سے باز آجائے، مظلوموں سے معافی مانگے اور سچے دل سے اللہ کی طرف رجوع کرے (توبہ کرے)، تو اللہ کی رحمت سے اس کے لیے ہدایت اور بخشش کے راستے کھل جاتے ہیں۔خلاصہ کلام یہ کہ اللہ کا قانونِ ہدایت ان لوگوں کے لیے ہے جو حق کے طلبگار ہوں۔جو شخص ظلم کو اپنا شعار بنالے اور اسے چھوڑنے پر راضی نہ ہو، وہ اللہ کی رحمت اور ہدایت سے محروم کردیا جاتا ہے۔گزشتہ درس میں بیان ہونے والے اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطن کی مثال اس درس میں آگئی۔نمرود طاغوت کا پرستار تھا اور ابراہیم (علیہ السلام) حق پر قائم تھے۔اللہ تعالیٰ نے حق کو فتح نصیب فرمائی اور اپنی صفت کے ذریعے اپنی ذات کو پہچان کرائی۔

فلسفۂ موت وحیات، کون لوگ مر کر بھی زندہ ہیں؟/ علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک کا مشاہدہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

حیات بعد الممات کا مسئلہ اور اسلامی نقطہ نظر

اَوْ كَالَّذِيْ	یا اسی طرح اس شخص کو (نہیں دیکھا) جو	مَرَّ	گزرا		
عَلٰى قَرْيَةٍ	ایک بستی پر	وَّهِيَ خَاوِيَةٌ	اس حال میں کہ وہ گری پڑی تھی		
عَلٰى عُرُوْشِهَا	اپنی چھتوں پر	قَالَ	اس نے کہا		
اَنّٰى	کس طرح	يُحْيٖ	زندہ کریگا	هٰذِهِ اللّٰهُ	اس کو اللہ
بَعْدَ	بعد	مَوْتِهَا	اس کی موت کے؟	فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ	تو اللہ نے اسے موت دی

مِائَةَ عَامٍ	ایک سو سال	ثُمَّ	پھر	بَعَثَهٗ	اسے اٹھایا
قَالَ	(اللہ نے) کہا	كَمْ لَبِثْتَ	کتنی دیر تو (یہاں) رہا		
قَالَ	اس نے کہا	لَبِثْتُ	میں رہا ہوں	يَوْمًا	ایک دن
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ	یا کچھ حصہ دن کا	قَالَ	(اللہ نے) کہا		
بَلْ	(نہیں) بلکہ	لَّبِثْتَ	تو (مرا) رہا	مِائَةَ عَامٍ	ایک سو سال
فَانْظُرْ	پس تو دیکھ	اِلٰى طَعَامِكَ	اپنے کھانے کی طرف		
وَشَرَابِكَ	اور اپنے پینے کی طرف	لَمْ يَتَسَنَّهْ	وہ نہیں سڑ گیا (یعنی نہیں سڑا)		
وَانْظُرْ	اور تو دیکھ	اِلٰى حِمَارِكَ	اپنے گدھے کی طرف		
وَلِنَجْعَلَكَ	اور (یہ اس لئے) تاکہ ہم بنائیں تجھے				
اٰيَةً	(عظیم) نشانی	لِّلنَّاسِ	لوگوں کے لیے	وَانْظُرْ	اور تو دیکھ
اِلَى الْعِظَامِ	ہڈیوں کی طرف	كَيْفَ	کس طرح		
نُنْشِزُهَا	ہم انہیں جوڑتے ہیں	ثُمَّ	پھر		
نَكْسُوْهَا	ہم پہناتے ہیں اُن کو	لَحْمًا	گوشت (کالباس)		
فَلَمَّا	پھر جب (یہ سب)	تَبَيَّنَ	واضح ہوگیا	لَهٗ	اس پر
قَالَ	(تو) اس نے کہا	اَعْلَمُ	میں (بالیقین) جانتا ہوں		
اَنَّ	کہ بیشک	اللّٰهَ	اللہ		
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز پر	قَدِيْرٌ	خوب قادر ہے۔(259)		

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال کے ذریعے اپنی قدرت کاملہ اور حیات بعد الممات کا مسئلہ سمجھایا ہے۔(اسلامی نقطہ نظر اسلام میں حیات بعد الممات پر پختہ ایمان عقیدۂ توحید اور رسالت کی طرح بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اس کا تصور درج ذیل مراحل پر مشتمل ہے عالم برزخ: یہ موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کی درمیانی زندگی ہے۔اس میں روح کو اس کے اعمال کے

مطابق راحت یا عذاب کا سامنا ہوتا ہے۔قیامت اور حشر: ایک مقررہ وقت پر اس کائنات کا خاتمہ ہوگا، تمام انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اپنے اعمال کا حساب دیں گے۔جنت اور جہنم: حساب کتاب کے بعد اچھے اعمال والوں کو ہمیشہ کی جنت اور برے اعمال والوں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔) بہرحال یہ مثال بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کو ثابت کیا ہے۔یہ ایک اور دلیل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اکیلا اللہ ہی خالق ہے۔وہی سب فیصلے کرتا ہے۔اسی کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا " یا اس شخص کے مانند جس کا گزر ایک بستی پر ہوا، جو چھتوں کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی۔" یعنی اس کے باشندے مر کھپ گئے تھے اور چھتیں گر کر ان کے اوپر دیواریں گر چکی تھیں، وہاں کوئی نہیں رہتا تھا بلکہ بالکل ویران ہو چکی تھی۔تو اس شخص نے دل میں سوچا کہ اللہ تعالیٰ اس ساری بستی کو کس طرح زندہ کرے گا، بظاہر اس سوچ کا منشاء خدانخواستہ کوئی شک کرنا نہیں تھا بلکہ حیرت کا اظہار تھا، اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے انہیں اپنی قدرت کا مشاہدہ اس طرح کرایا جس کا اس آیت میں ذکر ہے، یہ صاحب کون تھے؟ اور یہ بستی کونسی تھی؟ یہ بات قرآن کریم نے نہیں بتائی، اور کوئی مستند روایت بھی ایسی نہیں ہے جس کے ذریعے یقینی طور پر ان باتوں کا تعین کیا جاسکے۔بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ بستی بیت المقدس تھی۔اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب بُخت نصر نے اس پر حملہ کر کے اسے تباہ کر ڈالا تھا تفسیر خازن میں ہے کہ جب یہودیوں نے فساد، شر انگیزی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی۔تو اللہ عَزَّ وَجَلَّ نے کسی ایسے شخص کو ان پر مُسَلَّط کر دیا جس نے انہیں ہلاکت اور بربادی سے دوچار کر دیا، پہلے جب انہوں نے فتنہ و فساد شروع کیا اور تورات کے احکام کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ان کی طرف بھیج دیا جس نے ان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

دنیا میں چار بادشاہوں کو پوری زمین کی بادشاہی ملی

تفسیر صاوی میں ہے کہ دنیا میں کل چار بادشاہ ایسے ہوئے ہیں جن کو پوری زمین کی بادشاہی ملی۔

ان میں دو مومن تھے اور دو کافر۔ مومن تو حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین ہیں اور کافر ایک بخت نصر اور دوسرا نمرود ہے۔ یہ بخت نصر قدیم بابل کا ایک انتہائی طاقتور، فاتح اور ظالم بادشاہ تھا اس نے مشرق وسطیٰ پر حکومت کی، یروشلم فتح کیا ہیکل سلیمانی (معبد سلیمان) کو تباہ کیا اور یہودیوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا۔ وہ ایک عظیم جنگجو اور بابل کی تعمیرات کا بانی مانا جاتا ہے۔ بہر حال یہ صاحب حضرت عزیر یا حضرت ارمیا (علیہم السلام) تھے۔ لیکن نہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے، نہ اس کھوج میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کا مقصد اس کے بغیر بھی واضح ہے۔ البتہ یہ بات تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کہ یہ صاحب کوئی نبی تھے، کیونکہ اول تو اس آیت میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوئے، نیز اس طرح کے واقعات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ وہ شخص وہاں کھڑا ہو کر تعجب سے بولا : قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا اس کی موت کے بعد اللہ اسے کس طرح زندہ کرے گا؟" اسے یہ چیز ناممکن محسوس ہوئی، اس نے اللہ کی قدرت کا صحیح اندازہ نہ کیا۔ اللہ نے اس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا تو خود اس کی ذات میں اور اس کے گدھے میں اپنی قدرت کا مشاہدہ کرا دیا۔ اس کے پاس کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمۡ لَبِثۡتَ ؕ قَالَ لَبِثۡتُ يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ "پس اللہ نے اسے سو سال کے لئے مار دیا۔ پھر اسے اٹھایا، پوچھا: کتنی مدت تجھ پر گزری؟ یعنی پورے سو سال موت کی نیند سلا کر پھر انہیں زندہ کر کے پوچھا: بتلاؤ کتنی مدت اس حال میں پڑے رہے؟ بعض مفسرین کے نزدیک یہ حضرت عزیر تھے، اب حضرت عزیر (علیہ السلام) کے پاس ماسوائے سورج کے، وقت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا جب جا رہے تھے تو پہلا پہر تھا اور اب دوسرا پہر کہنے لگے: یہی بس دن کا کچھ حصہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دوسرا دن ہو۔ کیونکہ اس سے زیادہ انسان کبھی نہیں سوتا۔ وارد ہونے والی موت کے اس سو سالہ عرصہ کو عالم برزخ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جب کوئی انسان مر جاتا ہے۔ تو اس کا تعلق اس دنیا سے کٹ جاتا ہے اور قیامت کے روز دوبارہ جی اٹھنے تک برزخی زندگی کہلاتی ہے۔ اس عرصہ میں انسان کو وقت کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کتنا عرصہ

برزخ میں رہا ہے۔

موت کے بعد انسان قیامت تک کہاں ہوتا ہے؟

انسان کے مرنے کے بعد اس کا تعلق اس ظاہری اور دنیوی عالم سے نہیں رہتا، بلکہ اس کا تعلق ایک اور عالم سے ہو جاتا ہے، جس کو عالم برزخ (اور عرفِ عام میں عالم قبر) کہتے ہیں، اب جو کچھ اس پر گزرتا ہے وہ دنیوی عالم میں نہیں، بلکہ اس دوسرے عالم میں ہوتا ہے اور اس دوسرے عالم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے عام انسانوں سے مخفی رکھا ہوا ہے؛ لہٰذا اس پر اچھا یا بُرا جو کچھ گزرتا ہے، اس کا اس دنیا میں مشاہدہ عام طور پر نہیں ہوت۔

عالم برزخ کا مشاہدہ ممکن نہیں

مردہ ہمارے سامنے ہوتا ہے اور اس پر عذاب یا راحت کا معاملہ ہوتا ہے؛ مگر اس کے باوجود چوں کہ یہ معاملہ عالم برزخ کا ہے۔عالم برزخ کا مشاہدہ اس لیے ممکن نہیں کیونکہ یہ مادی دنیا کے قوانین اور حواس خمسہ (دیکھنے، سننے، چھونے کی صلاحیت) سے بالاتر ایک روحانی اور غیبی عالم ہے۔اس کی بنیادی وجوہات درج ذیل ہیں: مادی پردہ: انسان کی روح جب جسمِ خاکی سے نکلتی ہے تو وہ برزخ (عالم ارواح) میں چلی جاتی ہے، جبکہ زندہ انسان کی روح اور آنکھیں مادی اور طبعی چیزوں کو دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔غیب پر ایمان لانا مذہب کا ایک بنیادی حصہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے برزخ کے حالات کا مشاہدہ انسان کی آنکھوں کے بجائے وحی اور انبیاء کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے۔اگر انسانوں کو برزخ کے حالات یا وہاں کے مناظر براہِ راست نظر آنے لگیں، تو دنیا کا پورا نظامِ امتحان (آزمائش) ختم ہو جائے گا۔انسان غیب پر یقین کرنے کے بجائے آنکھوں دیکھی حقیقت پر مجبور ہو کر ایمان لائے گا، جس سے نیکی اور ایمان کا ثواب ختم ہو جاتا ہے۔مختصراً، عالم برزخ کا مشاہدہ نہ ہونا اس کے عدم (نہ ہونے) کی دلیل نہیں، بلکہ یہ اس عالم غیب کا خاصہ ہے جسے اللہ نے ہماری آزمائش کی خاطر ہماری عام آنکھوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔اس لیے ہم کو محسوس و مشاہدہ نہیں ہوتا اور ہمارے نہ دیکھنے یا محسوس نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مردے کو تکلیف یا راحت

محسوس نہیں ہو رہی، بلکہ اسے راحت اور تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے،لیکن یہ سب اللہ تعالیٰ نے ہم سے مخفی رکھا ہے، تا کہ ایمان بالغیب باقی رہنے کی بدولت انسان اجر وثواب کا مستحق بھی ہو اور اس کی آزمائش بھی ہو۔

جب انسان کے جسم سے روح نکل جاتی ہے تو اگر وہ نیک ہے تو نیک ارواح کا اصل مستقر اور ٹھکانہ "عِلِّيِّينَ" ہے (مگر اس کے درجات بھی مختلف ہیں)، بدارواح کا اصل ٹھکانا "سِجِّينٍ" ہے اور ہر روح کا ایک خاص تعلق اس کے جسم کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، خواہ جسم قبر میں مدفون ہو یا دریا میں غرق ہو، یا کسی درندے کے پیٹ میں، الغرض جسم کے اجزاء جہاں جہاں ہوں گے روح کا ایک خاص تعلق ان کے ساتھ قائم رہے گا اور اسی خاص تعلق کا نام برزخی زندگی ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی سے زمین کا ذرہ ذرہ چمکتا ہے، اسی طرح روح کے تعلق سے جسم کا ہر ذرہ "زندگی" سے منور ہو جاتا ہے، اگر چہ برزخی زندگی کی حقیقت کا اس دنیا میں معلوم کرنا ممکن نہیں۔

سورہ یٰسین میں آتا ہے کہ جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے، تو کہیں گے مَنۢ بَعَثَنَا مِنۢ مَّرْقَدِنَا ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے اٹھایا۔ ان کو ایسا ہی محسوس ہوگا جیسے کوئی شخص رات کو یا دن کے وقت کچھ دیر کے لیے سوتا ہے، اور پھر اٹھ بیٹھتا ہے۔ یہی چیز حضرت عزیر (علیہ السلام) کے ساتھ پیش آئی، انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ سو سال تک سوئے رہے ہیں، وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔ عالم برزخ میں وقت کا احساس تو نہیں ہوتا، مگر راحت اور تکلیف کا احساس ضرور ہوتا ہے، جیسا کہ احادیث میں آتا ہے کہ جب کسی شخص کو دفن کر دیا جاتا ہے تو پھر منکر نکیر اس سے سوال و جواب کرتے ہیں اس ابتدائی امتحان میں اگر وہ شخص کامیاب ہوا ہے، تو اس کو میٹھی نیند سلا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے راحت کا سامنا مہیا کر دیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ ناکام ہو گیا ہے۔ سوالات کا جواب نہیں دے سکا، تو پھر قیامت تک کے لیے اسے تکلیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے تکلیف کا احساس تو ہوتا ہے مگر وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ مرنے کے بعد ایک عام انسان کے جسم کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ قانون قدرت کے مطابق مردہ جسم گل سڑ کر

ختم ہوجاتے ہیں۔قبروں کی کھدائی کے دوران بعض اوقات چھوٹی موٹی ہڈیاں ملتی ہیں اور بعض اوقات وہ بھی نہیں ملتیں۔

قبر میں حیات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر امّت اسلامیہ کا اجماع

البتہ اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) کے اجسام قبر میں بھی محفوظ رہتے ہیں إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ، یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ نبیوں کے جسموں کو کھاسکے،ہاں شہداء کے متعلق مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ بعض شہداء کے جسم بھی قبروں میں محفوظ رہتے ہیں۔بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ بعض شہداء کو شہید ہوئے پینتالیس سال گزر چکے تھے۔بارش اور سیلاب کی وجہ سے ان کی قبروں میں شگاف پڑ گئے،تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے جسم ویسے ہی محفوظ تھے جیسا وہ دفن کیے گئے۔ابھی چند سال پہلے اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ جولوگ چھ سو سال پہلے تاتاریوں کے علاقے میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے تھے،ان کے جسم بالکل محفوظ برآمد ہوئے تھے،حاصل یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور فلسفیانہ نقطہ نظر کے مطابق،موت وحیات کا منظر ایک انتہائی سنجیدہ،عبرت ناک اور حقیقی منظر ہے۔یہ زندگی کے خاتمے کا نام نہیں بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت (فانی سے باقی) کی طرف منتقل ہونے کا نام ہے۔

حیات النبی ﷺ بلکہ حیات انبیاء علیہم السلام اور شہداء تو نصوصِ قرآنی،احادیث اور آثار کثیرہ سے ثابت ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور شہداء کی ارواح کا تعلق و ربط اپنے اجساد عنصریہ کے ساتھ حیات دنیویہ کی طرح ہے،بلکہ اس سے بھی قوی تر ہے،فرق یہ ہے کہ دنیوی حیات کو ہم محسوس کرتے ہیں،اور بعد از وفات حیات کو ہم محسوس نہیں کر پاتے،لیکن نصوص و روایات سے جب معلوم ہوگیا ہے کہ وہ زندہ اور حیات ہیں،اگرچہ ہم محسوس نہیں کرتے،لہٰذا اس پر ایمان وعقیدہ ضروری اور واجب ہے۔اسی لئے حیات النبی اور حیاتِ انبیاء کے حوالے سے ”حیاۃ النبی“ کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ان کی حیات شہداء اور دوسرے مؤمنین کی حیات کے مقابلہ میں جداگانہ حیثیت رکھتی ہے،چنانچہ بعض احکامِ شرعیہ میں وہ شہداء اور دوسرے مؤمنین سے بھی ممتاز ہیں۔

1: مثلاً: انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد ان کی جائیداد میں وراثت جاری نہیں ہوتی، ان کے اموال وارثوں میں تقسیم نہیں کیے جاتے۔

2: انبیاء علیہم السلام کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات سے کسی ایمان دار کا نکاح درست نہیں، جب کہ شہداء اور بعض دوسرے مؤمنین بھی حیات ہوتے ہیں، مگر شہداء اور دوسرے ایمان داروں کی ازواج سے عدت کے بعد دوسرے مسلمانوں کا نکاح درست ہے، ان کے مال میں وراثت بھی جاری ہوتی ہے۔

3: انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو مٹی نہ کھا سکتی ہے، نہ فنا کرسکتی ہے، وہ اجسامِ دنیویہ کے ساتھ قبر میں محفوظ اور زندہ ہوتے ہیں، یہی تمام علمائے اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ، اور جماعت علمائے دیوبند کا بھی عقیدہ ہے۔

علمائے دیوبند سے منسوب جن لوگوں کے دلوں میں زیغ اور کجی یا کسی قسم کی کم زوری ہے تو وہ طرح طرح کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہو کر خود بھی گم راہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گم راہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب کہ علمائے اہلِ سنت والجماعت خاص کر علمائے دیوبند کا مسلک اس بارے میں بالکل بے غبار اور منقح ہے، (مُنَقَّح کا معنیٰ: اصلاح کیا ہوا (درست کیا گیا) صاف یا واضح کیا ہوا جھوٹ یا غلطیوں سے پاک کیا ہوا چھان بین کے بعد نکھارا گیا) جگہ جگہ اپنی تحریروں میں، تالیفات وتصنیفات میں واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ: ”روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جا کر درود وسلام پڑھنے والے کے درود وسلام کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بلا واسطہ سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں، اور دور سے درود وسلام پڑھنے والوں کے درود وسلام کو آپ تک روضۂ شریف میں فرشتے پہنچاتے ہیں۔“ (امداد الفتاویٰ، ص: ۱۱۰، ج: ۵)

اتنی وضاحت کے باوجود بھی اگر کوئی دیوبندی اس سے اختلاف رکھتا ہے اور حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا منکر ہوتا ہے تو یہ اس کی ذاتی رائے اور اس کی سینہ زوری ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل سنت والجماعت کے خواص وعوام کو اس گھمنڈ اور سینہ زوری سے بچائے، ہم سب کو راہ اعتدال نصیب

فرمائے اور صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی توفیق بخشے۔

بہر حال انہیں بتایا گیا: قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دیکھو تم سو سال یہاں پڑے سو رہے ہو جب حضرت عزیر (علیہ السلام) نے اپنے بدن اور جسمانی حالت کی طرف اور اپنے سامان خورد ونوش کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہی دن ہے جب ان پر نیند طاری ہوئی تھی پس اپنے کھانے پینے کو دیکھ کہ بالکل خراب نہیں ہوا۔" سالوں کی مدت گزرنے کے باوجود اور مختلف اوقات گزرنے کے باوجود اس میں تبدیلی نہیں آئی۔ اس میں اللہ کی قدرت کی بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ اس نے کھانے پینے کی چیزوں کو تبدیل یا خراب ہونے سے بچائے رکھا حالانکہ یہ چیزیں سب سے جلدی خراب ہوتی ہیں۔ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ پھر جب اپنے گدھے کی طرف دیکھا کہ اس کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہوگئی ہیں تو سمجھے کہ واقعی سو سال گزر چکے ہوں گے۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ہڈیوں میں حرکت پیدا ہوئی، پھر وہ جڑنے لگیں۔ پھر ہڈیوں کے اس پنجر پر گوشت پوست چڑھا اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے گدھا زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس بستی کی طرف نظر دوڑائی جسے دیکھ کر ایسا خیال آیا تھا تو وہ بھی آباد ہو چکی تھی۔ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ " اور تا کہ ہم تجھے لوگوں کے لئے ایک نشانی بنائیں۔" جس سے اللہ کی قدرت ظاہر ہو کہ وہ مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے اٹھا سکتا ہے۔ تا کہ یہ ایسی مثال بن جائے جس کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ پیغمبر نے جو خبریں دی ہیں وہ واقعی سچی ہیں۔ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا " اور تو دیکھ کر ہم ہڈیوں کو کس طرح اٹھاتے ہیں۔" اور انہیں ایک دوسری سے جوڑتے ہیں۔ ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا " پھر ہم ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔" پس اس نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتے دیکھ لیا۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ " جب یہ سب ظاہر ہو چکا۔" اور اسے اللہ کی قدرت کا علم ہو گیا تو کہنے لگا: قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ " میں جان گیا ہوں اور مجھے علم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ آباد کو برباد اور اجڑے دیار کو پھر سے آباد کر سکتا ہے زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ

کرنے پر قادر ہے۔

کسی چیز کو تسلیم اور یقین کر لینے کے تین درجے

کسی چیز کو تسلیم کر لینے یا اس پر یقین کر لینے کے تین درجے ہیں، اگر کسی چیز کا علم کسی دوسرے ثقہ شخص کی معرفت ہو تو اسے علم الیقین کہتے ہیں، کیونکہ ایسی چیز کا ادراک علم کے ذریعے ہوا ہے اور اگر کوئی شخص خود اپنی آنکھوں سے کوئی واقعہ دیکھ لے تو اسے عین الیقین کہتے ہیں اور یقین کا تیسرا درجہ حق الیقین ہے اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب کوئی واقعہ خود اپنے ساتھ پیش آئے۔ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے اوپر وارد ہوئی اور اس کی کیفیت خود اپنے اوپر طاری ہوئی ہو۔اس سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور یہ کسی چیز کو تسلیم کر لینے کا آخری درجہ یعنی حق الیقین ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ یقین کے تین درجے ہیں: علم، عرفان، ایقان۔ان تینوں مدارج کو صوفیاء اپنی اصطلاح میں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے عنوانات سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت عزیر (علیہ السلام) کا واقعہ عین الیقین بھی ہے اور حق الیقین بھی عین الیقین اس لحاظ سے کہ حضرت عزیر (علیہ السلام) نے خود اپنی آنکھوں سے مردہ گدھے کو زندہ ہوتے دیکھا۔ان کی نظروں کے سامنے گدھے کی بوسیدہ ہڈیوں سے ڈھانچہ تیار ہوا، پھر ان پر گوشت چڑھا، گدھے کی شکل وصورت بنی اور پھر وہ آواز دینے لگا۔یہ واقعہ حق الیقین کے درجے میں اس لحاظ سے ہے کہ یہ معاملہ خود عزیر (علیہ السلام) کے ساتھ پیش آیا، وہ خود سو سال تک موت کی آغوش میں رہے اور پھر زندہ ہو گئے۔جہاں تک پہلے درجے علم الیقین کا تعلق ہے تو حضرت عزیر (علیہ السلام) کو بھی حاصل تھا، کیونکہ آپ اللہ کے نبی اور برگزیدہ مومن تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت کے دن دوبارہ جی اٹھنے پر علمی لحاظ سے بھی یقین تھا۔اگلی آیت میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہے، وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار اور علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک کا مشاہدہ ہے۔

کمال قدرت کا مشاہدہ/ پرندوں کی موت وحیات/ یقین کے تین درجات کا مشاہدہ/ معجزہ اور کرامت

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ رَبِّ أَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ط قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط قَالَ بَلٰى
وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ط قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ
عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا ط وَاعْلَمْ أَنَّ اللهَ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿٢٦٠﴾

ایمان کی اعلیٰ ترین سطح (حق الیقین)

وَإِذْ قَالَ	اور جب کہا	إِبْرٰهِمُ	ابراہیم نے				
رَبِّ	اے میرے رب	أَرِنِيْ	مجھے دکھا	كَيْفَ	کیسے		
تُحْيِ	تو زندہ کرے گا	الْمَوْتٰى	مُردوں کو؟	قَالَ	(اللہ نے) کہا		
أَ	کیا (تو سوال کرتا ہے)	وَلَمْ	اور نہیں	تُؤْمِنْ	تو ایمان لایا؟		
قَالَ	اس (ابراہیم) نے کہا	بَلٰى	کیوں نہیں!	وَلٰكِنْ	اور لیکن		
لِّيَطْمَئِنَّ	تاکہ مطمئن ہو جائے	قَلْبِيْ	میرا دل				

قَالَ	(اللہ نے) فرمایا	فَخُذْ	پس تو پکڑ لے	اَرْبَعَةً	چار
مِّنَ الطَّيْرِ	پرندے (کوئی سے)	فَصُرْهُنَّ	پھر مانوس کر لے اُن کو		
اِلَيْكَ	اپنے ساتھ	ثُمَّ	پھر	اجْعَلْ	رکھ دے
عَلٰى	اوپر	كُلِّ جَبَلٍ	ہر پہاڑ کے	مِّنْهُنَّ	ان میں سے
جُزْءًا	ایک ایک ٹکڑا	ثُمَّ	پھر	ادْعُهُنَّ	تو اُن کو بلا
يَاْتِيْنَكَ	وہ تیرے پاس آئینگے	سَعْيًا	دوڑتے ہوئے		
وَاعْلَمْ	اور جان لے	اَنَّ اللّٰهَ	کہ بیشک اللہ		
عَزِيْزٌ	بہت غالب	حَكِيْمٌ	خوب حکمت والا ہے۔(260)		

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر دلالت کرنے والا ایک اور واقعہ بیان کیا جارہا ہے، یہ بھی ایک عظیم اور محسوس دلیل ہے، جس سے اللہ کی قدرت ظاہر ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ وہ فوت شدہ لوگوں کو جزا و سزا دینے کے لئے زندہ فرمائے گا۔ اللہ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہوں نے اللہ سے درخواست کی کہ انہیں مردوں کو زندہ ہوتا آنکھوں سے دکھا دیا جائے۔ آپ کو اللہ کے بتانے سے اس کا یقین تو حاصل ہو چکا تھا لیکن آپ کی خواہش تھی کہ اس کا بچشم سر مشاہدہ فرمالیں تا کہ انہیں حق الیقین کا مقام حاصل ہو جائے۔ یہ احیائے موتٰی کا دوسرا واقعہ ہے جو ایک نہایت جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی خواہش اور ان کے اطمینان قلب کے لئے دکھایا گیا۔ یہ چار پرندے کون کون سے تھے؟ مفسرین نے مختلف نام ذکر کئے ہیں لیکن ناموں کی تعیین کا کوئی فائدہ نہیں، اس لئے اللہ نے بھی ان کے نام ذکر نہیں کئے۔ بس یہ چار مختلف پرندے تھے۔ اس لئے اللہ نے انہیں فرمایا: قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ "کیا تمہیں ایمان نہیں؟ جواب دیا: ایمان تو ہے، لیکن میرے دل کی تسکین ہو جائے گی۔" اس کی وجہ یہ ہے کہ یقینی دلائل یکے بعد دیگرے آنے سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور یقین کامل ہو جاتا ہے۔ اہل عرفان اسی کے حصول

کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔اس سوال وجواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یہ بات صاف کردی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ فرمائش خدانخواستہ کسی شک کی وجہ سے نہیں تھی،انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر پورا یقین تھا؛لیکن آنکھوں سے دیکھنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے،اس سے نہ صرف مزید اطمینان حاصل ہوتا ہے،بلکہ اس کے بعد انسان دوسروں سے یہ کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں دلائل سے اس کا علم حاصل کرنے کے علاوہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔غیب پر حضرات انبیاء علیہم السلام کا ایمان جس قدر پختہ ہوتا ہے دوسروں کا نہیں ہوسکتا۔تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا غیب پر ایمان اسی طرح کامل اور قطعی ہوتا ہے جس طرح ان کا مشاہدہ۔انبیاء علیہم السلام کا غیب پر ایمان محض تسلیم کرنے کی حد تک نہیں ہوتا،بلکہ یہ ”حق الیقین“ (آنکھوں دیکھا یقین) کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ وہ فرشتوں،آسمانی کتب،اور آخرت کے حقائق کا براہِ راست مشاہدہ روحانی آنکھ سے کرتے ہیں۔وہ غیب پر کسی شک یا گمان کے بغیر،بلکہ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے قطعی اور یقینی علم کی بنیاد پر ایمان لاتے ہیں مگر جس مشن کے لیے انہیں کھڑا کیا جاتا ہے۔اس کا ایک تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ انہیں عین الیقین حاصل ہو،تا کہ وہ دوسرے لوگوں کو آنکھوں دیکھی حقیقت کی بنیاد پر ایمان بالغیب کی پرزور دعوت دے سکیں اسی لیے اکثر انبیاء کو مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کی سیر بھی کرادی جاتی ہے اور کسی حد تک مافوق الفطری اسباب پر مطلع بھی کر دیا جاتا ہے اور پچھلے واقعہ میں حضرت عزیر علیہ السلام کو ایسے اسباب دکھلائے گئے۔

چار پرندوں کے زندہ ہونے کا ایمان افروز واقعہ

اب یہاں اسی نوعیت کا سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پروردگار کے حضور پیش فرما رہے ہیں۔اور اپنا دلی اطمینان چاہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو معراج کے دوران مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کی سیر کرائی گئی تھی۔نیز ایک دفعہ خواب میں اور ایک دفعہ نماز کسوف پڑھاتے وقت آپ کو جنت اور دوزخ دکھلائے گئے تھے۔اس کے رب نے اسے فرمایا: قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ”یعنی چار پرندے لے کر اکٹھے کر لے۔تا کہ سب کچھ

آپ کی آنکھوں کے سامنے واقع ہو اور آپ کے ہاتھوں سے اس کا مشاہدہ کرایا جائے۔ فَصُرْهُنَّ کے ایک معنی أَمِلْهُنَّ کئے گئے ہیں یعنی ان کو "ہلالے" (مانوس کرلے) تاکہ زندہ ہونے کے بعد ان کو آسانی سے پہچان لے کہ یہ وہی پرندے ہیں اور کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔ : ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا "پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو۔" یعنی ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے اجزا کو باہم ملا دو اور قریب کے پہاڑوں میں سے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو۔ اس آیت کی جزئیات میں مفسرین نے بہت اختلاف کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ چاروں پرندے ایک ہی جنس کے تھے۔ یا الگ الگ جنسوں کے، جزءاً سے مراد ان کو ذبح کر کے اور قیمہ بنا کر چاروں پرندوں کے گوشت کو ملا دینا ہے یا فقط ٹکڑے کر دینا ہی کافی ہے یا ملا دینا بھی ضروری ہے۔ یہ پہاڑ بھی آیا چار ہی تھے جن پر ایک ایک حصہ رکھا گیا یا کم وبیش تھے جن پر بانٹ کر ہر حصہ رکھا گیا۔ کیا ان پرندوں کے سر حضرت ابراہیم السلام نے ان حصوں میں ہی ملا دیئے تھے یا اپنے ہی پاس رکھے تھے۔ یہ سب تفصیلات مقصد کے لحاظ سے بے معنی ہیں۔ مقصد تو صرف یہ تھا کہ موت کے بعد مردہ جسم کی کوئی بھی پیچیدہ سے پیچیدہ صورت بن جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ ہر طرح کے مردہ کو زندہ کر کے دکھلا دے۔

علم الیقین (علم اور دلیل) ابتدائی درجہ

بہر حال علم الیقین (علم اور دلیل): یہ ابتدائی درجہ ہے، یہ وہ علم اور یقین ہے جو انسان کو عقلی دلیل، براہین اور ثبوت کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، مثال کے طور پر دور سے دھواں اٹھتا دیکھ کر یہ یقین کر لینا کہ وہاں آگ موجود ہے۔ یہ عقل وفہم کی حد تک ہوتا ہے اور انسان شک وشبہ سے نکل کر حق تسلیم کر لیتا ہے یا آگ کے بارے میں سن کر یقین کرنا یا کتابوں سے خدا کی معرفت حاصل کرنا۔ یہ دلیل و برہان پر مبنی علمی یقین ہے۔

عین الیقین (مشاہدہ اور بصیرت) درمیانی درجہ

عین الیقین (درمیانی درجہ) یہ اس سے اگلا اور پختہ مرحلہ ہے، جہاں علم دلیل سے آگے بڑھ کر

مشاہدے (دیکھنے) تک پہنچ جاتا ہے۔مثال: آگ کے دھوئیں کو دیکھنے کے بعد خود اس آگ کے قریب جا کر اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لینا، جب علمی یقین باطنی مشاہدے، انوار یا مکاشفات میں بدل جائے، یا آگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ یہ روحانی ترقی اور مشاہدے کا مقام ہے۔

حق الیقین (اعلیٰ ترین درجہ)

یہ یقین کی آخری منزل ہے جہاں مشاہدہ کرنے والا خود اس چیز کی حقیقت میں شامل ہو جاتا ہے۔مثال: آگ کے شعلے کو خود چھو لینا یا اس میں داخل ہو کر اس کی حدت (گرمی) کا ذاتی تجربہ کر لینا۔ یہ آخری اور اعلیٰ ترین درجہ ہے، جیسے آگ میں داخل ہو کر اس کی حرارت کو محسوس کرنا۔ یہ حقیقت کا ذاتی تجربہ، مقامِ فنا اور حق سبحانہ کا شہود ہے۔خلاصہ یہ کہ علم الیقین سے عین الیقین اور پھر حق الیقین تک کا سفر، شک و تردد سے نکل کر یقینِ کامل اور حقیقتِ مطلقہ سے ملاپ کا سفر ہے۔یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہر وقت مردے کو زندہ کرنے کا مشاہدہ کرا سکتی ہے، مگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو یہ مشاہدہ نہ کرایا جائے۔اور بات دراصل یہ ہے کہ یہ دنیا چونکہ امتحان کی جگہ ہے، اس لیے یہاں اصل قیمت ایمان بالغیب کی ہے، اور انسان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ ان حقائق پر آنکھوں سے دیکھے بغیر دلائل کی بنیاد پر ایمان لائے۔البتہ انبیائے کرام علیہم السلام کا معاملہ عام لوگوں سے مختلف ہے۔وہ جب غیب کے حقائق پر غیر متزلزل ایمان لا کر یہ ثابت کر چکے ہوتے ہیں کہ ان کا ایمان نہ کسی شک کی گنجائش رکھتا ہے اور نہ وہ آنکھ کے کسی مشاہدے پر موقوف ہے تو ان کے ایمان بالغیب کا امتحان اسی دنیا میں پورا ہو جاتا ہے۔پھر انہیں حکمت خداوندی کے تحت بعض غیبی حقائق آنکھوں سے بھی دکھا دیئے جاتے ہیں، تاکہ ان کے علم و اطمینان کا معیار عام لوگوں سے زیادہ ہو، اور وہ ڈنکے کی چوٹ یہ کہہ سکیں کہ وہ جس بات کی دعوت دے رہے ہیں اس کی حقانیت انہوں نے آنکھوں سے بھی دیکھ رکھی ہے۔ یہ واقعہ بھی چونکہ خرق عادات اور معجزہ ہے۔لہذا عقل پرستوں اور منکرین معجزات کو اس کی بھی مضحکہ خیز قسم کی تاویل کرنا پڑی۔بعض وہ لوگ جو خلاف عادت باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، انہوں نے اس آیت میں بھی ایسی کھینچ تان کی ہے

جس سے یہ نہ ماننا پڑے کہ وہ پرندے واقعتاً مر کر زندہ ہو گئے تھے۔لیکن قرآن کریم کا پورا سیاق اور جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان کا اسلوب ایسی تاویلات کی تردید کرتا ہے۔جو شخص عربی زبان کے محاورات اور اسالیب سے واقف ہو وہ ان آیات کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں نکالے گا جو ترجمے میں بیان کیا گیا ہے۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا پھر انہیں پکارو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے۔"یعنی انہیں مکمل زندگی حاصل ہو جائے گی۔تو وہ پوری قوت سے دوڑتے ہوئے اور تیزی سے اڑتے ہوئے آپ کے پاس آجائیں گے۔زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا ایک نمونہ ہے اس قسم کے بیشمار مشاہدات انسان اپنی روزمرہ زندگی میں کرتا ہے۔زمین انسان کی آنکھوں کے سامنے بالکل خشک ہو جاتی ہے۔کوئی سبزہ نہیں ہوتا، پھر بارش ہوتی ہے،تو پھر سرسبز ہو جاتی ہے،گویا اللہ تعالیٰ يُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔فرمایا كَذَٰلِكَ يُحْيِ اللَّهُ الْمَوْتَىٰ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دیگا یہ کوئی عجوبہ نہیں جس کا انکار کر دیا جائے۔اس قسم کی چیزیں تو ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ہر موسم کی اپنی بہار ہوتی ہے،کبھی درخت اور نباتات اپنے جوبن پر ہوتے ہیں، پھر خزاں کا موسم آتا ہے تو درختوں کے پتے گر جاتے ہیں اور درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔پھر جب بہار کا موسم آتا ہے تو نئے شگوفے پھوٹتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں، ان میں پھل لگتے ہیں۔پکتے ہیں اور پھر لوگ انہیں اتار لیتے ہیں۔یہی حال سبزیوں اور فصلوں کا ہے جب موسم آتا ہے تو کسان زمین کو پانی دیتا ہے یا آسمان سے بارش برستی ہے پھر زمین میں ہل چلایا جاتا ہے بیج بویا جاتا ہے پھر فصل اور سبزیاں اگتی ہیں اور جب پک کر تیار ہو جاتی ہیں تو انہیں کاٹ لیا جاتا ہے اور زمین پھر ایک دفعہ ویران ہو جاتی ہے۔بنی اسرائیل کے ایک مردہ کے زندہ ہونے کا واقعہ گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعہ بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس مردہ کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو جائے گا۔وہاں پر بھی یہی الفاظ آئے تھے" كَذَٰلِكَ يُحْيِ اللَّهُ الْمَوْتَىٰ "اللہ تعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی آنکھوں کے سامنے ذبح شدہ پرندوں کو زندہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک ہے جب اس کا حکم ہوگا۔ قیامت برپا ہوگی۔ تو تمام مردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد فرمایا: وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ "اور جان رکھو کہ اللہ غالب ہے حکمتوں والا۔" یعنی عظیم قوتوں والا ہے، جس سے اس نے مخلوقات کو مسخر کر رکھا ہے۔ کوئی مخلوق اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ بلکہ سب کی سب اس کی عظمت کے آگے سرنگوں اور اس کے جلال کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے افعال اس کی حکمت کے تابع ہیں۔ وہ کوئی کام بے مقصد نہیں کرتا۔ جس طرح چاہے کرے، اس کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا، وہ حکیم ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل الفاظ ساری آیت کا خلاصہ ہوتے ہیں، یہ قرآنی اعجاز ہے۔ اس آیت میں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے مردوں کو زندہ کرنے پر اسے کامل غلبہ و قدرت حاصل ہے "حَكِیْمٌ" کمال حکمت والا ہے، جس کے مطابق اس نے زندوں کی موت کے لیے اور مُردوں کو زندہ کرنے کے لیے ایک وقت مقرر رکھا ہے۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت کے تین واقعات آچکے ہیں۔ خصوصاً بعث بعد الموت کے متعلق حضرت عزیر (علیہ السلام) کا واقعہ اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا یہ پرندوں والا واقعہ بالکل واضح ہے۔ انبیاء (علیہم السلام) کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ اس قسم کا جو عجوبہ ظاہر کرتا ہے، اسے معجزہ کہتے ہیں۔ قرآن پاک اور احادیث میں بیشمار معجزات کا تذکرہ موجود ہے۔ اگر اس قسم کے واقعات کسی امتی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں تو وہ کرامت کہلاتے ہیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ معجزہ یا کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ ایسا کام انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ کسی نبی کے اختیار میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا کر سکتا ہے لہٰذا معجزات اور کرامات کے جو سچے واقعات ہیں۔ انہیں تسلیم کرنا چاہئے، مگر بلا تحقیق ہر بے سروپا کو کرامت تسلیم کرنا درست نہیں ہے۔ شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں جن کا

ثبوت ملتا ہے مگر بارہ سال تک کشتی ڈبوین والے واقعہ کی کوئی اصل نہیں ہے، لہٰذا یہ قابل تسلیم ہرگز نہیں۔معجزہ اور کرامت کے علاوہ ایک اور چیز ہے، جسے استدراج کہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی کافر کے ہاتھ میں بھی کوئی عجوبہ ظاہر کردے، مگر یہ عزت والی بات نہیں ہوتی بلکہ یہ امتحان ہوتا ہے، جس طرح حدیث شریف میں موجود ہے کہ دجال مُردوں کو زندہ کریگا یہ کرامت نہیں بلکہ استدراج ہوگا۔توحید باری تعالیٰ اور معاد کے متعلق تین واقعات بیان کرنے کے بعد روئے سخن پھر انفاق فی سبیل اللہ کی طرف جاتا ہے اگلی آیات کا تعلق پھر اسی آیت اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ کے ساتھ ہے، لہٰذا اگلے رکوع کا موضوع پھر وہیں سے چلے گا، جہاں پچھلا بیان ختم ہوا تھا، درمیان میں اس کی تائید کے لیے تین واقعات کا ذکر آگیا ہے۔

اجروثواب کے درجات/ معیارِ قبولیت/ سائل کے ساتھ نرم رویہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ
سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ
عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا
وَّلَآ اَذًی ۙ لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ
مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَۃٍ یَّتْبَعُھَآ اَذًی ؕ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ سے خاص جہاد مراد ہے

مَثَلُ	مثال	الَّذِیْنَ	اُن لوگوں کی جو	یُنْفِقُوْنَ	خرچ کرتے ہیں
اَمْوَالَھُمْ	اپنے مال	فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ		اللہ کی راہ میں	
کَمَثَلِ	مانند مثال	حَبَّۃٍ	اس دانے کی ہے		
اَنْۢبَتَتْ	جو اگاتا ہے	سَبْعَ	سات	سَنَابِلَ	بالیاں
فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ	ہر ہر بالی میں	مِّائَۃُ	سو	حَبَّۃٍ	دانے ہیں
وَاللّٰہُ	اور اللہ	یُضٰعِفُ	بڑھاتا ہے	لِمَنْ	جس کے لیے
یَّشَآءُ	چاہتا ہے	وَاللّٰہُ	اور اللہ	وَاسِعٌ	بڑا وسعت والا

عَلِیۡمٌ	خوب جاننے والا ہے۔(261)

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ "مثال ان لوگوں کی جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔" یعنی اس کی اطاعت میں اور اس کی خوشنودی کے کاموں میں۔ ان میں سب سے اہم جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنا ہے۔فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ: قرآن مجید میں "سَبِیۡلِ اللّٰهِ" کا لفظ عام یعنی اسلام کے معنی میں بھی آیا ہے، اس صورت میں اسلام کے ہر کام میں خرچ کرنا فی سبیل اللہ خرچ کرنا ہے اور خاص معنوں میں بھی آیا ہے، جیسا کہ سورہ توبہ (60) میں صدقات خرچ کرنے کی جگہوں میں ایک "فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ" ہے۔ وہاں "فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ" سے خاص جہاد مراد ہے، نیز صحیح بخاری میں حج کو بھی اس میں شمار کیا ہے۔ یہاں اگرچہ عام معنی بھی مراد لیا جاسکتا ہے مگر جیسا کہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا: "جہاد مراد لینا گزشتہ اور آئندہ آیات کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے۔ نیکی کے ہر کام میں خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ کہلاتا ہے تاہم جہاد کی خاطر خرچ کرنا اس کی خصوصی مد ہے، کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دین کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ جس سے دین کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دینی تعلیم کا فروغ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے علاوہ غرباء ومسکین کی اعانت، بیوگان اور یتامیٰ کی حاجت روائی انفاق فی سبیل اللہ کا اہم جزو ہے۔ اس قسم کے تمام اخراجات کی فضیلت اور اجر وثواب کو اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے، فرمایا: كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ "مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں، اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔" اس مثال کے ذریعے عمل کے ثواب میں اضافے کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ اضافہ بندہ دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ثواب میں اضافے کو اپنی بصیرت سے دیکھتا ہے۔ اس طرح آنکھوں دیکھی چیز کی وجہ سے ایمان کے ذریعے دیکھی ہوئی چیز پر یقین بڑھتا ہے۔ لہٰذا دل حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پوری آمادگی کے ساتھ خرچ کرتا ہے۔ کیونکہ اسے اس قدر اضافے اور اس اللہ کے عظیم احسان کی امید ہوتی ہے۔ جس طرح زرخیز زمین میں ایک دانہ بویا جائے اور اس کی مناسب دیکھ بھال اور آبیاری کی جائے تو اس

سے سات سو دانے پیدا ہوتے ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہونے ولے ایک پیسہ کا اجر وثواب سات سو گناہ حاصل ہوتا ہے۔

اسلام میں اعمال کی قبولیت کا بنیادی معیار

قرآن وسنت میں ہر نیکی کے اجر وثواب کے کئی معیار ہیں جن کا ذکر سورۃ الانعام میں آتا ہے وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ "اور اللہ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے۔" یعنی خرچ کرنے والے کے حال اور اس کے خلوص کے مطابق، یا خرچ کی کیفیت، منافع اور برمحل ہونے کی مناسبت سے ثواب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ہے جب کہ حدیث میں سات سو گنا تک بیان کیا گیا ہے۔اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ نیکی کے کام میں جس قدر اخلاص پایا جاتا ہے اس کے مطابق اس نیکی کا اجر وثواب حاصل ہوتا ہے، تاہم سورہ انعام کی آیت پاک کے مطابق ہر نیکی کا کم از کم اجر دس گنا ہے۔اس کے بعد جس قدر اخلاص بڑھتا جائیگا۔ثواب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاص پر سات سو گنا تک اجر حاصل ہوگا، تاہم مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ جس کے ساتھ دین کی اقامت اور اشاعت وابستہ ہے، اس سلسلہ میں کی گئی ادنیٰ یا ادنیٰ درجہ کی نیکی کا ثواب سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے اور پھر جس قدر خلوص بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اجر وثواب بھی بڑھتا جاتا ہے۔حاصل یہ ہے کہ اسلام میں اعمال کی قبولیت کا بنیادی معیار اخلاصِ نیت (صرف اللہ کے لیے کرنا) اور طریقہ رسول ﷺ کی پیروی ہے۔تقویٰ، پرہیزگاری، اور نیک نیتی سے کیا گیا چھوٹا عمل بھی اللہ کے ہاں زیادہ قیمتی ہے، جبکہ دکھاوا یا ریاکاری اعمال کو برباد کر دیتی ہے۔وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ "اور اللہ کشادگی والا ہے۔" اس کا فضل وسیع ہے، اس کی عطا بے حساب ہے جس میں کسی قسم کی کمی نہیں آتی۔لہٰذا خرچ کرنے والے کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ شاید کئی گنا بڑھا کر دینے کا ذکر مبالغے کے طور پر کیا گیا ہے۔اللہ کے لئے تو کوئی انعام بھی مشکل نہیں۔بیشمار عطا کے باوجود اسے کمی نہیں آتی۔اس کے ساتھ ساتھ وہ علیم بھی ہے اسے خوب معلوم ہے کہ کون اس دگنے چوگنے ثواب کا مستحق ہے اور کون نہیں۔لہٰذا وہ اضافہ وہیں کرتا ہے جہاں

اس کا صحیح مقام ہو، کیونکہ اس کا علم بھی کامل ہے اور حکمت بھی۔

احسان جتلانا نیکی کو تباہ کر دیتا ہے

اَلَّذِيْنَ	جو لوگ	يُنْفِقُوْنَ	خرچ کرتے ہیں	اَمْوَالَهُمْ	اپنے مال
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کی راہ میں	ثُمَّ	پھر		
لَا يُتْبِعُوْنَ	بعد میں نہیں رکھتے	مَآ اَنْفَقُوْا	جو انہوں نے خرچ کیا		
مَنًّا	کوئی احسان	وَّلَآ	اور نہ	اَذًى	کوئی تکلیف (دیتے ہیں)
لَّهُمْ	ان کے لیے	اَجْرُهُمْ	ان کا اجر ہے		
عِنْدَ رَبِّهِمْ	ان کے رب کے پاس	وَلَا	اور نہ		
خَوْفٌ	کوئی خوف (ہوگا)	عَلَيْهِمْ	ان پر	وَلَا	اور نہ
هُمْ	وہ	يَحْزَنُوْنَ	غمگین ہوں گے۔		

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال کی قبولیت کا ایک معیار مقرر کیا ہے اور وہ ہے کہ صدقہ محض رضا الٰہی کے لیے ہو اور وصول کنندہ کو نہ تو احسان جتلایا جائے اور نہ اسے صدقہ کے بدلے اذیت دی جائے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى پھر اس خرچ کرنے کے پیچھے احسان اور اذیت نہیں لگاتے یعنی وہ کوئی چیز دے کر مستحق کو نہ احسان جتلاتے ہیں کہ میں نے تیری فلاں وقت حاجت پوری کی اور نہ اسکو اذیت پہنچاتے ہیں یعنی ستاتے نہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غریب آدمی کو صدقہ دیا اور پھر اسے بار بار یاد دلاتے رہے یا دوسروں کے سامنے بیان کرتے پھرتے ہیں کہ میں نے فلاں آدمی کو زکوٰۃ وخیرات دی ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس محتاج کو کوئی چیز عطا کی ہے۔ اس کے بدلے میں اس سے بیگار لی جائے، جو ظاہر ہے کہ اسے تنگ کرنے اور ستانے کے مترادف ہوگا کسی کو دھکا دے دیا جائے۔ پٹائی کر دی جائے، گالی نکالی جائے یا طعن وملامت کی جائے، یہ سب ایذا رسانی کی باتیں

ہیں ۔فرمایا وہ لوگ جو خرچ کرنے کے بعد ایسی بری حرکات سے باز رہتے ہیں لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ایسے ہی لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے جو انہیں کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ایسے لوگوں کو نہ اس دنیا میں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ اگلے جہاں میں غمگین ہونگے بلکہ ان کی دنیا و آخرت ہر دو مقامات سنور جائیں گے اور وہ کامیاب و کامران ہونگے ۔ برخلاف اس کے اگر کسی شخص نے کسی محتاج کی مالی اعانت بھی کی، اور اس کو احسان جتلایا اذیت پہنچائی، تو اس کا صدقہ باطل ہوگا۔ اور اس کے بدلے میں کوئی اجر وثواب بھی حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ الٹا معصیت میں مبتلا ہو کر عذاب کا مستحق ہو جائیگا۔

ناکام و نامراد لوگ

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آپ نے فرمایا: تین آدمی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ کلام کرے گا نہ ان کی طرف نظر رحمت کرے گا اور نہ ہی ان کو پاک کرے گا۔ اور ان کے لیے عذاب الیم ہے ۔" رسول اللہ ﷺ نے تین دفعہ یہ فرمایا۔ ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: " وہ تو ناکام و نامراد ہو گئے، یارسول اللہ! وہ کون ہیں؟ " آپ نے فرمایا: " کپڑا لٹکانے والا، احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کے ساتھ اپنا مال فروخت کرنے والا۔" [مسلم، ال إیمان، باب بیان غلظ تحریم إسبال ۔۔:106] فقہائے کرام رحمۃ تعالیٰ علیہم نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جن افعال و اعمال کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے کلام نہیں کرے گا یا نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا، یا پاک نہیں کرے گا۔ تو ایسے افعال کبیرہ گناہ ہوتے ہیں ۔گویا صدقہ کرنے کے بعد احسان جتلانے والے کا صرف صدقہ ہی ضائع نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک کبیرہ گناہ کا بوجھ بھی اپنے سر پر لاد لیتا ہے۔

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ	اچھی بات کہنا	وَّمَغۡفِرَةٌ	اور درگزر کرنا
خَيۡرٌ	بہت بہتر ہے	مِّنۡ صَدَقَةٍ	اُس خیرات سے
يَّتۡبَعُهَآ	جس کے بعد ہو	اَذًى	ایذا دینا (ستانا)

وَاللّٰهُ	اور اللہ	غَنِيٌّ	بڑا بے نیاز	حَلِيْمٌ	نہایت بردبار ہے۔(263)

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ: یعنی اگر کوئی صدقہ نہیں کرسکتا تو اچھے الفاظ کے ساتھ معذرت کرلے اور سائل کے اصرار اور بدتمیزی پر غصہ ہونے کے بجائے مغفرت یعنی معافی اور درگزر سے کام لے اور سوچ لے کہ اللہ تعالیٰ کتنا غنی ہے، کتنا بردبار ہے جو ہماری خطاؤں کے باوجود حلم سے کام لیتا ہے۔ہمیں بھی اس طرح حلم سے کام لینا چاہیے۔حضرت جابر رضی بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکی میں سے یہ بھی ہے کہ تو اپنے بھائی کو کھلے چہرے کے ساتھ ملے اور یہ کہ اپنے ڈول میں سے اس کے ڈول میں (پانی) انڈیل دے۔“ (ترمذی)

صدقہ کر کے احسان جتلانا حرام ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے دل کی خوشی کا باعث بننا کارِثواب ہے۔اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ سائل کو جواب دینا ہو تو اچھے الفاظ سے جواب دیا جائے اور اسے دعا دی جائے۔

وَّ مَغْفِرَةٌ اور برائی کرنے والے کو معاف کر دینا“ یعنی اسے مواخذہ نہ کرنا۔اس میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر سائل کوئی نامناسب حرکت کرے تو اسے معاف کر دیا جائے۔ یہ دونوں احسان ایسے ہیں، جن کے ساتھ ان کو تباہ کرنے والی کوئی غلطی موجود نہیں **خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى** اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے۔مطلب یہ کہ سائل کے بضد ہونے پر اسے نرمی کے ساتھ جواب دے دیا جائے تو بہتر ہے۔بجائے اس کے کہ اسے کچھ دے بھی دیا جائے اور ساتھ طعن تشنیع اور گالی بھی دے دی جائے یا اسے دھکے دیکر نکال دیا جائے ایسا کرنے سے صدقہ باطل ہو جائے،لہٰذا یہ اس صدقے کے احسان سے بہتر ہیں، جن کے ساتھ احسان جتلانے کی یا کسی اور انداز سے تکلیف پہچانے کی خرابی موجود ہے۔اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس صدقہ کے ساتھ تکلیف پہنچانے کی خرابی موجود نہ ہو وہ صدقہ نرم بات کہنے اور معاف کرنے سے افضل ہے۔صدقہ کر کے احسان جتلانا حرام ہے جس سے عمل ضائع ہو جاتا ہے۔کیونکہ اصل احسان اللہ ہی کا ہے۔لہٰذا

بندے کے لئے مناسب نہیں کہ کسی کو ایسا احسان جتلائے جو اس کی طرف سے نہیں ہوا (بلکہ اصل میں اللہ کی طرف سے ہوا ہے) علاوہ ازیں احسان جتلانا غلام بنانے کے مترادف ہے اور عبودیت اور جھکنا صرف اللہ کے لئے روا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ غنی ہے۔ جو تمام مخلوقات سے مستغنی ہے۔

لفظ اقوات کا بنیادی معنی اور مفہوم

اور تمام مخلوقات تمام حالات اور تمام اقوات میں اس کی محتاج ہیں (لفظ" اقوات" عربی زبان کا لفظ ہے جو" قوت" کی جمع ہے۔اس کا بنیادی معنی اور مفہوم خوراک، غذا، رزق، اور روزی کے ہیں۔ یہ وہ تمام بنیادی اشیاء اور ضروریاتِ زندگی ہیں جن پر انسان یا کسی بھی جاندار کی بقا، پرورش اور نشوونما کا دارومدار ہوتا ہے) لہٰذا تمہارا صدقہ، تمہارا خرچ کرنا اور تمہاری نیکیاں ان سب کا فائدہ خود تم ہی کو حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتے وقت یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے صدقات وخیرات کی ضرورت ہے، نہیں بلکہ وَ اللّٰہُ غَنِیٌّ اور اللہ بے نیاز ہے اسے ان کی ضرورت نہیں، اسے ان کی ضرورت نہیں، صدقہ دینے سے انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے اسے تقرب الیٰ اللہ حاصل ہوگا۔اس کا نفس پاک ہوجائے گا،اس کے ساتھ ساتھ وہ حَلِيمٌ " بردبار ہے" اکثر اوقات مجرموں کو مہلت دیتا ہے۔ بہت سے لوگ اللہ کی اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر برے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ وقت مقرر پر گرفت بھی کر لیتا ہے۔ جو اس کی نافرمانی کرے اسے فوراً سزا نہیں دیتا، حالانکہ وہ اس کی قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی رحمت، احسان اور بردباری اسے گناہگاروں کو فوری سزا دینے سے مانع ہوجاتی ہے۔ بلکہ وہ انہیں مہلت دیتا ہے، انہیں مختلف انداز سے اپنی آیات سناتا اور دکھاتا ہے، تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں، البتہ جب یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان لوگوں میں خیر کی کوئی رمق نہیں رہی اور انہیں آیات سے کوئی فائدہ نہیں ہورہا۔ پھر ان پر عذاب نازل فرمادیتا ہے اور اپنے عظیم ثواب سے محروم فرمادیتا ہے۔

صدقہ باطل ہونے کی وجوہات اور صدقہ وخیرات کی قبولیت کا معیار/ چٹان اور باغ کی مثال

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَا

لَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ

تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا

یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ

فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾

انفاق کے مقبول ہونے کی لازمی شرائط

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ	اے وہ لوگو! جو		اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو	
لَا تُبْطِلُوْا	نہ ضائع کرو		صَدَقٰتِكُمْ	اپنے صدقات	
بِالْمَنِّ	احسان جتلا کر		وَالْاَذٰی	اور تکلیف دے کر	
كَالَّذِیْ	اس شخص کی طرح جو	یُنْفِقُ	خرچ کرتا ہے	مَالَهٗ	اپنا مال

رِئَآءَ النَّاسِ	لوگوں کے دکھاوے کیلئے	وَلَا يُؤْمِنُ	اور نہیں وہ ایمان لاتا		
بِاللّٰهِ	اللہ پر	وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	اور آخرت کے دن (پر)		
فَمَثَلُهٗ	پس اس کی مثال	كَمَثَلِ	مانند مثال		
صَفْوَانٍ	ایک چکنے پتھر کے ہے	عَلَيْهِ	اُس (پتھر) پر		
تُرَابٌ	مٹی ہے	فَاَصَابَهٗ	پھر اس پر برسے	وَابِلٌ	تیز بارش
فَتَرَكَهٗ	تو چھوڑا اُس (بارش) نے اُس (پتھر) کو	صَلْدًا	صاف کرکے		
لَا يَقْدِرُوْنَ	نہیں قدرت رکھیں گے (ایسے لوگ)	عَلٰى	اوپر		
شَيْءٍ	کسی چیز کے	مِّمَّا	اُس میں سے جو		
كَسَبُوْا	انہوں نے کمایا	وَاللّٰهُ	اور اللہ		
لَا يَهْدِي	نہیں ہدایت دیتا	الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ	کافر قوم کو۔(264)		

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى اے اہل ایمان! اپنے صدقات وخیرات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو۔ یہی دو چیزیں گذشتہ درس میں بھی بیان ہوئی ہیں وہاں فرمایا تھا ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى پھر اپنے خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں، مَنًّا وَّلَآ اَذًى: نہ احسان جتائیں اور نہ تکلیف دیں۔ صدقہ دینے کے بعد احسان جتلانا اور جسے صدقہ دیا اسے تکلیف دینا ناجائز وممنوع ہے اور اس سے صدقے کا ثواب ضائع ہوجاتا ہے، انفاق فی سبیل اللہ کی مذکورہ فضیلت صرف اس شخص کو حاصل ہوگی جو مال خرچ کرکے احسان نہیں جتلاتا نہ زبان سے ایسا کلمہ تحقیر ادا کرتا ہے جس سے کسی غریب، محتاج کی عزت نفس مجروح ہو اور وہ تکلیف محسوس کرے، خرچ کرنے کا مقصد صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہو۔ اس میں دکھاوا، نمود ونمائش یا شہرت کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن مجید میں واضح ہے کہ ریاکاری سے خرچ کیا گیا مال ضائع ہوجاتا ہے۔

پھر فرمایا: كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ"

یعنی اگر تم نے شروع میں اللہ کی رضا کی نیت رکھ کر بھی عمل کیا ہو تو احسان جلانے سے وہ تباہ ہو جاتا رہے۔ چنانچہ تمہارا یہ عمل اس شخص کے عمل کی طرح ہو جائے گا جو صرف دکھاوے کے لئے نیکی کرتا ہے۔ اس کا مقصد اللہ کی رضا اور جنت کا حصول نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا عمل سرے سے نا قابل قبول ہے۔ کیونکہ عمل مقبول کی شرط یہ ہے کہ وہ صرف اللہ کے لئے ہو۔ اس شخص نے اصل میں عمل کیا ہی لوگوں کے لئے ہے، اللہ کے لئے کیا ہی نہیں۔ لہٰذا اس کا عمل کالعدم ہوگا اور اس کی محنت بے کار جائے گی۔ ریا کاری چونکہ نیت ہی درست نہیں ہوتی اور نیت ہی اصل بیج ہے۔ لہٰذا ایسا بیج بار آور نہیں ہوسکتا۔ اس کے حال کے مطابق تو اس کی مثال فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ "ایسے شخص کی مثال یوں ہے جیسے ایک صاف اور چکنا پتھر ہو جس پر مٹی کی تہہ جمی ہو۔ یعنی یہ ریا کار بظاہر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی جمی ہوئی ہو ("تُرَابٌ" کی تنوین تقلیل کے لیے ہے) اور دیکھنے والا اسے قابل کاشت زمین خیال کرے، لیکن جونہی بارش ہو اس کی تمام مٹی ڈھل جائے اور وہ صاف چٹان کی چٹان رہ جائے، اسی طرح ریا کاروں کے عمل ان کے صحیفۂ اعمال سے مٹ جائیں گے اور وہ ان سے نہ کوئی فائدہ اٹھا سکیں گے فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ جب اس پر زور کا مینہ برسا، تیز بارش ہوئی فَتَرَكَهٗ صَلْدًا تو مٹی بہ گئی اور صاف چٹان باقی رہ گئی۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح چٹان پر بوئے گئے بیج سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ریا کاری میں خرچ کیے گئے مال کا کچھ بدلہ نہیں ملے گا۔ جو بھی صدقہ احسان جتلانے، ایذا پہنچانے یا ریا کاری کے لیے دیا جائے گا وہ باطل ہو جائے گا فرمایا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا یہ لوگ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں ہونگے جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یعنی جو صدقہ وخیرات کیا ہے، کیونکہ اس میں ریا کاری کا عنصر شامل ہے لہٰذا انہیں اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ فرمایا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ اللہ تعالیٰ کافروں کی رہنمائی نہیں کرتا، جو لوگ بظاہر نیکی کا کام کرتے ہیں۔ دھڑا دھڑ مال خرچ کر رہے ہیں مگر نیت میں خرابی ہے۔ کوئی احسان جتلا رہا ہے کوئی ایذاء پہنچا رہا ہے اور کوئی محض ذاتی

شہرت کی خاطر خرچ کر رہا ہے تو ایسے لوگ ہمیشہ غلط راستے پر بھٹکتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی راہ راست کی طرف راہنمائی نہیں فرمائیں گے یہ ان کے لیے سزا کے طور پر ہے۔ ورنہ اگر ان میں ذرہ بھی نیک نیتی موجود ہو، تو اللہ تعالیٰ ان کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف فرما دے، مگر جب تک یہ لوگ اپنی بری حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ کفر، شرک اور فسق و فجوز پر نادم ہو کر اس کو ترک نہیں کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے خود صراط مستقیم کی رہنمائی طلب نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب نہیں کرے گا۔ بہرحال اس آیت میں ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ صدقہ وخیرات کر کے احسان جتلانا اور تکلیف دہ باتیں کرنا، اہل ایمان کا شیوہ نہیں، بلکہ ان لوگوں کا وطیرہ ہے جو منافق ہیں اور ریاکاری کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ دوسرے، ایسے خرچ کی مثال صاف چٹان کی سی ہے جس پر کچھ مٹی ہو، کوئی شخص پیداوار حاصل کرنے کے لئے اس میں بیج بو دے لیکن بارش کا ایک جھٹکا پڑتے ہی وہ ساری مٹی اس سے اتر جائے اور وہ پتھر مٹی سے بالکل صاف ہو جائے۔ یعنی جس طرح بارش اس پتھر کے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوئی، اسی طرح ریاکار کو بھی اس کے صدقہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ راہِ خدا کا خرچ، جسے قرآن کبھی انفاق، کبھی انفاق فی سبیل اللہ، کبھی صدقہ اور کبھی زکوٰۃ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، محض ایک نیکی اور خیرات نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور اسلام کے پانچ ارکان ایمان، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج میں سے تیسرا رکن ہے۔ قرآن مجید میں ۳۷ مقامات پر اس کا اور نماز کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور پورے زور کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں لازمۂ اسلام اور مدارِ نجات ہیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کی قبولیت اور اس کا ثواب پانے کا دارومدار

وَمَثَلُ	اور مثال	الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کی جو	يُنْفِقُوْنَ	خرچ کرتے ہیں
اَمْوَالَهُمُ	اپنے مال	ابْتِغَآءَ	حاصل کرنے کیلئے		
مَرْضَاتِ	رضامندی	اللّٰهِ	اللہ کی		
وَتَثْبِيْتًا	اور پختگی پیدا کرنے کے لئے	مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	اپنے نفسوں میں		

كَمَثَلِ	مانند مثال	جَنَّةٍ	(اُس) باغ کے ہے	بِرَبْوَةٍ	(جو) ٹیلے پر ہے
اَصَابَهَا	اس پر برسی	وَابِلٌ	تیز بارش		
فَاٰتَتْ	چنانچہ لایا (وہ باغ)	اُكُلَهَا	اپنا پھل	ضِعْفَيْنِ	دوگنا
فَاِنْ	پھر اگر	لَّمْ يُصِبْهَا	نہ پہنچے اُس (باغ) کو	وَابِلٌ	تیز بارش
فَطَلٌّ	تو پھوار (ہی کافی ہے)	وَاللّٰهُ	اور اللہ		
بِمَا تَعْمَلُوْنَ	جو تم عمل کرتے ہو	بَصِيْرٌ	خوب دیکھنے والا ہے۔(265)		

ارشاد ہوتا ہے وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی رضا کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ رضا الٰہی کا حصول بہت بڑی نعمت ہے۔جس سے اللہ راضی ہوگیا اسے سب کچھ مل گیا اور جس کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوگیا وہ ہر چیز سے محروم ہوگیا،تو فرمایا جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں یہ ریاکاروں کے مقابلے میں مخلص مومنوں کی مثال ہے،یعنی جو لوگ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں اور دل کے اس اطمینان کے ساتھ خرچ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس کا وافر اجر عطا فرمائے گا اور ان کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اور ان کا دوسرا مقصد اپنے نفسوں کو ثابت رکھنا ہوتا ہے۔دل کو ثابت رکھتے ہوئے خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ انھیں خرچ کرتے ہوئے کوئی تردد یا پریشانی ہوتی ہے نہ بعد میں کوئی پشیمانی۔یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ ان کا مقصود اصلاح نفس بھی ہوتا ہے۔تاکہ دل انفاق فی سبیل اللہ اور نیکی کے دوسرے کاموں پر ثابت قدم رہے اور ان کے دلوں سے بخل کا مادہ دور ہو کر ان میں فیاضی کا مادہ پیدا ہو جائے۔فرمایا ایسے لوگوں کی مثال كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ ان کے خرچ کرنے کی مثال اس باغ کی سی ہے جو اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتے ہیں،ان کا خرچ کیا ہوا مال اس باغ کی مانند ہے جو پر فضا اور بلند چوٹی پر ہو،کہ اگر زوردار بارش ہو تو اپنا پھل دگنا دے ورنہ ہلکی سی پھوار اور شبنم بھی اس کو کافی ہو جاتی ہے۔اسی طرح ان کے نفقات بھی،چاہے کم ہو یا زیادہ،عند اللہ کئی گنا اجر و ثواب

کے باعث ہوں گے۔

"جَنَّةٌ" کی تفسیر اور اس کا قرآنی مفہوم

عربی زبان میں "جَنَّةٌ" (جمع: جنّات/ جنان) کا بنیادی معنی چھپانا یا ڈھانپ لینا ہے ہر ایسا گھنا باغ جس کے درخت زمین اور اس میں موجود چیزوں کو اپنی گھنی چھاؤں اور پتوں کی وجہ سے چھپالیں۔جنت (بہشت): اسلامی تعلیمات میں یہ اس ابدی اور خوشگوار گھر کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کے لیے تیار کیا ہے چونکہ یہ لفظ چھپانے کے معنی دیتا ہے، اس لیے ایسی چیز جو انسان کو نقصان سے بچائے یا چھپائے، اسے بھی "جَنَّةٌ" کہتے ہیں (جیسے جنگ میں استعمال ہونے والی ڈھال) قرآن مجید میں یہ لفظ اکثر آخرت کے انعامات، دائمی خوشیوں اور جنت الفردوس کے لیے استعمال ہوا ہے، کیونکہ یہ دنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے اور اس کی نعمتیں انسانی عقل وگمان سے بالا ہیں۔یعنی جَنَّةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں اتنی کثرت سے درخت ہوں جو زمین کو ڈھانک لیں یا وہ باغ، جس کے چاروں طرف باڑھ ہو اور باڑھ کی وجہ سے باغ نظروں سے پوشیدہ ہو۔ یہ جن سے ماخوذ ہے، جن اس مخلوق کا نام ہے جو نظر نہیں آتی، پیٹ کے بچے کو جنین کہا جاتا ہے کہ وہ بھی نظر نہیں آتا، دیوانگی کو جنون سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس میں بھی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔اور جنت کو بھی اس لئے جنت کہتے ہیں کہ وہ نظروں سے مستور ہے۔اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتۡ اُكُلَهَا ضِعۡفَيۡنِ زوردار بارش برسے تو وہ اپنا پھل دگنا لائے۔" زمین نم دار ہونے کی وجہ سے اور دوسرے معاون اسباب کی وجہ سے اور بکثرت پانی کی موجودگی کی وجہ سے اس باغ سے دگنا پھل حاصل ہوا۔

فَاِنۡ لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ اور اگر اس پر بارش نہ برسے تو پھوار ہی کافی ہے۔" یعنی عمدہ زمین کی وجہ سے معمولی بارش بھی کافی ہے۔ یہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کا حال ہے۔ کوئی زیادہ خرچ کرے یا کم، ہر ایک کو اپنے حالات کے مطابق فائدہ حاصل ہوتا ہے اور ہر ایک کے ثواب میں پوری طرح اضافہ ہوتا ہے۔اس کو بڑھانے والا وہ ہے جو تجھ پر تجھ سے زیادہ رحم

کرنے والا ہے۔ جہاں تجھے اپنے فائدے کا خیال نہیں رہتا، اسے وہاں بھی تیرا فائدہ مقصود ہوتا ہے۔ اگر اس دنیا میں اس طرح کا کوئی باغ ہوتا، تو لوگ اس کے حصول کے لئے پوری کوشش کرتے، بلکہ ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور جنگ وجدل تک نوبت پہنچ جاتی۔ حالانکہ یہ دنیا فنا ہونے والی ہے اور یہاں بیشمار آفات ومصائب ہیں اور یہ ثواب جس کا اللہ نے ذکر فرمایا ہے، مومن اسے بصیرت ایمانی کے نور سے گویا سامنے دیکھتا ہے، وہ جہاں دائمی ہے اس کی تمام خوشیاں اور نعمتیں دائمی ہیں۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ ان کی ہمت بیدار نہیں ہوتی، اس کے لئے جدوجہد کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیا اس کی وجہ آخرت سے بے رغبتی ہے یا اللہ کے وعدے پر یقین کمزور ہے؟ ورنہ اگر بندے کو واقعی کما حقہ یقین ہوتا اور دل میں ایمان سرایت کر چکا ہوتا، تو دل اس کے لئے جذبے اور ولولے سے معمور ہو جاتے، اور ثواب کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا آسان ہو جاتا۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”زور کے مینہ سے مراد زیادہ مال خرچ کرنا ہے اور ”طل“ (کچھ شبنم) سے مراد تھوڑا مال۔ (”طلٌّ“ پر تنوین تقلیل کی وجہ سے کچھ شبنم ترجمہ کیا ہے) سو اگر نیت درست ہے تو زیادہ خرچ کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے اور تھوڑا بھی کام آتا ہے، جیسے خالص زمین پر باغ ہے، جتنا مینہ برسے گا اس کا فائدہ ہے، بلکہ اوس بھی کافی ہے اور نیت درست نہیں تو جس قدر زیادہ خرچ کرے ضائع ہے، کیونکہ زیادہ مال دینے میں دکھاوا بھی زیادہ ہے، جیسے پتھر پر دانہ کہ جتنا زور کا مینہ برسے زیادہ نقصان پہنچائے کہ مٹی دھوئی جائے۔“ (موضح) جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں آتا ہے۔ ”أَخْلِصْ دِينَكَ يَكْفِكَ الْقَلِيلُ مِنَ الْعَمَلِ“ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیثِ مبارک کا حصہ ہے، جس کا مفہوم یہ ہے: ”اپنے دین (یعنی اپنے اعمال) کو خالص کرلو (صرف اللہ کی رضا کے لیے)، تجھے تھوڑا عمل بھی کافی ہو جائے گا۔“ اپنے دین میں اخلاص پیدا کرلو، تو تھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا۔ لہٰذا نیکی کے ہر کام میں رضا الٰہی ہمیشہ پیش نظر ہونی چاہئے، قبولیت کا یہی معیار ہے، اس لئے اللہ نے فرمایا: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ“ اور

اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔" وہ ہر شخص کے عمل سے بھی باخبر ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس عمل کا باعث کیا ہے۔لہٰذا وہ اس کے مطابق مکمل جزا دے گا۔ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں۔ تمہارے دلوں کے حالات اور نیت سے واقف ہے۔وہ تمہارے اخلاص کے درجے کو جانتا ہے، اس سے کوئی چیز اوجھل نہیں لہٰذا ہر کام کرتے وقت اپنی نیت کو درست کرلو۔

انفاق فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) کی قبولیت اور اس کا ثواب پانے کا دارومدار بنیادی طور پر نیت کی پاکیزگی اور شرعی اصولوں کی پابندی پر ہے۔ان آیات کی روشنی میں اس کی اہم ترین شرائط درج ذیل ہیں: 1.اخلاص (اللہ کی رضا): خرچ کرنے کا مقصد صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہو۔اس میں دکھاوا،نمود ونمائش یا شہرت کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ ان آیات میں واضح ہے کہ ریاکاری سے خرچ کیا گیا مال ضائع ہو جاتا ہے۔2.حلال کمائی: اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک (حلال) مال ہی قبول فرماتا ہے۔سود، رشوت، یا کسی بھی ناجائز ذریعے سے کمایا گیا مال راہِ خدا میں خرچ کرنے کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔3.احسان نہ جتانا اور تکلیف نہ دینا: مال خرچ کرنے کے بعد مستحق پر احسان نہیں جتانا چاہیے اور نہ ہی اسے کوئی تکلیف دینی چاہیے۔مذکورہ آیات کے مطابق احسان جتلانے اور دکھ دینے سے صدقے کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔4.حق داروں (مستحقین) کا انتخاب: انفاق صحیح حق داروں تک پہنچنا چاہیے۔قریبی رشتہ دار، غریب، مسکین، اور یتیم اس کے اولین حقدار ہیں۔غیر مستحق لوگوں کو جان بوجھ کر دینا صدقے کے ضیاع کا سبب بن سکتا ہے۔5.بہترین مال خرچ کرنا: انسان کو اپنی ناپسندیدہ یا ردی چیزوں کے بجائے اپنی پسندیدہ، حلال اور معیاری کمائی میں سے اللہ کی راہ میں دینا چاہیے۔خلاصہ یہ کہ اپنے ہر کام میں صرف اللہ کی خوشنودی تلاش کریں، تو تھوڑی سی نیکی بھی آخرت میں کامیابی کا باعث بن سکتی ہے۔

نام ونمود اور ریا کاری کی مذمت/ ریا کاری ایک معاشرتی برائی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۙ
لَہٗ فِیْھَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَہُ الْکِبَرُ وَلَہٗ ذُرِّیَّۃٌ ضُعَفَآءُ ۚۖ فَاَصَابَھَآ
اِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ
تَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

اخلاص کے ثمرات اور ریا کاری کے نقصانات

اَیَوَدُّ	کیا پسند کرتا ہے	اَحَدُکُمْ	تم میں سے کوئی	اَنْ تَکُوْنَ	یہ کہ ہو		
لَہٗ	اس کا	جَنَّۃٌ	ایک باغ	مِّنْ نَّخِیْلٍ	کھجوروں کا		
وَّاَعْنَابٍ	اور انگوروں کا	تَجْرِیْ	بہتی ہوں				
مِنْ تَحْتِھَا	اس کے نیچے	الْاَنْھٰرُ	نہریں	لَہٗ	اس (شخص) کے لیے		
فِیْھَا	اس (باغ) میں	مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ	ہر قسم کے پھل ہوں				
وَاَصَابَہُ	اور آپہنچا ہو اُسے	الْکِبَرُ	بڑھاپا	وَلَہٗ	اور اس کے واسطے		
ذُرِّیَّۃٌ	اولاد ہو	ضُعَفَآءُ	بہت کمزور				
فَاَصَابَھَآ	پھر (ناگہاں) آپڑے اُس (باغ) پر	اِعْصَارٌ	ایک ایسا بگولا				

فِيْهِ	اس میں	نَارٌ	آگ ہو	فَاحْتَرَقَتْ	تو جل جائے وہ (باغ)
كَذٰلِكَ	اسی طرح	يُبَيِّنُ	واضح کرتا ہے	اللّٰهُ	اللہ
لَكُمُ	تمہارے لیے	الْاٰيٰتِ	نشانیاں	لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم
تَتَفَكَّرُوْنَ	غوروفکر کرو۔(266)				

اسی ریاکاری کے نقصانات کو واضح کرنے اور اس سے بچنے کے لیے مزید مثال دی جارہی ہے ارشاد ہوتا ہے اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کیا تم میں سے کوئی شخص یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔جس کے سامنے نہریں بہتی ہوں، یہ مثال اس شخص کی ہے جو صدقہ وغیرہ نیکی کا کام اللہ کی رضا کے لئے کرتا ہے، پھر کوئی ایسا کام کردیتا ہے جس سے وہ نیکی تباہ ہوجائے۔اس کی مثال ایک باغ کے مالک کی سی ہے جس کے باغ میں ہر قسم کے پھل ہیں۔ان میں سے کھجور اور انگور کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے کیونکہ یہ دوسروں سے افضل ہیں اور ان کے فوائد بھی زیادہ ہیں۔ان کا استعمال خوراک کے طور پر بھی ہوتا ہے اور میوہ کے طور پر (لطف اندوزی کے لئے) بھی ہے۔ اس باغ میں نہریں بھی چل رہی ہیں، جن کی وجہ سے آب پاشی میں کوئی مشقت نہیں ہوتی۔لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ اس کے لیے اس میں ہر قسم کے کچھ نہ کچھ پھل ہوں اور اسے بڑھاپا آپہنچے اور اس کے کمزور بچے ہوں، عربی میں ثمرات کا لفظ صرف میوہ جات کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ غلہ جات بھی اس میں شامل ہیں۔یعنی یہ باغ فرحت انگیز و دلکشا بھی ہو اور نافع اور عمدہ بھی، آدمی اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھتا ہو جو انسان کی حاجت کا وقت ہوتا ہے اور آدمی کمانے کے قابل نہیں رہتا اور اُس بڑھاپے میں اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں جو کمانے کے قابل نہ ہوں اور وہ پرورش کے محتاج ہوں فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ (اعصار) اس تیز ہوا کو کہتے ہیں جو گول گھومتی ہے اور اوپر کو بلند ہوتی ہے۔ اس بگولے میں آگ تھی جس سے باغ جل گیا۔اس حادثے سے جو رنج وغم حاصل ہوگا اس کا اندازہ

لگانا مشکل نہیں۔ اگر غم سے مرا جاسکتا تو یہ آدمی ضرور مرجاتا۔ یعنی اس کا ایک ہی ذریعہ معاش تھا، یہ باغ ہی اس کی کل پونجی تھی جس پر اس کا اور اس کی اولاد کا انحصار تھا۔ جب یہ ہی جل کر خاکستر ہوگیا تو وہ کس طرح ہر چیز سے محروم ہوگیا۔ فرمایا احسان جتلانے والے ایذاء پہنچانے والے یار یاکاری کے لیے خرچ کرنے والے کی حالت بھی قیامت کے دن ایسی ہوگی ریاکاری (دکھاوے اور نام و نمود) کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے تمام نیک اعمال ضائع ہوجاتے ہیں اور انسان اللہ کی رضا اور آخرت کے ثواب سے محروم ہوجاتا ہے۔ اسلام میں اسے "شرکِ اصغر" قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں اللہ کی بجائے لوگوں کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے۔ جس طرح وہ باغ اپنے مالک کا کبرسنی کا سہارا تھا۔ اسی طرح یہ شخص اپنے خرچ کردہ مال کے اجر و ثواب کی امید لگائے بیٹھا تھا، مگر جب قیامت کا دن ہوگا، تو ایسا شخص اسی طرح ثواب سے محروم ہوجائے گا۔ جس طرح باغ کا مالک باغ کے جل جانے کے بعد اس کے ثمرات سے محروم ہوگیا، قیامت کے دن ایسا شخص ایک محتاج اور بالکل قلاش کے طور پر پریشان پھرے گا، مگر اس کو فائدہ پہنچانے والی کوئی چیز اس کے پاس نہ ہوگی۔

اعمال کی بربادی

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کی ایک دوسری تفسیر آئی ہے، جس کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مثال اس شخص کی ہے جو عمر بھر نیک عمل کرتا رہتا ہے، لیکن آخر عمر میں اس کی سیرت بدل جاتی ہے اور نیک عمل کے بجائے برے عمل کرنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی پہلی نیکیاں بھی برباد کرلیتا ہے اور قیامت کے دن، جو بہت تنگی کا وقت ہوگا، وہ نیکی اس کے کچھ کام نہ آئے گی اور اس نازک وقت میں اس کا عمل اس سے خیانت کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "بندہ لوگوں کی نگاہ میں جنتیوں کے سے عمل کرتا ہے، حالانکہ وہ دوزخی ہوتا ہے اور بعض دفعہ بندہ لوگوں کی نگاہ میں دوزخیوں کے سے عمل کرتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے اور اعمال کا دارومدار تو آخری وقت کے اعمال پر ہے۔" (بخاری) انسان کی

عبادت اور اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، اگر نیت خالص ہے تو اعمال اللہ کے ہاں قبول ہوتے ہیں، اگر نیت میں کھوٹ ہے یار یا کاری یا نام ونمود مقصود ہے تو ایسے اعمال بجائے قبولیت کے انسان کے لیے موجب وبال بنیں گے۔

ریا کاری مذموم وصف

علماء کرام نے لکھا ہے کہ اعمال کی قبولیت کی دو شرائط ہیں: پہلی شرط یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ کے لیے ہو، دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عمل سنت کے مطابق ہو۔ان دو شرائط میں سے کوئی بھی ایک شرط نہ پائی گئی تو وہ عمل قبول نہیں ہوگا، اور ریا کاری ایسا مذموم وصف ہے کہ اس کی وجہ سے مسلمان کا بڑے سے بڑا نیک عمل اللہ کے ہاں رائی کے دانے کی حیثیت نہیں رکھتا، اور ریا کاری کے بغیر کیا ہوا چھوٹا عمل بھی اللہ کے ہاں پہاڑ کے برابر حیثیت رکھتا ہے۔فرمایا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام یا نشانیاں تمہارے پاس کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ تاکہ تم غور وفکر کرسکو۔اچھی اور بری چیز میں امتیاز کرسکو لہٰذا آج صراط مستقیم پر گامزن ہوجاؤ تاکہ کل قیامت کو پریشانی سے بچ جاؤ۔

صدقہ وخیرات کے مقبول ہونے کی چھ شرائط

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر دوبارہ نظر ڈالئے تو ان سے انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ وخیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی چھ شرائط معلوم ہوں گی۔اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے، دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا، تیسرے صحیح مصرف میں خرچ کرنا، چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلانا، پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے ان لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے، چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے ہو نام ونمود کے لئے نہ ہو۔دوسری شرط یعنی طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت اس کا لحاظ رہے کہ کسی حقدار کی حق تلفی نہ ہو اپنے عیال کے ضروری اخراجات بغیر ان کی رضامندی کے بند یا کم کر کے صدقہ وخیرات کرنا

کوئی امرِ ثواب نہیں، حاجتمند وارثوں کو محروم کر کے سارے مال کو صدقہ وخیرات یا وقف کر دینا تعلیم سنت کے خلاف ہے پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ہزاروں صورتیں ہیں۔طریق سنت یہ ہے کہ مصرف کی اہمیت اور ضرورت کی شدت کا لحاظ کر کے مصرف کا انتخاب کیا جائے عام طور پر خرچ کرنے والے اس کی رعایت نہیں کرتے۔تیسری شرط کا حاصل یہ ہے کہ ثواب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ اپنے خیال میں کسی کام کو نیک سمجھ کر نیک نیتی سے اس میں صرف کر دے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مصرف شریعت کی رو سے جائز اور مستحسن بھی ہو کوئی شخص ناجائز کھیل تماشوں کے لئے اپنی جائیداد وقف کر دے تو وہ بجائے ثواب کے عذاب کا مستحق ہو گا یہی حال تمام ان کاموں کا ہے جو شریعت کی رو سے مستحسن نہیں ہیں۔اسلام میں صدقہ وخیرات اور نیکی کے کاموں میں اخلاص (صرف اللہ کی رضا) شرطِ قبولیت ہے۔جب کوئی شخص نمود ونمائش، شہرت یا لوگوں سے تعریف سننے کے لیے خرچ کرتا ہے، تو اسے "ریاکاری" (دکھاوا) کہا جاتا ہے۔قرآن و حدیث کی روشنی میں ریاکاری سے خرچ کرنے والوں کے دینی اور دنیوی نقصانات درج ذیل ہیں: 1. دینی واخروی نقصانات نیکی کا ضائع ہونا: ریاکاری سے کیا گیا صدقہ وخیرات اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا اور اس کا تمام اجر ضائع ہو جاتا ہے۔ثواب سے محرومی: دکھاوے کے لیے خرچ کرنے والے کو آخرت میں کوئی ثواب نہیں ملے گا، صرف لوگوں کی تعریف ہی اس کا حاصل ہو گی۔

شرکِ اصغر (چھوٹا شرک)

ریاکاری کو نبی کریم ﷺ نے "شرکِ خفی" (چھپا ہوا شرک) قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں اللہ کے ساتھ مخلوق کو بھی نیت میں شریک کر لیا جاتا ہے۔اعمال کی بربادی: ریاکار کے نیک اعمال (صدقہ وغیرہ) بجائے ثواب کے اس کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں اور اسے جہنم میں لے جا سکتے ہیں۔احسان جتانا اور تکلیف دینا: ریاکار اکثر دکھاوے کے بعد احسان جتلاتا ہے یا حاجت مند کو تکلیف دیتا ہے، جس سے نیکی مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔جہنم کی وادی: ایک حدیث کے مطابق، دکھاوے کے لیے نیکی کرنے والوں کے لیے جہنم میں "جب الحزن" (غم کی وادی) نامی جگہ

ہے۔ 2. دنیوی نقصانات تعریف کی طلب میں ناکامی: ریاکار کا اصل مقصد لوگوں سے شہرت اور تعریف پانا ہوتا ہے، لیکن اکثر اوقات لوگ اس کی حقیقت جان لیتے ہیں اور وہ دنیا میں بھی عزت کے بجائے ذلت پاتا ہے۔ مال کا ضیاع: چونکہ دکھاوے کا صدقہ قبول نہیں ہوتا، اس لیے وہ مال جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا گیا تھا، دنیاوی اور اخروی لحاظ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ دل کا سکون نہ ملنا: سچی نیکی سے دلی سکون ملتا ہے، جبکہ ریاکاری سے انسان ہمیشہ لوگوں کی توجہ کا محتاج رہتا ہے، جس سے ذہنی تناؤ اور پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ شرک میں مبتلا ہونا: ریاکار اپنے عمل سے غیر اللہ (لوگوں) کو خدا بنا لیتا ہے، یعنی وہ لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا سمجھتا ہے، جو ایک دنیوی گمراہی ہے۔ خلاصہ: ریاکاری ایک مہلک بیماری ہے جو نیکیوں کو ایسے کھا جاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو۔ سچا صدقہ وہی ہے جو چھپا کر اور صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔

اسی طرح ایک اور حدیث مبارکہ جو کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تین بندے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ ان میں سے پہلا شخص ایسا ہوگا جو کہ شہید ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں دی جانے والی نعمتیں گنوائے گا۔ شہید نعمتوں کا اقرار کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا تو نے ان سب نعمتوں کے مقابل دنیا میں میرے لیے کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے تیری راہ میں اپنی جان قربان کر دی۔ رب فرمائے گا تو جھوٹا ہے، تو نے جان اس لیے قربان کی کہ لوگ تجھے بہادر اور شہید کہیں، تو شہید کہلا چکا۔ فرشتوں! لے جاؤ اس کو اور ڈال دو جہنم میں۔ فرشتے اس کو گھسیٹتے ہوئے لے جائیں گے اور اسے جہنم میں ڈال دیں گے۔ پھر ایک دوسرا شخص رب کی بارگاہ میں حاضر ہوگا جو عالم و قاری ہوگا۔ رب تعالیٰ اس کو بھی دنیا میں دی گئی نعمتیں گنوائے گا۔ وہ ان نعمتوں کا اقرار کرے گا۔ پھر رب تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے مقابل دنیا میں میرے لیے کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے علم سیکھا اور سکھایا، قرآن پاک پڑھا اور پڑھایا۔ رب تعالیٰ فرمائے گا تو نے علم سیکھا اور سکھایا کہ عالم کہلایا جائے، قرآن پاک اس لیے پڑھا اور پڑھایا کہ قاری کہلایا جائے، تو دنیا میں تو کہلا چکا۔ فرشتو! لے جاؤ اس کو اور ڈال دو جہنم میں۔ فرشتے اس کو گھسیٹتے ہوئے

لے جائیں گے اور اسے جہنم میں ڈال دیں گے۔پھر آخر میں ایک سخی، رب کی بارگاہ میں حاضر ہوگا۔اللہ تعالیٰ اس کو بھی دنیا میں دی جانے والی نعمتیں یاد دلوائے گا۔وہ نعمتوں کا اقرار کرے گا۔پھر رب فرمائے گا کہ تو نے ان نعمتوں کے مقابل دنیا میں میرے لیے کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا اے رب! میں نے اپنی ساری دولت تیری مخلوق پر لٹا دی۔رب تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے،تو نے دولت اس لیے خرچ کی کہ لوگ تجھ کو سخی کہیں۔تو دنیا میں سخی کہلا چکا۔فرشتوں لے جاؤ اس سخی کو اور ڈال دو جہنم میں۔فرشتے اُسے گھسیٹتے ہوئے لے جائیں گے اور جہنم میں ڈال دیں گے۔(مسلم ونسائی)

شیطان انسان کا کھلا دشمن

یاد رکھیے شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔وہ پہلے تو کسی کو بھی کوئی نیک اعمال کرنے نہیں دیتا، لیکن پھر بھی اگر کوئی نیک اعمال کرتا ہے تو شیطان اس پر مختلف قسم کے حملے کرتا ہے۔کسی کی نیت میں غرور و تکبر اور کسی کی نیت میں ریاکاری اور دکھاوا شامل کر دیتا ہے اور ان کی نیکیاں ضائع کروا دیتا ہے۔اسی لیے بروز قیامت نیکیوں کی گنتی کے بجائے ان کا میزان پر وزن کیا جائے گا تاکہ اخلاص کا پتا چل سکے۔اللہ کی رضا کے لیے ایک روپیہ دینے والے کا وزن پہاڑ سے زیادہ ہو جائے گا اور پہاڑ جتنے وزن کے مال و دولت کا وزن ریاکاری کی وجہ سے ایک روپے سے بھی گھٹ جائے گا۔رب تعالیٰ ہر مسلمان کو رب کی رضا کے لیے نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ریاکاری، جو کہ آج ایک معاشرتی برائی بن گئی ہے،اس سے معاشرے کو پاک فرمائے۔اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اخلاص کے ساتھ نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا کرے۔اللہ تعالیٰ یہ آیات اس لئے بیان فرماتا ہے تاکہ اے لوگو! تم غور و فکر کرو اور سمجھو کہ دنیا فانی ہے اور آخرت ضرور آنی ہے تو اُس آخرت کیلئے عمل کرو اور اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرو۔ اَللّٰهُ اَكْبَر کس قدر دل دہلا دینے والی مثال ہے۔اے کاش کہ ہم سمجھ جائیں اور اپنے تمام اعمال، نماز، ذکر و درود، تلاوت، حج و عمرہ، زکوٰۃ و صدقات وغیرہ کو ریاکاری کی تباہ کاری سے بچالیں اور اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا شروع کر دیں۔

کمائی کی مختلف صورتیں/ راہِ خُدا میں پاکیزہ مال خرچ کرو/ زرعی پیداوار کا حکم/ خبیث مال قابل قبول نہیں

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ
الْاَرْضِ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا
فِیْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُكُمْ
بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۸﴾ۖۛ

مشتبہ مال کی خیرات درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی

یٰۤاَیُّهَا	اے	الَّذِیْنَ	وہ لوگوں جو	اٰمَنُوْۤا	ایمان لائے ہو!

اَنْفِقُوْا	تم خرچ کرو	مِنْ طَیِّبٰتِ	اُن پاکیزہ چیزوں میں سے

مَا	جو	كَسَبْتُمْ	تم کماؤ	وَمِمَّاۤ	اور اُن میں سے (بھی) جو

اَخْرَجْنَا	ہم نے نکالیں	لَكُمْ	تمہارے لیے

مِّنَ الْاَرْضِ	زمین سے	وَلَا	اور نہ	تَیَمَّمُوا	تم ارادہ کرو

الْخَبِیْثَ	خراب چیز کا	مِنْهُ	اس میں سے

تُنْفِقُوْنَ	(کہ) تم خرچ کرو	وَلَسْتُمْ	اور نہیں ہو تم

بِاٰخِذِیْهِ	لینے والے اس چیز کو	اِلَّآ	مگر	اَنْ	یہ کہ

تُغْمِضُوْا	تم چشم پوشی کرو	فِيْهِ	اس میں

وَاعْلَمُوْٓا	اور تم جان لو	اَنَّ	کہ بلاشبہ	اللّٰهَ	اللہ

غَنِيٌّ	بڑا بے نیاز	حَمِيْدٌ	نہایت قابل تعریف ہے۔(267)

ارشاد ہوتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ اے ایمان والو! خرچ کرو پاک اور ستھری چیزیں جو تم نے کمائی ہیں۔گویا قبولیت صدقہ کے لیے یہ بھی ایک شرط ہے کہ صاف ستھری اور بہتر چیز اللہ کے راستہ میں دی جائے۔مفسرین کرام نے طیبات کی تفصیل میں دو چیزیں بیان کی ہیں۔پہلی چیز یہ ہے کہ جو مال فی سبیل اللہ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ حلال ہو، جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔حرام مال سے ادا کردہ صدقہ قابل قبول نہیں۔مثال کے طور پر اگر کوئی شخص چوری، ڈاکہ یا رشوت کا مال صدقہ کرتا ہے تو وہ بارگاہ ایزدی میں کیسے قبول ہوگا، بلکہ ایسا کرنے سے انسان الٹا گناہ گار ہوگا۔مسند احمد کی روایت میں ہے کہ جو شخص حرام کمائی کی خوراک کھائے گا یا لباس پہنے گا، نہ اس کی عبادت قبول ہوگی اور نہ اس کا صدقہ خیرات قبول ہوگا، اور اگر ایسا شخص مر گیا اور اپنے پیچھے مال چھوڑ گیا تو وہی مال اس کے لیے جہنم کا زادِ راہ ہوگا۔بعض چیزیں تو شرعاً قطعی حرام ہیں اور بعض مشتبہ ہوتی ہیں۔مشتبہ مال کی خیرات بھی درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی، کیونکہ واضح حکم موجود ہے كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا یعنی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ، حرام سے پرہیز کرو۔طیب کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جو چیز بھی صدقہ میں دی جا رہی ہے۔ وہ اعلیٰ اور بہتر ہو نہ کہ نکمی اور ردی چیز، ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ اچھی چیز اپنے لیے رکھ لی جائے اور کمتر چیز زکوٰۃ وصدقات میں دی جائے، یہ بھی مناسب نہیں۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو کھجور کے اچھے گچھے اپنے واسطے محفوظ کر لیتے ہیں اور کمتر گچھے اصحاب صفہؓ کے لیے لٹکا دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ایسی تقسیم نے منع فرمایا ہے۔جب تم خود ردی چیز کو پسند نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ

اسے کیسے پسند کریگا، لہٰذا زکوٰۃ وصدقات میں بہتر چیز دینی چاہئے۔

کمائی کی مختلف صورتیں

فرمایا، اے اہل ایمان! ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو مَا كَسَبْتُمْ جو تم نے کمائی ہیں۔ اب کمائی کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ منجملہ ان کے کمائی کا اولین ذریعہ انسان کی ذاتی محنت ومشقت ہے۔ کوئی تجارت کرتا ہے، دکاندار ہے، ملازم ہے۔ کارخانہ دار ہے یا مزدور ہے۔ یہ سب ذاتی آمدن کے ذرائع ہیں آمدن کے بعض دوسرے ذرائع اضطراری ہوتے ہیں۔ جن میں انسان کی ذاتی مشقت کا دخل نہیں ہوتا، مثلاً کہیں سے ہدیہ مل گیا، وصیت کے ذریعے کوئی چیز حاصل ہوگی یا اسے وراثت سے حصہ مل گیا۔ ان ذرائع سے حاصل شدہ مال بھی انسان کی ملکیت ہوتا ہے تو پاکیزہ چیزیں خرچ کرنے کا قانون ان تمام ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی پر ہوگا، لہٰذا حکم ہوا ہے کہ تم جس حلال مال سے بھی خرچ کرنا چاہو، اچھی اور بہتر چیز دو۔ براہ راست خود محنت کر کے کمانے کے علاوہ ایک ذریعہ آمدنی زرعی پیداوار بھی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں سے بھی خرچ کرو۔

زرعی پیداوار میں عشر کی ادائیگی فرض

وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا زرعی پیداوار میں ہر قسم کا غلہ مثلاً گندم، جو، چاول، مکئی، باجرہ اور دالیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا پھل اور سبزیاں بھی زرعی پیداوار ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کتنا خرچ کیا جائے۔ تو سب سے پہلے جو کچھ فرض ہے، وہ ادا ہونا چاہئے، جس طرح تجارت وغیرہ کے مال میں کل مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس طرح زرعی پیداوار سے عشر یعنی دسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا فرض ہے۔ البتہ اس مد کے دو حصے ہیں۔ بارانی زمین یعنی جو زمین مالک کی مشقت کے بغیر سیراب ہوتی ہے۔ اس میں سے دسواں حصہ اور جو نہری یا چاہی زمین ہے۔ یعنی ایسی زرعی زمین جس کی آبپاشی (فصل کو پانی دینا) کنویں (چاہ)، ٹیوب ویل (نل چاہی) یا تالاب کے پانی سے کی جائے، اسے "چاہی زمین"

کہتے ہیں۔ پس منظر: یہ لفظ فارسی کے لفظ" چاہ" (یعنی کنواں) سے نکلا ہے۔ بارانی کی ضد: یہ" بارانی" (صرف بارش پر منحصر) زمین کی ضد ہے، کیونکہ چاہی زمین میں پانی کا انتظام مستقل ہوتا ہے۔ جسے مالک خود محنت کر کے پانی بہم پہنچاتا ہے، اس میں سے بیسواں حصہ نکالنا فرض ہے البتہ بعض خود رو چیزوں جیسے گھاس، لکڑیاں اور کانے، ان تین چیزوں پر عشر نہیں ہے۔ یہ معاف ہیں اگر یہ چیزیں خود کاشت کی جائیں۔ چارے کے لیے گھاس وغیرہ خود بوئی جائے، لکڑی کے لیے درخت لگائیں یا کانے کی کاشت کی جائے، تو پھر ان پر عشر ادا کرنا ہوگا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی فتویٰ ہے۔ عشر کی ادائیگی تو فرض ہے۔ یہ تو لازمی ہے اس کے علاوہ اگر کوئی مزید خرچ کرے گا تو وہ نوافل میں شمار ہوگا اور موجب اجر وثواب ہوگا۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حضور ﷺ کی حدیث ہے لَيْسَ فِي الْخَضْرَاوَاتِ صَدَقَةٌ، صدقہ یعنی سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے، یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے حدیث کی وضاحت اور احکام: بنیادی مفہوم: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو سبزیاں ذخیرہ نہیں کی جا سکتیں (جلدی خراب ہو جاتی ہیں)، ان پر کاشتکار کو عشر (پیداوار کا دسواں حصہ) دینا واجب نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی زرعی پیداوار ہے اور زمین ہی سے نکلتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سبزیوں پر عشر بالکل معاف ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سبزیوں کا عشر سرکاری خزانے میں جمع کرانے کی ضرورت نہیں مالک خود اپنی صوابدید کے مطابق مستحقین میں تقسیم کر دے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ سبزیاں جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے سرکاری انتظام میں پہنچتے پہنچتے اور پھر تقسیم ہونے تک اس کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اس لیے سبزی عشر یعنی دسواں یا بیسواں حصہ مالک کو خود تقسیم کر دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر سبزی کے دس گٹھے حاصل ہوئے ہیں۔ تو ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دے، یا اگر زمین چاہی یا نہری ہے۔ تو بیس گٹھوں میں سے ایک ادا کرے۔ علی ہذا القیاس یہی مسلک قرآن وسنت سے موافقت رکھتا ہے۔

زمین کی پیداوار کا ایک اور ذریعہ معدنیات ہیں۔عام زمین میں اور پہاڑوں میں کانیں پائی جاتی ہیں جن سے تانبہ، نمک، کوئلہ، لوہا، سونا، چاندی، تیل وغیرہ نکلتا ہے۔ان تمام چیزوں کی زکوٰۃ خمس یعنی کل آمدنی کا پانچواں حصہ ہے۔چونکہ ان اشیاء کی پیداوار کے لئے عموماً محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ بیج نہ پانی نہ نہلائی وغیرہ اس لیے اس کی کل آمدنی کا پانچواں یعنی بیس فیصد ادا کرنا ضروری ہے۔البتہ ایک مسئلہ فقہائے کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ ان کانوں کا مالک کون ہے امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ کانوں کا مالک وہ شخص ہے جس کی اراضی سے معدنیات برآمد ہو۔لہٰذا خمس بھی وہی ادا کرے گا۔اگر یہ معدنیات کسی عام جنگل، صحرا یا سمندر سے نکلیں تو ان کی مالک حکومت ہوگی۔البتہ امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ کان خواہ کہیں بھی نکلے، اس کی مالک حکومت ہے۔امام مالک صاحب انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔بہرحال فرمایا کہ اگر کمائی تمہاری ذاتی محنت ومشقت کی ہے تو پھر اس میں سے حلال اور طیب چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور جو زمین کی پیداوار ہے اس میں سے بھی اچھی چیز خرچ کرو وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ اور ردی یا کم تر چیز کو خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔خبیث سے مراد ردی یا گھٹیا چیز ہے اور اس کا اطلاق ناپاک چیز پر بھی ہوتا ہے۔اللہ کی راہ میں صاف ستھری چیز دینی چاہئے کیونکہ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ گھٹیا چیز جب تم خود لینے کے لیے تیار نہیں ہو تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایسی چیز کیوں دیتے ہو۔گھٹیا چیز قبول کرنے کی ایک صورت ہے کہ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ تم خود چشم پوشی کرلو، مگر یہ تم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو، لہٰذا اللہ کی راہ میں بھی اچھی سے اچھی خرچ کرو قرآن کریم کی سورہ آل عمران (آیت 92) میں للہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو۔ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے اچھی، صاف ستھری اور بہتر چیز ہی پسندیدہ ہوتی ہے، لہٰذا بہتر چیز ہی فی سبیل اللہ بھی ادا کرو۔پاکیزہ چیز کے سلسلہ میں ترمذی شریف کی حدیث ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا لَا يَقْبَلُ اللهُ صَلَاةً إِلَّا بِطُهُوْرٍ، وَلَا صَدَقَةً مِنْ غُلُوْلٍ" یعنی طہارت کے بغیر اللہ

تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا، یہ حدیث عبادت کے لیے ظاہری طہارت اور مالی معاملات میں حلال وحرام کی اہمیت پر زور دیتی ہے لہٰذا جس مال کی زکوٰۃ ،صدقات، خیرات وغیرہ دی جا رہی ہے۔اس کا حلال اور طیب ہونا بھی ضروری ہے وَ اعۡلَمُوۡۤا اچھے سے جان لو اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ کہ اللہ تعالیٰ بے پروا، اور بے نیاز ہے، اس کو تمہارے صدقات وخیرات کی کوئی ضرورت نہیں یہ تو تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے تاکہ تم اس سے آخرت میں مستفید ہوسکو، یہ دنیا میں قوم کے غرباء ومساکین کی اعانت کا ایک ذریعہ ہے نیز تمہارے اپنے اخلاق بھی اس کی وجہ سے عالی ہوں گے۔اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہوں گے، اللہ تعالیٰ حمید یعنی تمام خوبیوں کا مالک خود ہے تم اچھا کام کرو یا برا کرو، وہ بے نیاز ہے۔تمہارے اچھے اعمال نہ اس کی خدائی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔تمہارے برے اعمال اسکی خدائی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی راہ میں خرچ کرو، اور اس کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے تمہیں انعام سے نوازا ہے۔

شیطانی وسوسوں (ڈر اور بخل) کو رد کرنے کی ترغیب

اَلشَّيۡطٰنُ	شیطان	يَعِدُكُمُ	تمہیں ڈراتا ہے	الۡفَقۡرَ	تنگدستی سے
وَيَاۡمُرُكُمۡ	اور وہ تمہیں حکم دیتا ہے	بِالۡفَحۡشَآءِ	بے حیائی کا		
وَاللّٰهُ	اور اللہ	يَعِدُكُمۡ	تم سے وعدہ کرتا ہے		
مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ	اپنی بخشش کا	وَفَضۡلًا	اور فضل کا		
وَاللّٰهُ	اور اللہ	وَاسِعٌ	نہایت وسعت والا		
عَلِيۡمٌ	خوب جاننے والا ہے۔(268)				

فرمایا اَلشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے۔مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شیطان انسان پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے کہ اگر مال تھوڑا ہے تو وہ بہکاتا ہے کہ اگر یہ مال صدقات میں دے دیا تو پھر تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔تم مفلس ہو کر دوسروں کے محتاج ہو جاؤ

گے۔جب اس قسم کا خیال آئے تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔اگر مال قلیل بھی ہے تو اس میں سے کچھ نہ کچھ دے دو، اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت دیگا۔سورہ سبا (آیت 39) کا حصہ ہے "وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ اگر خرچ کروگے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ کسی دوسرے ذریعے مال دے دیگا، لہٰذا بخل نہیں کرنا چاہئے، بلکہ فراخدلی کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو وافر مال دیا ہے۔تو پھر شیطان دوسرے طریقے سے حملہ کرتا ہے وَ يَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وہ تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ مالدار آدمی کو فحاشی کے کاموں کی طرف لگا دیتا ہے کہ فکر نہ کرو تمہارے پاس بہت مال ہے۔خوب عیش وعشرت کی زندگی بس کرو۔دنیا میں بار بار نہیں آنا لہٰذا کھاؤ پیو، عیش کرو یا پھر اس کا مال کھیل تماشے اور فضول رسم ورواج میں خرچ کراتا ہے۔کہیں دھوم دھام سے شادی ہو رہی ہے۔سالگرہ منائی جارہی ہے۔اور لاکھوں روپیہ ان فضول رسم ورواج پر ضائع کیا جارہا ہے یہ سب شیطان کے بہکاوے ہیں۔فرمایا اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ تمہیں ابدی نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے۔وَ اللهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلاً اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے، اگر اس کے حکم کے مطابق اس کے راستے میں خرچ کروگے۔تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرمادے گا۔دنیا میں بھی برکت عطا کرے گا اور آخرت میں اپنے فضل سے جنت میں داخل کردے گا یہ اس کا وعدہ ہے، لہٰذا شیطان کے بہکاوے میں نہ آنا اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین کرکے اس کے احکام کی بجا آوری کرو اور دائمی فلاح پا جاؤ وَ اللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑا ہی وسعت والا ہے۔اس کے خزانے بہت وسیع ہیں وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں لوٹاتا بلکہ انہیں دگنا چوگنا عطا کرتا ہے۔وہ ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے۔وہ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ بھی ہے۔تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔جس قدر اخلاص تمہارے دلوں میں موجود ہوگا اللہ تعالیٰ اس کے مطابق بڑھا چڑھا کر تمہیں عطا کریں گے۔

حاصل کلام: یہ آیت انسان کو اللہ کی رحمت پر کامل بھروسہ رکھنے اور شیطانی وسوسوں (ڈر اور بخل) کو رد کرنے کی ترغیب دیتی ہے

اسلامی تناظر میں حکمت کی مختلف جہتیں/منت/ نذر ماننے کے مسائل واحکام

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ
اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

حکمت کی تفصیل اوراس کا مفہوم

يُّؤْتِي	وہ (اللہ) عطا کرتا ہے	الْحِكْمَةَ	حکمت، دانائی	مَنْ	جسے
يَّشَآءُ	وہ چاہتا ہے	وَمَنْ	اور جسے	يُّؤْتَ	دی گئی
الْحِكْمَةَ	حکمت	فَقَدْ اُوْتِيَ	تحقیق دی گئی	خَيْرًا	بھلائی
كَثِيْرًا	بہت	وَمَا	اور نہیں	يَذَّكَّرُ	نصیحت حاصل کرتے
اِلَّآ	سوائے	اُولُوا الْاَلْبَابِ	عقل والے۔(269)		

ارشاد ربانی ہے۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ اللہ تعالیٰ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے، حکمت کا مادہ احکام سے نکلا ہے، جو پختگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا حکمت سے مراد وہ چیز ہے جو پختہ

ہواور پھر صدقہ کے ساتھ اس کے مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں۔حکمت کا عام معنی فہم اور سمجھ کیا جاتا ہے،حکمت کی کئی تعریفیں کی جاسکتی ہیں اور وہ اپنے اپنے مقام پر سب ہی درست ہیں۔مثلاً ارشاد نبوی ہے رَاسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللهِ یعنی سب سے بڑی حکمت تو اللہ کا خوف (تقویٰ) ہے کیونکہ تقویٰ ہی وہ چیز ہے جو انسان کو بچتے بچاتے سیدھی راہ پر گامزن رکھنے والی ہے۔یہاں "الْحِكْمَةَ" سے مراد دین کا صحیح فہم اور علم وفقہ میں صحیح بصیرت ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"رشک دو خوبیوں کے سوا کسی پر جائز نہیں،ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا،پھر اسے (راہ) حق میں خرچ کرنے کی مکمل قدرت (توفیق) دی اور ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمائی،تو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔"(بخاری)

حکمت عقل وفہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے۔فہم کا تعلق دل و دماغ کے ساتھ ہے، دماغ میں عقل ہے اور قلب جب اللہ پاک کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے اوپر وہ علوم آتے ہیں۔جیسے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد حضرت وکیع رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کی: مجھے حافظہ کی کمزوری کی شکایت ہے۔حضرت نے فرمایا: گناہ چھوڑ دو کیونکہ علم نور ہے اور یہ کسی عاصی (گناہ گار) کے دل میں نہیں اترتا۔قرآن پاک میں ہے﴿وَلَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا﴾ (الاعراف:179) یعنی ان کے دل ہیں لیکن ان سے وہ سمجھتے نہیں ہیں۔تو سمجھنے کا تعلق فہم کے ساتھ ہے۔دل اور دماغ دونوں سے جو حقیقت واضح ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے انسان صحیح و غلط کا فیصلہ کرسکتا ہے،حق و باطل کا فیصلہ کرتا ہے،خیر وشر کے درمیان تمیز کرسکتا ہے،یہی چیز حکمت ہے۔ اور غور وفکر،دلیل و برہان،تجربہ واستقرا اسی طرح اور چیزیں جو منکشف ہوتی ہیں ان سے یہ حاصل ہوتی ہے۔غور وفکر کا تعلق عقل کے ساتھ ہے،تجربے کا تعلق عقل کے ساتھ ہے۔لیکن یہ جو منکشف ہو جانا ہے یہ دل پر منکشف ہوتا ہے۔تو اللہ جل شانہ چھپی ہوئی بات،حکمت اور دانائی کی بات جو کسی پہ کھولتے ہیں تو اس کا طریقہ کار یہی ہے۔سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے،جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:"جس نے چالیس دن (یا چالیس صبحیں) اللہ کے لیے

خالص کرلیں، اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں" ۔اس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی شخص 40 دن تک اللہ تعالیٰ کی یاد (ذکر و فکر) میں مشغول رہے، اپنے اعمال کو خالص رکھے اور لغو (فضول) باتوں اور گناہوں سے بچ کر زبان کی خاموشی اختیار کرے، تو اللہ پاک اس کے باطن کو روشن فرما دیتے ہیں اور اس کی گفتگو میں ایسی حکمت اور بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جو لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی ہے ۔یعنی وہ چیز جو انسان کے لئے مفید ہے لیکن اس سے چھپی ہوئی ہے تو اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے کچھ ظاہری ذرائع ہیں اور کچھ باطنی ذرائع ہیں ۔ ظاہری ذرائع میں غور و فکر آتا ہے اور کتابوں کا دیکھنا آتا ہے اور تجربہ ہے ۔لیکن اس کے اندر جو مزید اللہ پاک کی طرف سے دین ہوتی ہے اور جن پر انکشاف ہو جاتا ہے وہ کافی زیادہ بھی ہوتا ہے اور اچانک بھی ہوتا ہے، اس کے بارے میں پہلے سے کوئی بنیاد نہیں بنی ہوتی اگرچہ وہ غور و فکر کر رہا ہوتا ہے جو اس کے لئے بنیاد ہے لیکن یہ جو بات کھلتی ہے انسان کے اوپر تو وہ حیران ہو جاتا ہے کہ یہ کیسے ہوا؟ یہ حکمت کی بات ہوتی ہے جو منجانب اللہ ہوتی ہے ۔جن کی اللہ تعالیٰ نے قبولیت لکھی ہوتی ہے تو ان کے اوپر اللہ پاک ایسے عقدے کھولتے ہیں جو عام لوگ نہیں کھول سکتے ۔

اس آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس کے پاس حکمت کی دولت ہوگی وہ کبھی شیطانی راہ اختیار نہیں کرے گا اور شیطانی راہ یہ ہے کہ انسان اپنی دولت سنبھال کر رکھے ۔اس میں سے کچھ خرچ نہ کرے بلکہ مزید دولت بڑھانے کی فکر میں لگا رہے ۔اس طرح شاید وہ دنیا میں تو خوشحال رہ سکے مگر آخرت بالکل برباد ہوگی ۔لہٰذا اصل دانشمندی یہ ہے کہ انسان جہاں تک ممکن ہو خرچ کرے ۔ اس دنیا میں اللہ اسے اس کا نعم البدل عطا فرمائے گا اور آخرت میں بھی بہت بڑا اجر و ثواب عطا فرمائے گا اور یہی سب سے بڑی دولت اور حکمت ہے ۔

علم نافع کے متعلق نبی کریم ﷺ کی دعا

ایک دن حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ کے دوران فرمایا کہ: آپ نے فرمایا: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اسے

دین کی سمجھ عطا کر دیتے ہیں۔(بخاری) بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں یعنی حکمت ایسے علم کو کہا جاتا ہے۔جو مفید ہو اور انسان کو عمل تک پہنچائے۔علم نافع کے متعلق نبی کریم ﷺ ان الفاظ میں بھی دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَعَلِّمْنِیْ مَا یَنْفَعُنِیْ وَزِدْنِیْ عِلْمًا، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ وَّأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ حَالِ أَھْلِ النَّارِ اے اللہ! جو کچھ علم تو نے مجھے عطا فرمایا ہے اس کو میرے لیے نفع مند بنا دے (یعنی مجھے اس پر عمل کرنے کی توفیق دے) اور مجھے وہ علم عطا فرما جو میرے لیے نافع ہو اور میرے علم میں اضافہ فرما۔اللہ کے لیے حمد و ستائش ہے ہر حال میں اور میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں دوزخیوں کے حال سے۔(سنن الترمذي، 5 / 587، مصر)

دین کی سمجھ آجانا حکمت اور سب سے بڑی دولت ہے

امام مالک رحمہ اللہ حکمت کا معنی سنت کرتے ہیں۔حکیم خدا تعالیٰ کی صفت بھی ہے اور قرآن کریم کو بھی حکمت کہا گیا ہے اور حضور ﷺ کی سنت مبارکہ کو بھی حکمت کا نام دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ باقی سمجھ یا دانائی کی باتیں بھی حکمت میں شمار ہوتی ہیں۔فرمایا اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ہر آدمی حکمت حاصل نہیں کر سکتا، البتہ جس شخص میں جس قدر حکمت کے حصول کی استعداد ہوتی ہے۔اسکے مطابق وہ اپنا حصہ وصول کر لیتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ جسے حکمت عطا کر دی گئی، اسے خیر کثیر سے نوازا گیا۔گویا حکمت یعنی فہم قرآن یا فہم دین تمام خوبیوں کا منبع ہے اور فہم علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور علم کی روشنی دینی مدارس پھیلا رہے ہیں۔آخر میں فرمایا کہ یہ بات ہر ایک کے سمجھنے کی نہیں ہے، وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔اُولُوا الْاَلْبَابِ: "اَلْبَابٌ" جمع ہے "لُبٌّ" کی، جس کے معنی صاف ستھری اور پاکیزہ عقل کے ہیں، ہر عقل کو "لُبٌّ" نہیں کہتے۔"اُولُوا الْاَلْبَابِ" کا ترجمہ جمع ہونے کی وجہ سے "جو عقلوں والے ہیں" کیا گیا ہے۔جبکہ عام تراجم میں "عقل والے" ترجمہ کیا گیا ہے۔یعنی اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل والے ہیں۔یعنی جن کی حکمت عقل حکمت کے نور سے منور ہے۔اس دنیا کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر ایک نادیدہ عالم کی کامرانیوں کے لیے اپنی کمائی کو لٹانا انہی لوگوں کا

حوصلہ ہوسکتا ہے جن کو حکمت سے حصہ وافر ملا ہو۔ الغرض! اس آیت اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دین کی سمجھ آجانا ہی حکمت اور سب سے بڑی دولت ہے۔

گناہ کے کام کی نذر پوری کرنا جائز نہیں

وَمَآ	اور جو	اَنْفَقْتُمْ	تم خرچ کرو	مِّنْ نَّفَقَةٍ	کسی قسم کا خرچ
اَوْ	یا	نَذَرْتُمْ	تم نذر مانو	مِّنْ نَّذْرٍ	کوئی بھی نذر
فَاِنَّ	تو بیشک	اللّٰهَ	اللہ	يَعْلَمُهٗ	اسے جانتا ہے
وَمَا	اور نہیں ہے	لِلظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کے لیے		
مِنْ اَنْصَارٍ	کوئی مددگار۔(270)				

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ: نذر کا معنی ہے، اپنے آپ پر وہ چیز فرض کر لینا جو فرض نہیں تھی، مثلاً کوئی نفل نماز یا نفل روزہ یا صدقہ یا نفل حج وغیرہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک نذر مطلق اور دوسری نذر معلق۔ نذر مطلق یہ ہے کہ کوئی شرط لگائے بغیر صرف اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ پر کوئی نیکی لازم کر لے، مثلاً یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے ہمیشہ یا اتنے دن تہجد پڑھوں گا، یا عمرہ کروں گا۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے اور اسے پورا کرنا ضروری ہے۔ نذر معلق یہ ہے کہ کسی شرط کے ساتھ نذر ماننے کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فلاں نیکی کروں گا، مثلاً صدقہ یا نوافل وغیرہ۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ آدمی کی شرط سے مستغنی ہے، وہ اس کی وجہ سے اس کی مراد بر نہیں لائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”نذر نہ مانا کرو، اس لیے کہ نذر تقدیر میں طے شدہ کاموں میں کچھ فائدہ نہیں دیتی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ بخیل سے مال نکل آتا ہے۔ (مسلم) البتہ اگر وہ کام ہو جائے تو نذر پوری کرنا پڑے گی۔ گناہ کے کام کی نذر پوری کرنا جائز نہیں۔ اگر نذر پوری نہ کرسکے تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا جو وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ: اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ یہاں پر نذر کو صدقہ کے مقابلہ میں ذکر کیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ صدقہ وخیرات تو بلاشبہ حسنات میں سے ہے۔ مگر نذر جائز ہونے

کے باوجود خطرے سے خالی نہیں ،یعنی اللہ تعالیٰ ہر حال میں تمہاری نیت اور عمل سے واقف ہے ۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نذر ماننے سے منع کیا اور فرمایا کہ نذر اللہ کی تقدیر کو کچھ بدل نہیں سکتی ۔البتہ اس طرح بخیل سے کچھ مال نکال لیا جاتا ہے ۔(بخاری) حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا نَذْرَ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ: جس کا مطلب ہے کہ گناہ یا معصیت کے کاموں پر منت (نذر) ماننا جائز نہیں اور نہ ہی اسے پورا کرنا لازم ہے ۔اگر ایسی نذر مانی جائے تو وہ منعقد نہیں ہوتی اور اس پر قسم کا کفارہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے ۔اس لئے گناہ کے کام میں نذر ماننا جائز نہیں اور اگر ایسا کر ہی لیا ہے تو پھر اس کا پورا کرنا درست نہیں بلکہ اس کو توڑ کر نذر کا کفارہ ادا کر دینا چاہئے ۔فقہ کا مسئلہ ہے ۔جیسا کہ ہماری فقہ کی کتابوں عالمگیری اور شامی وغیرہ میں موجود ہے فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ جو لوگ قبروں کا غلاف پکڑتے ہیں اور نذر مانتے ہیں کہ اے بزرگ !اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو تمہارے دربار فلاں نذرانہ پیش کروں گا ،فرمایا ایسی چیز بالاجماع باطل اور حرام ہے کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے ۔ہاں اگر ایسی منت مانے کہ اگر فلاں کام ہو گیا تو اسی بزرگ کو ایصال ثواب کے لیے محتاجوں کی یہ خدمت کروں گا تو وہ الگ بات ہے اور اگر بزرگ کو ہی حاجت روا سمجھ لیا تو کفر شرک میں مبتلا ہو گیا ۔اسی لیے امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہما فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر سرے سے نذر ہوتی ہی نہیں ۔جیسے کوئی کہے کہ فلاں کام ہونے پر دس آدمیوں کو شراب پلاؤں گا۔

نذر کا مال غرباء ومساکین کا حق ہے

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ مزاروں پر تیل چڑھانا ،موم بتیاں جلانا ،چادریں چڑھانا ،بکرے چڑھانا یہ سب باطل اور ناجائز منت میں شامل ہیں اور اگر ایسا کرنے سے مراد بزرگ کی قربت حاصل کرنا ہے ۔تو پھر بھی شرک میں داخل ہے اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا کے علاوہ یہ بھی ہماری حاجات پوری کرتے ہیں تو بھی کفر ہے اور اگر محض مجاوروں کو کھلانا مقصود ہے تو یہ تخصیص بھی غلط ہے ۔اپنے گلی محلے ،گاؤں شہر کے غرباء ومساکین کو کھلاؤ ،ان کی جائز ضروریات کا خیال رکھو ۔مزاروں پر تو

عموماً اوباش قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔اگر نیت درست بھی ہو،تو بھی ایسے لوگوں کو کھلانا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ "محتاج نہیں بلکہ پیشہ ور گداگر ہیں،مزاروں پر موجود انتظامی عملہ بھی کھانے پینے میں شریک ہوتا ہے۔حالانکہ وہ بھی اس کے حق دار نہیں ہوتے اگر صاحب نصاب ہے تو منت کا مال تو خود منت ماننے والا بھی نہیں کھا سکتا۔جس طرح زکوٰۃ کے حق دار صرف اس کے مستحقین ہیں۔اسی طرح نذر کا مال بھی غرباء ومساکین کا حق ہے،لہٰذا نذر کا مال قبروں کے مجاوروں اور دیگر لواحقین کو کھانا کسی طور پر جائز نہیں۔تاہم امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر بطور نذر تو ہو جاتی ہے۔مگر اس کو توڑنا ضروری ہے۔حدیث شریف کے الفاظ ہیں كَفَّارَتُهُ كَفَّارَةُ يَمِينٍ اس قسم کی نذر کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کردو مگر معصیت کی نذر کو پورا نہ کرو نذر کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا،ایک غلام آزاد کرنا،یا تین روزے رکھنا، ہاں اگر نذر جائز ہے تو اس کو پورا کرنا چاہئے،جیسے مسجد میں چٹائیاں بچھادے،طالب علموں کو کھانا کھلادے،ان کی کتب کا بندوست کردے وغیرہ وغیرہ۔بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جو بھی نذر مانو فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے کہ تم نے کس نیت کے ساتھ منت مانی ہے نذر جائز ہے یا ناجائز،تم لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہو کہ فلاں کام فلاں نیت سے کیا ہے،مگر اللہ تعالیٰ تو تمہارے دلوں کے رازوں سے واقف ہے،وہ تمہاری ظاہر اور پوشیدہ سب باتوں کو جانتا ہے۔

حاصل کلام

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ شرعی طور پر منت ماننا جائز ہے اور منت کے لازم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ: 1۔منت اللہ رب العزت کے نام کی مانی جائے،پس غیر اللہ کے نام کی منت صحیح نہیں۔2۔منت از قسم عبادات میں سے کسی عبادت کی ماننا ضروری ہے،پس جو کام عبادت نہیں اس کی منت بھی صحیح نہیں۔3۔عبادت ایسی ہو کہ اس طرح کی عبادت کبھی فرض یا واجب ہوتی ہو،جیسے: نماز،روزہ،حج،قربانی وغیرہ،پس ایسی عبادت کہ جس کی جنس کبھی فرض یا واجب نہیں ہوتی ہو اس کی منت بھی صحیح نہیں۔اسی طرح جو عبادت پہلے سے فرض ہے (مثلاً پنج

وقتہ نماز، صاحبِ نصاب کے لیے زکوٰۃ، رمضان کا روزہ اور صاحبِ استطاعت کے لیے حج)، اس کی نذر ماننا بھی صحیح نہیں، کیوں کہ یہ پہلے سے ہی فرض ہیں۔ اور منت کا حکم یہ ہے کہ جس کام کے ہونے پر منت مانی جائے اور وہ کام ہو جائے تو اس منت کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، شرک سب سے بڑا ظلم ہے، لہٰذا جو کوئی شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ کفر کرتا ہے، غیر اللہ کی منت مانتا ہے۔ مستحقین کو نظر انداز کرتا ہے کسی قسم کی زیادتی کرتا ہے، حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ غرضیکہ جو بھی کوئی بڑے سے بڑا یا چھوٹے سے چھوٹا ظلم کریگا، اس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا، جو شخص نماز نہیں پڑھتا، جنابت کی حالت میں غسل نہیں کرتا روزہ نہیں رکھتا گویا اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہے۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، فرائض کو ترک کرنا کسی کو تنگ کرنا یہ سب ظلم میں شمار ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قیامت کے روز اس دنیا میں کیا ہوا ظلم اندھیروں کی صورت میں سامنے آئے گا اس لیے فرمایا اس دن ظلم کرنے والوں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا ظالم اپنے ظلم کی وجہ سے پھنسے ہوئے ہوں گے مگر ان کی خلاصی کے لیے کوئی مدد نہیں پہنچے گی، لہٰذا انسان کو چاہئے کہ نہ عبادت میں ظلم کا ارتکاب کرے، نہ معاملات میں اور نہ حقوق میں غرض کسی چیز میں ظلم نہیں کرنا چاہئے۔

صدقہ خفیہ دینا بہتر ہے یا اعلانیہ؟/ صدقہ وخیرات کے دنیاوی واخروی فوائد/غیر مسلم کے لیے صدقہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ
وَیُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَیْسَ عَلَیْكَ
هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا
تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا
تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

صدقہ اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کو ٹھنڈا کر دینے والا عمل

اِنْ تُبْدُوا	اگر تم ظاہر کرو	الصَّدَقٰتِ	خیرات		
فَنِعِمَّا	تو اچھی بات ہے	هِیَ	یہ	وَاِنْ	اور اگر
تُخْفُوْهَا	تم اسے چھپاؤ	وَتُؤْتُوْهَا	اور اُسے تم دو		
الْفُقَرَآءَ	تنگدستوں کو	فَهُوَ	تو وہ	خَیْرٌ	بہت ہی بہتر ہے
لَّكُمْ	تمہارے لیے	وَیُكَفِّرُ	اور (اللہ) دور کرے گا		

عَنۡكُمۡ	تم سے	مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ	تمہارے (کچھ) گناہ
وَاللّٰهُ	اور اللہ	بِمَا	ساتھ اُس کے جو
تَعۡمَلُوۡنَ	تم عمل کرتے ہو	خَبِيۡرٌ	خوب خبر دار ہے۔(271)

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ : "صَدَقَةٌ" کا لفظ "صِدۡقٌ" سے نکلا ہے، یعنی وہ مال جو آدمی صدق دل سے خرچ کرتا ہے، عموماً یہ فقط نفل صدقے پر بولا جاتا ہے لیکن بعض اوقات فرض صدقے پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ سورہ توبہ میں فرمایا: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ "صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں اور ان پر مقرر عاملوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جن کے دلوں میں الفت ڈالنی مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے میں اور تاوان بھرنے والوں میں اور اللہ کے راستے میں اور مسافروں میں (خرچ کرنے کے لیے ہیں) الغرض فرمایا اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ اگر تم صدقات کو ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے کہ اس میں اقتداء کا پہلو نکلتا ہے کہ اس کو دیکھ کر دوسرا بھی انفاق فی سبیل اللہ کے لیے تیار ہو جائے اور اگر زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو کرنے لگ جائے۔ اس کے علاوہ ایسا شخص لوگوں کو طعن و تشنیع سے بھی بچ جائیگا۔ جب وہ لوگوں کے سامنے صدقہ خیرات کریگا تو کنجوس کہلوانے سے بچ جائے گا۔ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ اور اگر تم اسے چھپاؤ اور فقراء کو دے دو فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ اس سے نہ تو ریا کاری لازم آئے گی اور نہ لینے والے کی عزت نفس مجروح ہوگی۔ پھر صدقہ و خیرات کی حکمت بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔

وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری کچھ برائیاں تم سے دور کر دیگا، تمہارے بعض گناہ معاف کر دیگا کیونکہ سارے گناہ صدقہ سے معاف نہیں ہوتے حدیث شریف میں آتا ہے اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطۡفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ (حدیث نمبر 664 سنن ترمذي) صدقہ و خیرات اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔ احسان جتلانے والے کے متعلق آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایسے شخص کو نظر شفقت سے نہیں دیکھے گا اور عذاب الیم میں ڈالے گا مگر

صدقہ وخیرات اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔مسند احمد میں نبی (علیہ السلام) کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔ »إِنَّ ظِلَّ المؤمنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صدقتُهُ قیامت کے دن صدقہ مومن کے حق میں بمنزلہ سایہ کے ہوگا، جب میدان محشر میں انتہا درجے کی تپش ہوگی اس وقت صدقہ اپنے دینے والے کے سر پر سایہ کریگا۔

صدقہ اسلام میں ایک انتہائی اہم اور فضیلت والا عمل

بہر حال صدقہ اسلام میں ایک انتہائی اہم اور فضیلت والا عمل ہے، جو نہ صرف محتاجوں کی مدد کرتا ہے بلکہ دینے والے کے لیے دنیا و آخرت میں برکت اور نجات کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔صدقہ سے مراد وہ مال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے غریب لوگوں کو دیا جائے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: صدقہ وہ مال ہے جس کا ادا کرنا واجب نہ ہو بلکہ خیرات دینے والا اس سے قربِ الٰہی کا قصد کرے2 گویا صدقہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد وہ زائد مال و دولت ہے جسے مستحقین کے درمیان اس طرح خرچ کیا جائے کہ ان کا معاشی تعطل ختم ہو، ان کی تخلیقی جدو جہد بحال ہو اور وہ معاشرے کی ترقی میں مطلوبہ کردار بحسن خوبی سرانجام دے سکیں۔مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (سورۃ الذاریات:19) اور ان کے اموال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں (دونوں) کا حق ہے۔محروم سے مراد، وہ ضرورت مند ہے جو سوال سے اجتناب کرتا ہے۔ چنانچہ مستحق ہونے کے باوجود لوگ اسے نہیں دیتے یا وہ شخص ہے جس کا سب کچھ آفت ارضی وسماوی میں تباہ ہو جائے۔جتنا خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ عطا فرمائے گا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (سبا:39) اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو تو وہی اس کی جگہ تمہیں اور دے دیتا ہے اور وہی سب سے بہتر رازق ہے۔اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والے کے گناہوں کی بخشش کرے گا ۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: إِن تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ (التغابن:17) اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر واپس

کرے گا اور تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔ اللہ بڑا اقدردان اور بڑا بردبار ہے۔ صدقہ و خیرات سے نعمتوں کو دوام ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے چھ بندے ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو فائدہ دینے کیلئے نعمتوں سے نوازا ہوتا ہے۔ جب تک وہ لوگ خرچ کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کیلئے وہ نعمتیں برقرار رکھتا ہے، لیکن جب وہ خرچ کرنا چھوڑ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن سے وہ نعمتیں چھین لیتا ہے اور دوسروں کو عطا کر دیتا ہے

انسانیت کی خدمت اخلاقی فریضہ

ہم انسانوں کو جو بھی عنایات اور بھلائیاں ملتی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے لہذا یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس عطا کردہ رزق سے غریبوں، مسکینوں، لاچار و مجبور، ضرورت مندوں، یتیموں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرامین مبارکہ میں صدقہ وخیرات کی فضیلت و اہمیت واضح الفاظ میں بیان کی ہیں۔ صدقہ ایمان کی دلیل ہے کیونکہ اللہ کے لیے صدقہ وہی کرتا ہے جس کا اللہ پر ایمان ہوتا ہے۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والصَّلاةُ نُورٌ، والصَّدَقَةُ بُرْهانٌ، والصَّبْرُ ضِياءٌ، (صحیح مسلم: 223) نماز نور ہے۔ صدقہ وخیرات انسان کے مسلم ومومن ہونے کی دلیل ہے اور صبر روشنی ہے۔

صدقہ تمام بیماریوں کے لیے علاج اور شفاء

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دَاوُوْا مَرضَاكُمْ بِالصَّدَقَةِ (صحیح الجامع 3358) صدقے کے ذریعے اپنے مریضوں کا علاج کرو۔ رزق اور مال میں برکت کا ذریعہ صدقہ رزق اور مال میں برکت کا ذریعہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ (صحیح مسلم: 2588) صدقہ مال میں کچھ بھی کمی نہیں کرتا۔ بندے کے معاف کرنے

سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت ہی بڑھاتا ہے اور جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا درجہ ہی بلند فرماتا ہے۔ الغرض! احادیث میں صدقہ کے بے پناہ فضائل مذکور ہیں، جیسے صدقہ غضب الٰہی کو بجھاتا اور بری موت دور کرتا ہے۔ گناہ مٹاتا ہے۔ برائی کے ستر دروازے بند کرتا ہے اور بری قضا ٹال دیتا ہے۔ صدقہ دینے سے روزی اور مدد ملتی ہے۔ عمر بڑھتی ہے۔ آفتیں دور ہوتی ہیں، نیز بلا صدقے سے آگے قدم نہیں بڑھاتی۔ صدقہ وخیرات کی اس قدر فضیلت ہے اور اس کی اس قدر برکات ہیں، **وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾** اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی خبر ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، اس کے پیچھے کیا نیت کارفرما ہے، پھر جیسی نیت ہوگی۔ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ بدلہ عطا کرے گا۔

فرضی صدقہ اور نفلی صدقہ دینے کا طریقہ

بہر حال اس آیت سے خفیہ صدقہ کی زیادہ فضیلت ثابت ہوئی۔ تاہم بعض علماء کہتے ہیں کہ فرضی صدقہ یعنی زکوٰۃ وغیرہ تو اعلانیہ دینا چاہیے تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو اور نفلی صدقہ بہر حال خفیہ دینا ہی بہتر ہے، اکثر و بیشتر اعمال میں یہی قاعدہ ہے کہ وہ خفیہ اور اعلانیہ دونوں طرح جائز ہیں لیکن ریاکاری کیلئے صدقہ اعلانیہ کرنا حرام ہے اور دوسروں کی ترغیب کیلئے کرنا ثواب ہے اور یہ تو واضح بات ہے کہ چھپا کر نیکی کرنے سے انسان کی اپنی اصلاح نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔

رضائے الٰہی کے ذرائع

لَيْسَ	نہیں ہے	عَلَيْكَ	آپ پر	هُدٰىهُمْ	ان کو ہدایت دینا
وَلٰكِنَّ	اور لیکن	اللّٰهَ	اللہ	يَهْدِيْ	ہدایت دیتا ہے
مَنْ	جسے	يَّشَآءُ	وہ چاہتا ہے	وَمَا	اور جو
تُنْفِقُوْا	تم خرچ کرو	مِنْ خَيْرٍ	مال سے		
فَلِاَنْفُسِكُمْ	تو وہ تمہارے نفسوں ہی کے (فائدے کے) لئے ہے	وَمَا	اور نہیں		

تُنفِقُوْنَ	تم خرچ کرتے ہو	اِلَّا	مگر
ابْتِغَآءَ	تلاش کرنے کے لئے	وَجْهِ اللهِ	اللہ کی رضامندی

وَمَا	اور جو	تُنفِقُوْا	تم خرچ کرو گے	مِنْ خَيْرٍ	مال سے
يُوَفَّ	وہ پورا پورا دیا جائے گا	اِلَيْكُمْ	تمہیں	وَاَنْتُمْ	اور تم
لَا تُظْلَمُوْنَ	نہ زیادتی کی جائے گی تم پر ۔(272)				

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ صحابہ اپنے مشرک رشتہ داروں کو تھوڑی سی چیز دینا بھی ناپسند کرتے تھے، پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دے دی اور یہ آیت اتری: (لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ) ابتدا مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور دوسرے غیر مسلم محتاجوں کی مدد کرنے میں تامل کرتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ صرف مسلمان محتاجوں کی مدد کرنا ہی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کے دلوں میں ہدایت اتار دینے کی ذمہ داری آپ پر نہیں۔آپ نے حق بات پہنچا دی، آگے ان کو راہ راست سمجھا دینا اللہ کا کام ہے۔رہا دنیوی مال ومتاع سے ان کی حاجات پوری کرنا تو اللہ کی رضا کے لیے تم جس حاجت مند کی بھی مدد کرو گے اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔فرمایا وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ اور تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو، یہ تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ کو تمہارے مالوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ تمہیں اجر عطا کریگا اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں بنی نوع انسان کے لیے ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اور تمہیں اجر وثواب سے نوازنا چاہتا ہے۔ وَمَا تُنفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللهِ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر محض رضا الٰہی کے لیے، اسمیں کوئی دیگر مقصد نہیں ہے، اگر کوئی دوسرا مقصد ہوگا، مثلاً کوئی اپنا مفاد وابستہ ہو، ریاکاری پائی جائے یا کسی کو ایذا دینا مقصود ہو تو ایسی صورت میں صدقہ ضائع ہو جائے گا۔لہٰذا محض اللہ کی رضا کے لیے صدقہ وخیرات کرنا چاہئے، اس کی مخلوق کے ساتھ احسان کرنا چاہئے، محتاجوں کی

حاجت براری کرنی چاہئے، یہ سب رضا الٰہی کے ذرائع ہیں ۔ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ اور تم جو بھی خرچ کرو گے، نیکی کرو گے، کسی کے ساتھ بھلائی کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان محتاج کو دینے سے پورا اجر ملے اور کافر کو دینے سے کم ملے، بلکہ پورا بدلہ دیا جائیگا۔اس بات میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہئے خالص نیت کے ساتھ جو بھی خرچ کیا جائیگا۔اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں بڑھا چڑھا کر دیں گے،البتہ فضلیت اس بات میں ہے کہ محتاجوں میں سے بہتر محتاج کو دیا جائے ۔مثلاً ایک نمازی ہے اور دوسرا بے نماز ہے تو نمازی کو دینا زیادہ اجروثواب کا موجب ہے،مگر جہاں مجبوری کا معاملہ ہو،وہاں کم تر آدمی کو بھی دینا چاہئے،اگر کوئی بے نمازی بھوکا مر رہا ہے تو اسے پہلے دینا چاہئے،اللہ تعالیٰ ہر نیکی کا پورا پورا بدلہ دے گا۔یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقہ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے زکوٰۃ مراد نہیں ہے کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا جائز نہیں ۔(تفسیر مظہری) وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ اور کسی شخص پر ذرہ بھر زیادتی نہیں کی جائیگی،اللہ تعالیٰ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا،یہ تو اس کے قانون کے خلاف ہے کہ کسی ادنیٰ یا ادنیٰ نیکی کو بھی نظر انداز کر دے ۔

محصور فقراء مراد کون لوگ ہیں؟ فقراء کی پہچان گداگری حرام ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي
الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا
يَسْــَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

صدقات کا بہترین مصرف

لِلْفُقَرَآءِ	(یہ صدقہ) اُن ضرورت مندوں کے لیے ہے	الَّذِيْنَ	جو		
اُحْصِرُوْا	روک دیئے گئے ہیں	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کی راہ میں		
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ	نہیں وہ طاقت رکھتے	ضَرْبًا	چلنے پھرنے کی		
فِي الْاَرْضِ	زمین میں	يَحْسَبُهُمُ	گمان کرتا ہے اُن کو	الْجَاهِلُ	ناواقف
اَغْنِيَآءَ	مال دار	مِنَ التَّعَفُّفِ	ان کے عدم سوال کی وجہ سے		
تَعْرِفُهُمْ	آپ پہچان لیں گے اُنہیں	بِسِيْمٰهُمْ	اُن کے چہرے کی علامات سے		
لَا يَسْــَٔلُوْنَ	نہیں وہ سوال کرتے	النَّاسَ	لوگوں سے		
اِلْحَافًا	چمٹ کر	وَمَا	اور جو	تُنْفِقُوْا	تم خرچ کرو
مِنْ خَيْرٍ	مال سے	فَاِنَّ اللّٰهَ	تو بیشک اللہ		

بِهٖ	اس کو	عَلِیْمٌ	خوب جاننے والا ہے ۔(273)

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ (یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے میں روکے گئے ہیں، زمین میں سفر نہیں کرسکتے، گزشتہ آیات میں صدقہ دینے کی ترغیب دی گئی یہاں بتایا گیا کہ ان کا بہترین مصرف وہ فقراء ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو جہاد اور طاعتِ الٰہی کیلئے روک رکھا ہے ۔ یہ آیت اہلِ صُفّہ کے حق میں نازل ہوئی ۔"لِلْفُقَرَآءِ" یہاں ان کے فقر کا سبب بیان نہیں فرمایا، سورہ حشر میں بیان فرمایا ہے: (لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ)[الحشر:8] "(یہ مال) ان محتاج گھربار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے ۔" اب وہ خالی ہاتھ تھے، نہ ان کے پاس مال تھا نہ گھر۔ ان کے لیے مسجد نبوی میں ایک صفہ بنادیا گیا۔ ان کی تعداد چارسو تھی جو غزوات اور مہموں پر بھیجنے کی وجہ سے کم زیادہ ہوتی رہتی تھی ۔

صدقہ کی تین قسمیں ہیں: (1) فرض، جیسے زکوٰۃ ۔(2) واجب، جیسے نذر، صدقہ، فطروغیرہ ۔ (3) نفلی صدقات، جیسے عام خیرات ۔

زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ (صدقہ فطروغیرہ) صرف مستحق زکوٰۃ افراد کو ہی دی جاسکتی ہے، شرعی اعتبار سے مستحق زکوٰۃ افراد وہ ہیں جو نہ بنی ہاشم (سیدوں یا عباسیوں وغیرہ) میں سے ہوں اور نہ ہی ان کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا، یا ساڑھے باون تولہ چاندی ہو، نہ ہی ساڑھے باون تولہ چاندی کی موجودہ قیمت کے برابر نقد رقم یا مال تجارت یا اس مالیت کے برابر ضرورت واستعمال سے زائد سامان موجود ہو۔ لہٰذا جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد اتنا سامان یا مال موجود ہو جس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی تک پہنچتی ہو وہ شرعاً مال دار ہے، اور مال دار کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے ۔اسی طرح زکوٰۃ وصدقات واجبہ اپنے اصول (والدین، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ) اور فروع (بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی وغیرہ) کو بھی نہیں دی جاسکتی ہے ۔

نیز زکوٰۃ یا واجب صدقات کسی فقیر کو کسی بھی چیز یا کام کے معاوضے کے بغیر مالک بنا کر دینا بھی ضروری ہے، لہٰذا تنخواہ میں زکوٰۃ یا واجب صدقہ دینا جائز نہیں ہے، اسی طرح زکوٰۃ اور واجب صدقات سے تعمیرات کرنا بھی درست نہیں ہے، الا یہ کہ کسی فقیر کو مالک بنا دیا جائے اور وہ اپنی مرضی سے اس رقم سے تعمیرات کرے یا کروائے۔ جب کہ نفلی صدقات کسی بھی خیر کے کام میں صرف کیے جا سکتے ہیں اس میں تملیک بھی شرط نہیں ہے اور مال دار اور اصول و فروع کو بھی نفلی صدقہ دیا جا سکتا ہے، بلکہ نفلی صدقہ میں افضل یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ ہم کیا خرچ کریں اور کس پر خرچ کریں؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں اور صدقہ دیں؟ کہہ دیجیے کہ جو مال بھی تم صرف کرنا چاہو، سو وہ ماں، باپ، عزیزوں، یتیموں، مساکین اور مسافروں پر خرچ کرو، اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے ضرور باخبر ہیں۔

"الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ" احصار لغت میں یہ ہے کہ آدمی جو کام کرنا چاہتا ہے اس کے کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش آ جائے، مثلاً کوئی بیماری، بڑھاپا، خرچ نہ ہونا، یا کوئی دشمن وغیرہ۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں، یعنی جہاد اور طلب علم نے انھیں کمائی کرنے سے روک دیا ہے، وہ منتظر بیٹھے ہیں کہ کب حکم ہو اور وہ جہاد کے لیے نکلیں۔ یہ لوگ اللہ کی خاطر گھر سے نکلے، اللہ کی خاطر مال مویشی چھوڑ کر فقر اختیار کیا اور اب اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں وقف کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت بھی جو مجاہد یا دین کے طالب علم کاروبار یا ملازمت کے بجائے اپنے آپ کو جہاد اور دینی علوم کے حصول کے لیے روکے ہوئے ہیں ان پر خرچ کرنا اولین فریضہ ہے۔ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ "یعنی ان کی بے نیازی، عزت

نفس اورسوال سے بچنے کی وجہ سے ناواقف آدمی سمجھتا ہے کہ وہ غنی ہیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت اصحاب صفہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ وہ صحابہ تھے جنہوں نے اپنی زندگی علم دین حاصل کرنے کے لئے وقف کردی تھی اور آنحضرت ﷺ کے پاس مسجد نبوی سے متصل ایک چبوترے پر آپڑے تھے، طلب علم کی وجہ سے وہ کوئی معاشی مشغلہ اختیار نہیں کرسکتے تھے مگر مفلسی کی سختیاں ہنسی خوشی برداشت کرتے تھے کسی سے مانگنے کا سوال نہیں تھا۔

صدقہ وخیرات کے زیادہ مستحق

اُحۡصِرُوۡا کی تشریح میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں روک دیے جانے والے لوگوں میں دو قسم کے لوگ شمار ہوتے ہیں۔فی سبیل اللہ سے عموماً جہاد مراد لیا جاتا ہے، لہٰذا مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ اس قدر نادار ہیں کہ جہاد پر محض اس لیے نہیں جاسکتے کہ انہیں ضروریات زندگی کے لیے محنت مزدوری کرنا ہوتی ہے۔اگر جہاد پر چلے جائیں تو پیچھے ان کے بچوں کی کفالت ممکن نہیں اور اگر کاروبار میں لگے رہتے ہیں تو جہاد پر نہیں جاسکتے اس طرح وہ جہاد پر جانے سے روک دیے جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگ صدقہ وخیرات کے زیادہ مستحق ہیں اگر ان کی اعانت کردی جائے تو جہاد کے فریضہ پر جاتے وقت وہ گھر کی کفالت سے بھی بے فکر ہو جائیں گے، ان پر خرچ کرنا گویا جہاد کے راستے میں حائل رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔محصورین کی دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں، جو دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، حصول تعلیم کے لیے وہ مدرسہ میں پابند ہو کر رہ گئے ہیں، لہٰذا دیگر کام کاج کرنے سے عاجز ہیں، اگر وہ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر کاروبار بھی کرنا چاہیں۔تو ظاہر ہے کہ کسی ایک کام کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔گزراوقات کے لیے محنت، مزدوری، ملازمت، کاروبار، کھیتی باڑی وغیرہ ہر کام کے لیے پوری توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔اسی طرح دینی تعلیم کے لیے بھی پوراوقت درکار ہے۔جب تک پوراوقت نہیں دے گا نہ قرآن پاک یاد کرسکتا ہے، نہ قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔جزوقتی سے دونوں کام ادھورے رہ جائیں گے، اور طالب علم کسی کام میں کامل نہیں ہو سکے گا، بلکہ بعض اوقات اس طرح کا

کام نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔"نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان" ایک مشہور مقولہ ہے۔ ناقص التعلیم شخص گمراہی پھیلا کر نقصان کا باعث ہی ہوگا،لہٰذا جو شخص دینی تعلیم حاصل کرنا چاہے اسے دیگر ضروریات سے بے نیاز بنانے کے لیے ان پر خرچ کرنا ہوگا۔بہر حال: انہی حضرات کی صف میں علماء وطلبہ و مبلغین و خادمین دین داخل ہیں جو دینی کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے کمانے کی فرصت نہیں پاتے۔یہ لوگ اپنی عزت و وقار اور مروت کی وجہ سے لوگوں سے سوال بھی نہیں کر پاتے اور اپنے فقر کو چھپانے کی بھی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کا گزارا بہت اچھا ہو رہا ہے لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔اگر کچھ غور سے دیکھا جائے تو ان لوگوں کی زندگی کا مشقت سے بھرپور ہونا بہت سی علامات وقرائن سے معلوم ہو جائے گا۔ان کے مزاج میں تواضع اور انکساری ہوگی،چہرے پر ضعف کے آثار ہوں گے اور بھوک سے رنگ زرد ہوں گے۔ہمارے ہاں دین کے اس طرح کے خادموں کی کمی نہیں اور ان کی غربت ومحتاجی کے باوجود انہیں مالدار سمجھنے والے ناواقفوں اور جاہلوں کی بھی کمی نہیں۔شاید ہمارے زمانے کا سب سے مظلوم طبقہ یہی ہوتا ہے۔اس چیز کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو عالم اس لئے نہیں بناتے کہ یہ کھائیں گے کہاں سے؟ جب اس بات کا علم ہے تو یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ جو علماء وخادمین دین موجود ہیں وہ کیسے گزارا کر رہے ہوں گے؟ اصحابِ صفہ کی حالت پر مذکورہ آیت مبارکہ کا نزول صرف کوئی تاریخی واقعہ بیان کرنے کیلئے نہیں ہے بلکہ ہمیں سمجھانے،نصیحت کرنے اور ترغیب دینے کیلئے ہے۔علماء و مُبلِّغین کی گھروں کی پریشانیاں ختم کر دیں پھر دیکھیں کہ دین کا کام کیسی تیزی سے ہوتا ہے"تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ "تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا۔بعض مفسرین نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ بھوک کی وجہ سے کمزوری اور چہرے کی زردی سے تم ان کا فقر پہچان لوگے،مگر یہ معنیٰ ہو تو یہ تو ناواقف بھی پہچان لیتا ہے،اس لیے اس کا مطلب چہرے کا نور اور وہ رونق ہے جو ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ان کے چہرے پر نمایاں تھی،"لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے،گویا اہل ایمان کی صفت یہ ہے کہ فقر وغربت کے باوجود وہ تَعَفُّف (سوال سے بچنا) اختیار کرتے اور الحاف (چمٹ کر سوال کرنا) سے گریز کرتے ہیں۔

بعض نے الحاف کے معنی کئے ہیں، بالکل سوال نہ کرنا کیونکہ ان کی پہلے صفت عفت بیان کی گئی ہے (فتح القدیر) اور بعض نے کہا ہے کہ وہ سوال میں الحاح وزاری نہیں کرتے اور جس چیز کی انہیں ضرورت نہیں ہے اسے لوگوں سے طلب نہیں کرتے۔ اس لئے کہ الحاف یہ ہے کہ ضرورت نہ ہونے کے باوجود (بطور پیشہ) لوگوں سے مانگے اس مفہوم کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مسکین وہ نہیں ہے جو ایک ایک دو دو کھجور یا ایک ایک، دو دو لقمے کے لئے دردر پر جا کر سوال کرتا ہے۔ مسکین تو وہ ہے جو سوال سے بچتا ہے پھر نبی (ﷺ) نے آیت لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا کا حوالہ پیش فرمایا (صحیح بخاری، التفسیر والزکاۃ)۔ فقراء کی پہچان ان کی مالی تہی دستی کے ساتھ ساتھ ان کے اعلیٰ اخلاقی وروحانی اوصاف سے ہوتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے، سچے فقیر عاجزی، تواضع، صبر، اور مخلوقِ خدا کے سامنے دستِ سوال نہ پھیلانے (خودداری) جیسی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ مال و دولت سے بے نیاز ہو کر صرف اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہیں۔ اس لئے پیشہ ور گداگروں کی بجائے، مہاجرین، دین کے طلبا علما اور سفید پوش ضرورت مندوں کا پتہ چلا کر ان کی امداد کرنی چاہیے۔ جو سوال کرنے سے گریز کرتے ہیں، کیونکہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا انسان کی عزت نفس اور خودداری کے خلاف ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ پیشہ ور بھکاری فقرا کی فہرست میں شامل نہیں ہیں، کیونکہ بھیک مانگنا تو سخت معیوب ہے اور جن ناداروں کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ان کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے کہ وہ اس قدر خوددار ہیں کہ سخت ضروریات کے باوجود سوال سے گریز کرتے ہیں۔ مسلم ممالک میں عموماً اور ہمارے ہاں خصوصاً لوگ جگہ جگہ بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے سوال کی بہت مذمت فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”آدمی لوگوں سے مانگتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی۔“ (بخاری)

اکسابِ ضارہ کا معنی اس کا بنیادی مفہوم

امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح چوری، ڈاکہ، قمار بازی وغیرہ اکساب ضارہ

ہیں، (اکسابِ ضارہ عربی زبان کا مرکب ہے جس کا بنیادی اور لغوی معنیٰ "نقصان دہ کمائی" یا "نقصان دہ حصول" ہے مفہوم: یہ اصلاح معاشیات، قانون اور اخلاقیات میں ایسے منافع، آمدنی یا فوائد کے لیے استعمال ہوتی ہے جو غیر قانونی ذرائع، استحصال، رشوت، یا کسی دوسرے فرد کو مالی یا جسمانی نقصان پہنچا کر حاصل کیے گئے ہوں۔ مختصراً، ہر وہ کمائی یا فائدہ جو کسی دوسرے کے نقصان پر مبنی ہو" اکساب ضارہ" کہلاتا ہے۔) اسی طرح گداگری بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ یورپ کی عیسائی، یہودی اور دہریہ اقوام میں آپ کو کہیں بھکاری نظر نہیں آئے گا ان کی حکومتیں اپنے ناداروں کی کفالت کرتی ہیں۔ برطانیہ میں تو بے روزگاروں کو باقاعدہ گزارہ الاؤنس ملتا ہے۔ جب تک کسی شخص کو کام مہیا نہیں کیا جاسکتا، اسے گزراوقات کے لیے وظیفہ دیا جاتا ہے، لہٰذا وہاں پر گداگری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال سے بچنے کا اصول تو اسلام نے پیش کیا تھا مگر اسے اغیار نے اپنا لیا اور خود مسلمان اس سے محروم ہو گئے۔ ہمارے حکمران اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتے گداگری بڑی بری خصلت ہے اور عزت نفس کے خلاف ہے اس کا سد باب ہونا چاہئے۔ الغرض! اس آیت نے بتایا کہ ایسے لوگ امداد کے زیادہ مستحق ہیں جو ایک نیک مقصد سے پوری امت کے فائدے کے لئے مقید ہو کر رہ گئے ہیں اور سختیاں جھیلنے کے باوجود اپنی ضرورت کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا فقراء سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو دینی مشغولیت کی وجہ سے دوسرا کوئی کام نہیں کرسکتے۔

فرمایا وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ اے ایمان والو! تم جو کچھ اپنے مال سے خرچ کرو فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے آخر میں فرمایا کہ" جو تم خرچ کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہے" یعنی ایسے خوددار سائلوں کو تلاش کر کے چپ چپاتے ان کی حاجت روائی کرنا خلق سے چھپا رہے گا لیکن خالق سے چھپا نہیں رہے گا، وہ تمہارے ہر انفاق سے باخبر ہے اور وہ اس کا بھرپور صلہ دے گا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ صدقات سے متعلق احکام میں اللہ نے آخری بات یہ سمجھائی کہ تمہارے صدقات کے سب سے زیادہ حقدار کون ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو دین کا کام خاموشی کے ساتھ

انجام دے رہے ہیں۔ مگر سوال نہیں کرتے، سلف صالحین میں ایسے بزرگوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ امام احمد بن حنبل ان کے استاد عبدالرزاق، امام ابن ہمام، امام ابو یوسف، امام شافعی، امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم وغیرہم ایسے بزرگ ہیں کہ علم دین کی خاطر لمبے لمبے پیدل سفر کیے۔ بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ مگر سوال نہیں کیا امام ابن جریر رحمہ اللہ کے متعلق آتا ہے کہ حصول تعلیم کے لیے رخصت ہونے لگے تو والدہ نے دو سو کلچہ تیار کر کے ساتھ دے دیا۔ فرماتے ہیں کہ پورے دو سو دن ان کلچوں پر گزارہ کیا۔ ہر روز ایک کلچہ کھا کر پانی پی لیتا اور اللہ کا شکر بجالاتا مگر کسی سے سوال نہیں کیا۔ یہ وہی مفسر قرآن ہیں، جنہوں نے قرآن پاک کی سب سے بڑی تفسیر لکھی ہے۔ آپ چالیس سال تک بغداد میں مقیم رہے، ہر روز چالیس ورق لکھتے تھے، آپ کی وفات کے بعد حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے زندگی میں پانچ سو پونڈ سیاہی استعمال کی۔ یہ ان لوگوں کے کام کی برکات ہیں کہ دین کا قافلہ چل رہا ہے، ورنہ اگر اس زمانے کے بھکاریوں والی بات ہوتی، تو پھر دین کا اللہ ہی حافظ تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس نیت سے خرچ کر رہے ہو اور کس پر خرچ کر رہے ہو۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خرچ کی بہترین مد بھی بیان فرمادی۔

سود کی ممانعت قرآن وحدیث کی رُو سے

سود کی حرمت اور تباہ کاریاں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

صدقات وخیرات کے احکام کا تتمہ

اَلَّذِیْنَ	وہ لوگ جو	یُنْفِقُوْنَ	خرچ کرتے ہیں	اَمْوَالَھُمْ	اپنے مال
بِالَّیْلِ	رات میں	وَالنَّھَارِ	اور دن میں	سِرًّا	پوشیدہ
وَّعَلَانِیَۃً	اور ظاہر	فَلَھُمْ	توان کے لیے		
اَجْرُھُمْ	ان کا اجر ہے	عِنْدَ رَبِّھِمْ	اُن کے رب کے ہاں		

وَلَا	اور نہ	خَوْفٌ	کوئی خوف ہوگا	عَلَيْهِمْ	ان پر
وَلَا هُمْ	اور نہ وہ	يَحْزَنُوْنَ	غمگین ہوں گے۔(274)		

یہ آیت دراصل صدقات وخیرات کے احکام کا تتمہ ہے۔یعنی آخر میں ایک دفعہ پھر صدقہ کی ترغیب دی جارہی ہے۔اب اس کی عین ضد سود کا بیان شروع ہورہا ہے۔صدقات وخیرات سے جہاں آپس میں ہمدردی،مروت،اخوت،فیاضی پیدا ہوتی ہے وہاں طبقاتی تقسیم بھی کم ہوتی ہے۔اس کے برعکس سود سے شقاوت قلبی،خودغرضی،منافرت،بے مروتی اور بخل جیسے اخلاق رذیلہ پرورش پاتے ہیں اور طبقاتی تقسیم بڑھتی چلی جاتی ہے جو بالآخر کسی نہ کسی عظیم فتنہ کا باعث بن جاتی ہے۔اشتراکیت دراصل ایسے ہی فتنہ کی پیداوار ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر وقت اور ہر حال میں خیرات کرنے اور خدمت دین میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے دن کو رات کو عمومی اوقات اور چھپا کر اور علانیہ سے عموم احوال مراد ہے۔ان لوگوں کے لئے اجر عظیم اور فضلیت کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے عادی ہیں تمام حالات و اوقات میں رات میں اور دن میں خفیہ اور علانیہ ہر طرح فی سبیل اللہ خرچ کرتے رہتے ہیں اس کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ صدقہ و خیرات کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں نہ رات اور دن کی کوئی تعیین ہے اس طرح خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ثواب ہے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے نام ونمود مقصود نہ ہو۔یہاں تک چودہ آیات میں صدقے کا بیان تھا،اس کے بعد سود کو حرام قرار دیا۔جب صدقے کی تاکید فرمائی تو قرض دینا تو بالاولیٰ ضروری ٹھہرا اور قرض پر سود کیوں لیا جائے۔

اَلَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	يَاْكُلُوْنَ	کھاتے ہیں	الرِّبٰوا	سود
لَا يَقُوْمُوْنَ	نہیں وہ کھڑے ہوں گے	اِلَّا	مگر		
كَمَا	جس طرح	يَقُوْمُ	کھڑا ہوتا ہے	الَّذِيْ	وہ شخص جو
يَتَخَبَّطُهُ	اُس کو بدحواس بنادیا ہو	الشَّيْطٰنُ	شیطان نے		
مِنَ الْمَسِّ	چھونے سے	ذٰلِكَ	یہ (سزا)	بِاَنَّهُمْ	اس وجہ سے ہے کہ

قَالُوْٓا	انہوں نے کہا	اِنَّمَا	درحقیقت
الْبَيْعُ	بیع (تجارت) تو ہے ہی	مِثْلُ الرِّبٰوا	سود کے مثل

سود کو عربی زبان میں ”ربا“ کہتے ہیں، جس کا لغوی معنی ہے: بڑھنا، اضافہ ہونا، بلند ہونا۔ اور شرعی اصطلاح میں ربا (سود) کی تعریف یہ ہے: ”قرض دے کر اس پر مشروط اضافہ یا نفع لینا یا کیلی (ناپ کر بیچی جانے والی) یا وزنی (تول کر بیچی جانے والی) چیز کے تبادلے میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کو ایسی زیادتی کا ملنا جو عوض سے خالی ہو اور عقد میں مشروط ہو۔

مثلاً: رقم کے عوض رقم لینا، جیسے سو روپے کسی کو قرض دیا، اور دیتے وقت یہ شرط لگائی کہ سو سے زائد مثلاً دو سو روپے دینے ہوں گے، یا قرض دے کر اس سے مزید کوئی فائدہ لینا۔ بلاشبہ سود اسلام میں قطعی طور پر حرام ہے، کیوں کہ یہ ایک ایسی لعنت ہے جس سے نہ صرف معاشی استحصال، مفت خوری، حرص وطمع، خود غرضی، شقاوت وسنگ دلی، مفاد پرستی جیسی اخلاقی قباحتیں جنم لیتی ہیں، بلکہ معاشی اور اقتصادی تباہ کاریوں کا ذریعہ بھی ہے، اسی وجہ سے قرآنِ مجید میں سود سے منع کیا گیا ہے:

اے ایمان والو سود مت کھاؤ (یعنی مت لو اصل سے) کئی حصے زائد (کر کے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔ (سورۃ آلِ عمران، رقم الآیۃ: 130، ترجمہ: بیان القرآن)

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ وہ قیامت کے دن نہیں کھڑے ہونگے اپنی قبروں سے اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چمٹ کر مخبوط الحواس کر دیا ہو۔ جب کسی شخص پر جن اثر ڈالتا ہے، جسے جن کا سایہ یا جن کا چمٹنا کہتے ہیں تو وہ شخص اپنے ہوش وحواس قائم نہیں رکھ سکتا۔ اچھے طریقے سے کھڑا نہیں ہوسکتا، طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہے۔ تو فرمایا قیامت کے دن سود خود کی بھی یہی حالت ہوگی، جب وہ قبروں سے اٹھیں گے، تو ان کے پاؤں لڑکھڑاتے ہوں گے اور ان پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگی یہ ان کے لیے سود خوری کی سزا ہوگی۔ فرمایا سود خور قیامت کے روز قبر سے حواس باختہ اٹھے گا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اس کی وجہ یہ ہے کہ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا انہوں نے کہا تجارت سود کی مانند ہے۔

دونوں چیزوں میں کوئی فرق نہیں ،لوگ تجارت کرتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں،اور پھر اس میں نفع کماتے ہیں ۔اس طرح ساہوکار بھی اپنی رقم لگاتا ہے اور اس پر نفع لیتا ہے ۔سود خور کا یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں اسے سرمایہ جمع کرنے اور حلال حرام میں عدم تمیز کا جنون ہو چکا ہے ۔اسی لیے یہ سود کو تجارت کے برابر قرار دے رہا ہے، حالانکہ منافع کس جنس کے بدلے میں ہوتا ہے، ایک شخص کوئی چیز بیچتا ہے اور اپنی لاگت سے زیادہ وصول کر کے نفع کماتا ہے، مگر سود میں تو کسی چیز کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ سود خور نہ کوئی چیز خریدتا ہے اور نہ اسے بیچتا ہے، بلکہ صرف روپیہ ادھار دیکر اس پر سود لیتا ہے جو قطعاً حرام ہے ۔سود دو شکلوں میں ہوتا ہے، ادھار کی شکل میں یا اجناس کی صورت میں ، اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قرض کے طور پر کچھ رقم دیتا ہے اور پھر مقررہ مدت کے بعد اصل رقم کے ساتھ کچھ زائد بھی لیتا ہے تو یہ صریحاً سود ہے، کیونکہ قرض دینے والے نے نہ اس میں محنت کی ہے، نہ وقت دیا اور نہ صلاحیت صرف کی ہے ۔وہ محض اپنی رقم کے بل بوتے پر مقررہ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے جو سود ہے ۔جنس کی صورت میں یہ ہے کہ کوئی شخص جنس کسی دوسرے شخص کو مقررہ مدت کے لیے دے اور پھر واپسی پر اداشدہ جنس سے زیادہ لے ۔یہ بھی سود ہوگا۔

وَاَحَلَّ	حالانکہ حلال کیا	اللّٰهُ	اللہ نے	الْبَيْعَ	بیع (تجارت) کو
وَحَرَّمَ	اور حرام کیا اُس نے	الرِّبٰوا	سود کو	فَمَنْ	پھر وہ شخص کہ
جَآءَهٗ	آ گئی اُس کے پاس	مَوْعِظَةٌ	نصیحت		
مِّنْ رَّبِّهٖ	اس کے رب کی طرف سے	فَانْتَهٰى	تو وہ باز آ گیا		
فَلَهٗ	تو اس کے لیے ہے	مَا سَلَفَ	جو کچھ پہلے ہو چکا		
وَاَمْرُهٗٓ	اور اس کا معاملہ	اِلَى اللّٰهِ	اللہ کی طرف ہے		
وَمَنْ	اور جو شخص	عَادَ	دوبارہ (سودی معاملہ) کرے		
فَاُولٰٓئِكَ	تو وہی لوگ	اَصْحٰبُ النَّارِ	دوزخ والے ہیں		
هُمْ	وہ	فِيْهَا	اس میں	خٰلِدُوْنَ	ہمیشہ رہیں گے۔(275)

مال اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے، جس کے ذریعہ انسان اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی دنیاوی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے؛ لیکن شریعتِ اسلامیہ نے ہر شخص کو مکلف بنایا ہے کہ وہ صرف جائز وحلال طریقہ سے ہی مال کمائے؛ کیوں کہ کل قیامت کے دن ہر شخص کو مال کے متعلق اللہ رب العزت کو جواب دینا ہوگا کہ کہاں سے کمایا یعنی وسائل کیا تھے اور کہاں خرچ کیا یعنی مال سے متعلق حقوق العباد یا حقوق اللہ میں کوئی کوتاہی تو نہیں کی۔ مال کے نعمت اور ضرورت ہونے کے باوجود، خالق کائنات اور تمام نبیوں کے سردار حضورِ اکرم ﷺ نے مال کو متعدد مرتبہ فتنہ، دھوکے کا سامان اور محض دنیاوی زینت کی چیز قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مال ودولت کے حصول کے لیے کوئی کوشش ہی نہ کریں، کیوں کہ حلال رزق کا طلب کرنا اور اس سے بچوں کی تربیت کرنا خود دین ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے خوف کے ساتھ زندگی گزاریں اور اخروی زندگی کی کامیابی کو ہر حال میں ترجیح دیں۔ کہیں کوئی معاملہ درپیش ہو تو اخروی زندگی کو داؤ پر لگانے کے بجائے فانی دنیاوی زندگی کے عارضی مقاصد کو نظر انداز کردیں، نیز شک وشبہ والے امور سے بچیں۔ اِن دنوں حصول مال کے لیے ایسی دوڑ شروع ہوگئی ہے کہ اکثر لوگ اس کا بھی اہتمام نہیں کرتے کہ مال حلال وسائل سے آرہا ہے یا حرام وسائل سے؛ بلکہ کچھ لوگوں نے تو اَب حرام وسائل کو مختلف نام دے کر اپنے لیے جائز سمجھنا شروع کردیا ہے؛ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے تو مشتبہ چیزوں سے بھی بچنے کا حکم دیا ہے؛ اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ صرف حلال وسائل پر ہی اکتفاء کرے، جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حرام مال سے جسم کی بڑھوتری نہ کرو، کیوں کہ اس سے بہتر آگ ہے۔ (ترمذی) نیز نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ حرام کھانے، پینے اور حرام پہننے والوں کی دعائیں قبول نہیں ہوتی ہیں۔ (مسلم)

فرمایا سودخوروں کا نظریہ یہ ہے کہ تجارت سود کی مثل ہے۔ **وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا** حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ تجارت میں کبھی منافع ہوتا ہے اور کبھی نقصان کا احتمال بھی ہوتا ہے، جب کہ سود ایک مقرر منافع ہے، جو بہر

صورت رقم دہندہ کو وصول ہوتا رہتا ہے، چنانچہ فتح مکہ کے اندر حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا، سود بالکل چھوڑ دو، سابقہ تمام سود ختم ہو گئے۔ فرمایا میرے خاندان والے جو سود وصول کرتے تھے، وہ بھی میں نے ختم کر دیا، اب کسی کو سود کی رقم لینے کی اجازت نہیں۔ سب سے پہلے حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا سود ختم کیا اور فرمایا کہ اصل قرضہ واپس لے سکتا ہے، مگر سود کا ایک پیسہ تک لینے کی اجازت نہیں، تمام سود مٹا دیے گئے۔ فرمایا: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی۔ یعنی سود کی حرمت کا حکم پہنچ گیا فَانْتَهٰى تو اس شخص نے سود لینا چھوڑ دیا۔ فَلَهٗ مَا سَلَفَ تو جو کچھ ہو چکا وہ اس کے لیے ہے، یعنی جو سود حاصل کر چکا ہے۔ اس کا کچھ مواخذہ نہیں یعنی حرکت سود کا قانون آنے سے پہلے سود کی جو رقم لے چکا ہے۔ وہ اس کی ہو گئی، اب اس کی واپسی کی ضرورت نہیں۔ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے۔ وہ اسے معاف کرنے پر قادر ہے، تاہم یہ اس کی نیت پر منحصر ہے کہ اس نے دل سے اللہ کے حکم کو قبول کر لیا ہے یا محض دکھاوے کے لیے سود لینا بند کیا ہے، اسی لیے فرمایا کہ ایسے شخص کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے لوگوں سے سود وصول کیا ہے، چونکہ اس وقت تک سود کے حرام ہونے کا اعلان نہیں ہوا تھا اس لئے وہ پچھلے معاملات معاف ہیں، اور ان کے ذریعے جو رقمیں وصول کی گئی ہیں وہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ حرمت کے اعلان کے وقت جو سود کسی پر واجب الادا ہو وہ لینا جائز نہیں ہوگا؛ بلکہ اسے چھوڑنا ہوگا۔ یعنی جن لوگوں نے حرمت سودی کو تسلیم نہ کیا اور وہی اعتراض کرتے رہے کہ بیع اور سود میں کوئی فرق نہیں، وہ کافر ہونے کی وجہ سے ابدی عذاب کے مستحق ہوں گے۔

سود کھانے سے توبہ نہ کرنے والے لوگ جہنم میں جائیں گے

وَمَنْ عَادَ اور جو کوئی دوبارہ سودی کاروبار شروع کر دے گا۔ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ یہی لوگ اہل جہنم ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۷۵ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ مطلب یہ

کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد جو شخص سودی لین دین سے باز نہ آیا، تو وہ اسی لائق ہے کہ جہنم کے گڑھے میں پھینک دیا جائے۔ جہاں سے کبھی چھٹکارا نہ ہو، اگر اس نے سود کو حلال سمجھ کر کھایا ہے تو پھر تو قطعی کافر ہے، اور حلال تو نہیں جانتا مگر کھا رہا ہے، تو بھی شدید درجے کا گناہ گار ہے اور دوزخ کا مستحق ہے۔ ہمارے معاشرہ میں جو بڑے بڑے گناہ عام ہوتے جا رہے ہیں، ان میں سے ایک بڑا خطرناک اور انسان کو ہلاک کرنے والا گناہ سود ہے۔

سود کے متعلق نبیِ اکرم ﷺ کے ارشادات

حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا، اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سود ہے۔ وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا ہے؛ چونکہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سود کی حرمت سے قبل لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے؛ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ آج کے دن میں اُن کا سود جو دوسرے لوگوں کے ذمہ ہے وہ ختم کرتا ہوں۔ (صحیح مسلم، باب حجۃ النبی)

حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ سات بڑے گناہ کونسے ہیں (جو انسانوں کو ہلاک کرنے والے ہیں)؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱) شرک کرنا، (۲) جادو کرنا، (۳) کسی شخص کو ناحق قتل کرنا، (۴) سود کھانا، (۵) یتیم کے مال کو ہڑپنا، (۶) (کفار کے ساتھ جنگ کی صورت میں) میدان سے بھاگنا، (۷) پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔ (بخاری ومسلم)

حضورِ اکرم ﷺ نے سود لینے اور دینے والے، سودی حساب لکھنے والے اور سودی شہادت دینے والے سب پر لعنت فرمائی ہے۔ سود لینے اور دینے والے پر حضورِ اکرم ﷺ کی لعنت کے الفاظ حدیث کی ہر مشہور و معروف کتاب میں موجود ہیں۔ (مسلم، ترمذی، ابوداود، نسائی)

حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار شخص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے لازم کرلیا

ہے کہ ان کو جنت میں داخل نہیں کریں گے اور نہ ان کو جنت کی نعمتوں کا ذائقہ چکھائیں گے۔ پہلا شراب کا عادی، دوسرا سود کھانے والا، تیسرا ناحق یتیم کا مال اڑانے والا، چوتھا ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا (کتاب الکبائر للذہبی)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کے 70 سے زیادہ درجے ہیں اور ادنی درجہ ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کرے۔ (رواہ حاکم، البیہقی، طبرانی، مالک)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک درہم سود کا کھانا چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ ہے۔ (رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر)

یا اللہ امت مسلمہ پر رحم فرما اور اس میں قرآن پاک کے یہ احکامات زندہ فرما۔ آمین یارب العٰلمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

سود! انسانوں کو ہلاک کرنے والا گناہ/ سود خوروں کے لیے تعزیر/ حکومت وقت کی ذمہ داری

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ
رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ
وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷۸﴾

صدقات بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ

یَمْحَقُ	مٹاتا ہے	اللّٰہُ	اللہ	الرِّبٰوا	سود کو
وَیُرْبِی	اور بڑھاتا ہے	الصَّدَقٰتِ	صدقات کو		
وَاللّٰہُ	اور اللہ	لَا یُحِبُّ	نہیں پسند کرتا	کُلَّ	ہر
کَفَّارٍ	کفر کرنے والے	اَثِیْمٍ	گنہگار کو۔(276)		

سود کے واضح احکام بیان کرنے کے بعد اسکی حکمت بھی بیان فرمادی ۔ یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے، سود کا جتنا بھی مال اکٹھا کرلو مگر انجام کار اس سے فائدے کی بجائے نقصان

ہی پہنچے گا۔ایسا مال اکثر عیاشی کے کاموں،لہو ولعب، بینڈ باجے، آتش بازی، بے جا فیشن یا غلط رسم و رواج کی نظر میں ہو جاتا ہے اس میں خیر و برکت نہیں آتی ۔انسان سکون قلب سے محروم رہتا ہے، حرص بڑھتی رہتی ہے، باقی لوگ خواہ بھوکوں مر جائیں، اسے مال اکٹھا کرنے سے غرض رہے، یہ سب نقصان دہ چیزیں ہیں ۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے ۔**وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ** اور صدقات کو بڑھاتا ہے، زکوٰۃ وصدقات دینے والے کے مال میں اللہ تعالیٰ برکت عطا کرتا ہے ۔صدقات کا جذبہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ ہے ۔اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے مال میں دنیا میں بھی اضافہ کرتا ہے اور آخرت میں تو سات سو گنا تک بلکہ اس سے بڑھا چڑھا کر اجر عطا ہو گا۔

مالِ حَرام بُوَد بجائے حَرام رفت

اگر چہ بنظر ظاہر سود لینے سے مال بڑھتا اور صدقہ دینے سے گھٹتا نظر آتا ہے ۔لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ۔اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ سود کے مال میں برکت نہیں ہوتی اور مال حرام بود بجائے حرام رفت، والی بات بن جاتی ہے، (یعنی جیسی ناجائز کمائی تھی، ویسی ہی ناجائز مدوں میں خرچ ہو گئی یعنی حرام کا مال جس طریقے (غلط راستے) سے آتا ہے، اسی طریقے سے ضائع ہو جاتا ہے یا بے برکت ہو کر غلط جگہوں پر ہی خرچ ہوتا ہے بہ ظاہر سود سے مال بڑھتا ہے اور صدقہ سے کم ہوتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ صدقہ سے برکت دیتے ہیں، آفتوں سے حفاظت ہوتی ہے، سود خوار کے یہاں بے برکتی ہوتی اور طرح طرح کی آفتیں من جانب اللہ آتی ہیں، اس لئے جتنا مال بڑھتا ہے اس سے زیادہ نقصان ہوتا ہے ۔اور صدقات دینے سے اللہ تعالیٰ ایسی جگہ سے اس کا نعم البدل عطا فرماتا ہے جس کا اسے خود بھی وہم وگمان نہیں ہوتا اور یہ ایسی حقیقت ہے جو بارہا کئی لوگوں کے تجربہ میں آچکی ہے تاہم اسے عقلی دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور دوسری صورت کو علم معیشت کی رو سے ثابت بھی کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے جس معاشرہ میں صدقات کا نظام رائج ہوتا ہے ۔اس میں غریب طبقہ (جو عموماً ہر معاشرہ میں زیادہ ہوتا ہے) کی قوت خرید بڑھتی ہے اور دولت کی گردش کی رفتار

بہت تیز ہو جاتی ہے جس سے خوشحالی پیدا ہوتی ہے اور قومی معیشت ترقی کرتی ہے اور جس معاشرہ میں سود رائج ہوتا ہے وہاں غریب طبقہ کی قوت خرید کم ہوتی ہے اور جس امیر طبقہ کی طرف دولت کو سود کھینچ کھینچ کر لے جا رہا ہوتا ہے۔ اس کی تعداد قلیل ہونے کی وجہ سے دولت کی گردش کی رفتار نہایت سست ہو جاتی ہے جس سے معاشی بحران پیدا ہوتے رہتے ہیں، امیر اور غریب میں طبقاتی تقسیم بڑھ جاتی ہے اور بعض دفعہ غریب طبقہ تنگ آ کر امیروں کو لوٹنا اور مارنا شروع کر دیتا ہے آقا و مزدور میں، امیر اور غریب میں ہر وقت کشیدگی کی فضا قائم رہتی ہے جس سے کئی قسم کے مہلک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے یہ مضمون آخرت کے اعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دنیا کے اعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، یہی ہے مطلب اس حدیث کا جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے مگر انجام کار نتیجہ اس کا قلت ہے۔ آیت کے آخر میں ارشاد ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ یعنی اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو کسی گناہ کا کام کرنے والے کو، اس میں اشارہ فرما دیا ہے کہ جو لوگ سود کو حرام ہی نہ سمجھیں وہ کفر میں مبتلا ہیں اور جو حرام سمجھنے کے باوجود عملاً اس میں مبتلا ہیں وہ گنہگار فاسق ہیں۔ یہاں ناشکرے سے مراد وہ سود خور ہے جس کی پاس اپنی ضروریات سے زائد رقم موجود ہے۔ جیسے وہ اپنے کسی محتاج بھائی کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، نہ اسے صدقہ دینا چاہتا ہے نہ قرض حسنہ دیتا ہے بلکہ الٹا اس سے اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی سود کے ذریعہ کھینچنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ زائد روپیہ اس پر محض اللہ کا فضل تھا اور صدقہ یا قرض دے کر اسے اللہ کے اس فضل کا شکر ادا کرنا چاہیئے تھا۔ مگر اس نے زائد رقم کو سود پر چڑھا کر اللہ کے فضل کی انتہائی ناشکری کی۔ لہٰذا اس سے بڑھ کر بد عملی اور گناہ کی بات اور کیا ہو گی۔

اہل ایمان کے اوصاف اور ان کا انعام

اِنَّ	بیشک	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے

وَعَمِلُوا	اور انہوں نے عمل کئے		الصّٰلِحٰتِ		نیک
وَاَقَامُوا	اور انہوں نے قائم کیا		الصَّلٰوةَ		نماز کو
وَاٰتَوُا	اور ادا کرتے ہیں	الزَّكٰوةَ	زکوۃ	لَهُمْ	اُن کے لیے
اَجْرُهُمْ	اُن کا اجر ہے		عِنْدَ رَبِّهِمْ		ان کے رب کے ہاں
وَلَا	اور نہ	خَوْفٌ	کوئی خوف ہوگا	عَلَيْهِمْ	ان پر
وَلَا هُمْ	اور نہ وہ		يَحْزَنُوْنَ		غمگین ہوں گے۔(277)

اس آیت میں سود لینے والے کے مقابلہ میں اہل ایمان کے اوصاف اور ان کا انعام ذکر کردیا جو سود خور کے اوصاف وحالات اور اس کے حکم کے خلاف اور ضد ہیں ۔یعنی جو حضرات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں اور اس کی کتابوں اور سود کے حرام ہونے پر ایمان لائے اور ان پر جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں، ان کو خوبی کے ساتھ ادا کرتے اور سود کو قطعی طور پر چھوڑتے ہیں اور پانچوں نمازوں کو پورے اہتمام کے کے ساتھ ادا کرتے اور اپنے مالوں کی زکوٰۃ دیتے ہیں تو ان کو اس کا ثواب جنت میں ملے گا اور جب موت کو ذبح اور دوزخ کو بھر دیا جائے گا، ایسے سخت وقت میں ان پر کوئی خوف وہراس نہیں ہوگا۔ یہ آیت درمیان میں اس لئے آئی ہے کہ سود خور کے مقابلہ میں متقی لوگوں کا حال بیان کردیا جائے جیسا کہ قرآن کریم میں جا بجا یہی دستور آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ جہاں اہل دوزخ کا ذکر آیا تو ساتھ اہل جنت کا بھی ذکر کردیا جاتا ہے اور اس کے برعکس بھی ۔اس کے بعد سود کے مضمون کا تسلسل جاری رکھا گیا ہے ۔اس مقام پر بھی مومنوں کی دو انتہائی اہم صفات کا ذکر فرمایا۔ ایک اقامت صلوٰۃ کا جو بدنی عبادات میں سے سب سے اہم ہے ۔دوسرے ایتائے زکوٰۃ کا جو مالی عبادات میں سے سب سے اہم بھی ہے اور سود کی عین ضد بھی۔

ایجابی اور سلبی کا معنیٰ ومفہوم

اسلام کے معاشی نظام کو اگر انتہائی مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس کے دو ہی اجزاء ہیں ۔ ایک سلبی دوسرا ایجابی ۔سلبی پہلو نظام سود کا استیصال ہے اور ایجابی پہلو نظام زکوٰۃ کی ترویج ۔(ایجابی

(Positive): یہ لفظ" ایجاب" سے نکلا ہے،جس کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کا اقرار کرنا، ثابت کرنا، یا مثبت پہلو اختیار کرنا۔یعنی کسی کام کے کرنے یا ہونے کی ترغیب دینا ایجابی پہلو کہلاتا ہے (مثلاً نیکی کرنا، سچ بولنا)۔سلبی (Negative): یہ لفظ"سلب" سے ماخوذ ہے،جس کا لغوی معنی انکار کرنا، چھین لینا یا دور کرنا ہے۔یعنی اس سے مراد کسی چیز سے بچنا، اسے ترک کرنا یا منفی پہلو ہوتا ہے (مثلاً برائی یا جھوٹ سے دور رہنا۔ ہر مکمل ضابطہ حیات میں دو طرح کے احکامات ہوتے ہیں؛ ایجابی (کیا کرنا چاہیے؟) اور سلبی (کیا نہیں کرنا چاہیے؟) کامیابی کے لیے ان دونوں پہلوؤں پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوتا ہے۔)

سود کی حرمت کے نفاذ کے دو طریقے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ	اے وہ لوگو! جو	اٰمَنُوا	ایمان لائے

اتَّقُوا	تم ڈرو	اللّٰهَ	اللہ سے	وَذَرُوْا	اور چھوڑ دو

مَا بَقِیَ	جو جو باقی رہ گیا ہے	مِنَ الرِّبٰوا	سود سے
اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	مُّؤْمِنِیْنَ	ایمان والے (278)

سود کی حرمت کے نفاذ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے دو طریقے بتائے ہیں۔ پہلا طریقہ تو گزشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ یعنی وعظ و نصیحت کے ذریعے سود خور کو سود سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے، اگر وہ اللہ کا حکم مان کر سود سے کنارہ کش ہو جائے تو بہتر ورنہ ایسے لوگ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ہیں۔ان کا گناہ ناقابل معافی ہے هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ یہ دائمی جہنمی ہے۔یعنی یاد رکھو کہ جو حرمت کا حکم اترنے کے بعد بھی سود کھائے گا تو وہ جہنم کا مستحق ہے اور اگر حلال سمجھ کر کھایا تو کافر ہے، ہمیشہ جہنم میں رہے گا کیونکہ کسی بھی حرامِ قطعی کو حلال جاننے والا کافر ہے۔سود کی لعنت سے نجات دلانے کا دوسرا طریقہ تعزیری عمل ہے جو آج کے درس میں بیان کیا گیا ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب کہ حکومت اسلامی ہو اور وہ اسلامی احکام کا نفاذ کرے اور پھر ان کی خلاف ورزی کرنے والوں

کے خلاف تعزیری کارروائی کرے، کسی بھی ملک وقوم کے لیے معاشی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اگر یہ نظام درست ہو جائے، تو لوگوں کے بیشتر دنیوی مسائل حل ہو جاتے ہیں، اسلام کے اقتصادی نظام میں سود ایک بنیادی رخنہ ہے۔ جسے دور کیے بغیر لوگوں کی معاشی حالت درست نہیں ہو سکتی، لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے کہ ملک کو سود کو لعنت سے پاک کرے اور اس راستے میں آنے والے ہر روڑے کو ہٹا دے اور یہ چیز تعزیری قوانین کے ذریعے حاصل ہوگی۔

حکومت وقت کی ذمہ داری

سودی نظام کی بیخ کنی کے لیے حکومت وقت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو حکومت سودی نظام کی سرپرستی کرتی ہے، وہ مٹا دینے کے قابل ہے ورنہ لوگوں کو کبھی سکون نصیب نہیں ہوسکتا۔ فرماتے ہیں کہ زمین میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت اور دوسرے سود کا قلع قمع، سودی نظام کا قیام یہودیت کی سرپرستی ہے۔ ناجائز منافع خوری مخرب اخلاق چیز ہے اور قابل مذمت ہے۔ اسلام نے اس کو مٹانے کا سختی سے حکم دیا ہے، مگر آج کی دنیا میں کتنے ملک ہیں جو سودی نظام سے پاک ہیں؟ ہر ملک کے ہر بینک میں سودی کاروبار ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمان ممالک میں غیر مسلموں کو بھی سودی کاروبار کی اجازت نہیں، غیر مسلموں کے ہاں شراب نوشی جائز ہے، لہٰذا وہ پی سکتے ہیں، مگر اسلامی حکومت میں اس کی تجارت نہیں کر سکتے، اسی طرح وہ سور کا گوشت حلال سمجھ کر کھا سکتے ہیں، مگر سود حرام ہے، وہ نہیں لے سکتے، یہ اتنی بری چیز ہے۔

زمانہ جاہلیت میں طائف میں آباد قبیلہ بنو ثقیف کے کچھ لوگ سودی کاروبار کرتے تھے، مکہ میں آباد بنو مغیرہ والے ثقیف کے مقروض تھے، انہوں نے سود پر روپیہ لے کر رکھا تھا، جب اسلام کی شمع نے خطہ عرب کو منور کیا، تو یہ دونوں قبیلے مسلمان ہو گئے چونکہ بنو ثقیف کی رقم بنو مغیرہ کی طرف واجب الاداء تھی۔ اول الذکر نے اپنی اصل رقم بمعہ سود مطالبہ کیا، تو بنو مغیرہ نے جواب دیا کہ اسلام میں تو سود

کا لین دین جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اب تمہارا دعویٰ درست نہیں ہے۔ آخر معاملہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر مسئلہ حل کر دیا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اور سود کی بقیہ رقم چھوڑ دو، یعنی مطالبہ نہ کرو، اب یہ تمہارے لیے روا نہیں ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ اگر تم فی الحقیقت مومن ہو، یعنی اگر سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہو، تو سود کا خیال قطعاً دل سے نکال دو۔ اسلام میں سود کس درجہ سخت گناہ ہے، وہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ کسی اور گناہ کے بارے میں اس درجہ سخت لب ولہجہ اختیار نہیں کیا گیا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی گروہ سود لینے پر مصر ہو تو اس پر فوج کشی بھی کی جا سکتی ہے؛ کیوں کہ اگر وہ سود کو حرام ہی نہیں سمجھتا تو مرتد ہے، حرام سمجھ کر عمل سے انکار کرتا ہے تو ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم ہے، جیسا کہ فقہاء نے ان لوگوں سے جہاد کا حکم دیا ہے جو اذان یا جماعت کے ترک کرنے پر اتفاق کر لیں، (رد المحتار: ۲/ ۴۹) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حربیوں سے بھی سود لینا جائز نہیں؛ کیوں کہ جن لوگوں پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ کا سود باقی تھا وہ فتح مکہ سے پہلے کے معاملہ پر مبنی تھا اور وہ اس وقت یقیناً حربی تھے، جمہور کا مسلک یہی ہے کہ نہ دارالاسلام میں سود جائز ہے نہ دار الحرب میں، نہ مسلمانوں سے جائز ہے نہ غیر مسلموں سے۔

سود خوری کے خلاف اللہ کا اعلان جنگ/سود کی حرمت اور اس کی مختلف شکلیں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ
رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی
مَیْسَرَۃٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ
فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَ ھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

مسلمان حاکم کا فرض

فَاِنْ	پھر اگر	لَّمْ تَفْعَلُوْا	نہ کیا تم نے (یہ)				
فَاْذَنُوْا	تو خبردار ہو جاؤ	بِحَرْبٍ	جنگ کے لیے				
مِّنَ اللّٰہِ	اللہ سے	وَرَسُوْلِہٖ	اور اس کے رسول (سے)				
وَاِنْ	اور اگر	تُبْتُمْ	تم توبہ کرلو	فَلَکُمْ	تو تمہارے لیے ہیں		
رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ	اصل مال تمہارے	لَا تَظْلِمُوْنَ	نہ تم (کسی پر) ظلم کرو				
وَلَا تُظْلَمُوْنَ	اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔(279)						

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ: "بِحَرْبٍ" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے "بڑی جنگ" ترجمہ کیا گیا ہے۔ یعنی اگر تم نے سود نہ چھوڑا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سے آگاہ اور خبردار ہو جاؤ۔ اور یہ وہ وعید ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے دوسرے کسی جرم کے بارے میں اتنے واضح الفاظ میں نہیں دی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت کی رو سے مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ سودی کاروباری کو ختم کرنے کا انتظام کرے اور اگر سود خوری سے باز نہ آئیں تو پھر ان کے خلاف جہاد کیا جائے۔ یہ سود کی لعنت سے نجات دلانے کا دوسرا طریقہ تعزیری عمل ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب کہ حکومت اسلامی ہو اور وہ اسلامی احکام کا نفاذ کرے اور پھر ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے، کسی بھی ملک وقوم کے لیے معاشی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اگر یہ نظام درست ہو جائے، تو لوگوں کے بیشتر دنیوی مسائل حل ہو جاتے ہیں، اسلام کے اقتصادی نظام میں سود ایک بنیادی رخنہ ہے۔ جسے دور کیے بغیر لوگوں کی معاشی حالت درست نہیں ہوسکتی، لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے کہ ملک کو سود کو لعنت سے پاک کرے اور اس راستے میں آنے والے ہر روڑے کو ہٹا دے اور یہ چیز تعزیری قوانین کے ذریعے حاصل ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یہ بھی فرماتے ہیں کہ مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ سود خور سے توبہ کرائے کہ آئندہ کے لیے سودی کام سے قطعاً دست بردار ہو جائے، اگر اس نے ایسا کرلیا تو معاملہ ختم ہوگیا اور اگر کوئی شخص توبہ سے انکار کرتا ہے، تو حاکم اسے سزا دینے کا پابند ہے، اور یہ سزا سزائے موت بھی ہوسکتی ہے، حضرت حسن بصری اور ابن سیرین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما جو تابعین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اگر سود خور توبہ نہ کرے تو اسلامی نظام کے تحت ایسے شخص کا سر تلوار سے قلم کر دینا چاہئے۔

اب سود لینے والا دو طرح کا ہوسکتا ہے اگر ایسا شخص جو سود کو حرام نہیں سمجھتا، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے اور مرتد سمجھا جائے گا، کیونکہ اس نے اسلام کے ایک قطعی حکم کا انکار کیا ہے، لہٰذا اس کے

خلاف جہاد ضروری ہو جائے گا، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا اور پھر یہ ہے کہ مرتد نے جو مال اسلام کے دور میں کمایا تھا، وہ اس کے مسلمان ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا اور جو مال اس نے ارتداد کے بعد کمایا تھا، وہ اسلامی بیت المال میں جمع ہو جائے گا۔ سود خود کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ اسے حرام تو سمجھتا ہے، مگر لے رہا ہے ایسا شخص دین کا باغی ہے اور ایسے شخص کے خلاف بھی جنگ ضروری ہے۔ آخر میں فرمایا: وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَكُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِكُمۡ اور اگر توبہ کرلو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں، یعنی اگر تم اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے سود کو چھوڑ دو، تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے، وہ تم لے سکتے ہو لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ نہ تم کسی پر زیادتی کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائیگا۔ یعنی اصل مال سے زائد وصول کرو تو یہ تمہارا لوگوں پر ظلم ہوگا اور اگر تمہیں اصل مال بھی نہ ملے تو یہ لوگوں کا تم پر ظلم ہوگا اور یہ دونوں چیزیں ہی انصاف کے خلاف ہیں۔ (ابن کثیر)

مقروض تنگدست کو مہلت دینے کی فضیلت

وَاِنۡ	اور اگر	كَانَ	ہو (مقروض)	ذُوۡ عُسۡرَةٍ	تنگدست
فَنَظِرَةٌ	تو مہلت دینا ہے (اُسے)		اِلٰى مَيۡسَرَةٍ		آسانی تک
وَاَنۡ	اور اگر	تَصَدَّقُوۡا	تم (قرض) معاف کردو	خَيۡرٌ	بہت بہتر ہے
لَّكُمۡ	تمہارے لیے	اِنۡ	اگر	كُنۡتُمۡ	ہو تم
تَعۡلَمُوۡنَ			جانتے۔ (280)		

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ اور اگر مقروض تنگدست ہے وعدہ کے مطابق قرض واپس نہیں کرسکتا جاہلیت میں قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں سود در سود سے اصل رقم میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، جس سے تھوڑی سی رقم ایک پہاڑ بن جاتی اور اس کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی، آج کل بھی یہی حال ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کوئی تنگدست ہو تو (سود تو درکنار) آسانی تک اسے مہلت دو اور اگر قرض بالکل معاف کردو تو زیادہ اچھا ہے۔ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ تو اسے آسودگی تک مہلت

دے دینی چاہیے۔ محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ آیت کی رو سے تنگ دست کو مہلت دینا واجب ہو جاتا ہے اور اگر مقروض جان بوجھ کو ٹال مٹول کرتا ہے، تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے، کیونکہ سرمایہ موجود ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرنا اور قرض کی ادائیگی سے اعراض کرنا ظلم کے مترادف ہے، اور ظالم شخص تعزیر کا مستحق ہوتا ہے، لہٰذا اگر شبہ ہو کہ مقروض کے پاس مال موجود ہے مگر ادا نہیں کرتا تو قرض خواہ عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے اور حاکم ایسے مقروض کو قید میں ڈال سکتا ہے اگر اس کے پاس مال موجود ہے تو قرضہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے گا اور اگر عدالت کو یقین ہو جائے کہ یہ شخص قرضہ لوٹانے کے قابل نہیں ہے تو اسے مہلت دی جا سکتی ہے۔ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ اگر مقروض اس قدر مفلوک الحال ہے کہ قرضہ ادا کرنے کے قابل نہیں، تو ایسی حالت میں قرضہ بالکل معاف کر دینا ہی بہتر ہے۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ اگر تم کچھ جانتے ہو۔ بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے جس نے تنگ دست مقروض کو مہلت دی اسے بالکل معاف ہی کر دیا، تو فرمایا نبی ﷺ نے کہ قیامت کے دن ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہوگا۔ اور وہ ایسا دن ہوگا جس دن عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

اسلامی نظامِ معیشت کا بنیادی مقصد

اسلامی نظامِ معیشت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں محدود نہ رہے بلکہ معاشرتی ضرورتوں کے مطابق گردش کرتی رہے۔ سودی نظام اس مقصد کے الٹ ہے، یہ دولت کو محدود ہاتھوں میں مرکوز کر دیتا ہے۔ اس نظام میں دولت محنت کرنے والوں سے نکل کر مالداروں کے قبضے میں آجاتی ہے۔ غریب قرض دار مزید مقروض ہو جاتا ہے جبکہ امیر اور طاقتور مزید امیر بنتے جاتے ہیں۔ یہی طبقاتی تقسیم معاشرتی بے سکونی اور بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کا فلسفیانہ جواب ان الفاظ میں دیا: ” اور جو تم سود دیتے ہو تا کہ لوگوں کے مال میں بڑھ جائے، وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ تم دیتے ہو اللہ کی خوشنودی چاہنے کو، وہی لوگ مالوں کو بڑھانے والے ہیں۔

قرآن پاک کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت

وَاتَّقُوْا	اور تم ڈرو	يَوْمًا	اُس دن سے					
تُرْجَعُوْنَ	(کہ) تم لوٹائے جاؤ گے	فِيْهِ	اس میں					
اِلَى اللّٰهِ	اللہ کی طرف	ثُمَّ	پھر	تُوَفّٰى	پورا (بدلہ) دیا جائیگا			
كُلُّ نَفْسٍ	ہر نفس کو	مَّا	(اُس کا) جو کچھ					
كَسَبَتْ	اس نے کمایا	وَهُمْ	اور وہ	لَا يُظْلَمُوْنَ	نہیں ظلم کیے جائیں گے			

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ اس دن سے ڈر جاؤ، جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے یعنی قیامت کا دن آنے والا ہے۔ وہاں پر ہر شخص کا محاسبہ ہوگا ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائیگا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا کے زوال پذیر ہونے اور اس کے اموال وغیرہ کے فانی ہونے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور ہر عمل کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا ہونے کے ساتھ نصیحت فرمائی ہے۔ (ابن کثیر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "قرآن میں سب سے آخر میں جو آیت اتری وہ یہی ہے۔" (السنن الکبریٰ للنسائی)

سود کی بعض قسمیں

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ سودی نظام محنت کرنے والے کو کمزور اور بغیر محنت نفع اٹھانے والے کو غالب بنا دیتا ہے، جس سے عدل ختم اور ظلم کا راج قائم ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ" اگر سود کے معاملے میں شک بھی ہو تو اسے چھوڑ دینا ایمان کی سلامتی کے لیے بہتر ہے۔" موجودہ دور میں سود نے اپنی صورت بدل لی ہے۔ بینکنگ، انشورنس، قرضہ جاتی ادارے، کرنسی مارکیٹیں، سب اسی زہریلے نظام کے مختلف روپ ہیں۔ نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ جس کمائی میں بلا محنت نفع، مدت کے بدلے اضافہ یا قرض پر مشروط زیادتی ہو، وہ ہر حال میں سود ہے خواہ اسے "انٹرسٹ"، "پرافٹ" یا" سروس چارج" کہا جائے۔ سود ایک چیز کو دوسرے کے

مقابلے میں زیادہ دے کر فروخت کرنا ہے۔فقہاء نے اس کا قاعدہ کلیہ یہ بتایا ہے کہ وہ تمام اجناس، جن میں کیلی یعنی ناپ، وزن اور خوراک" تینوں صفات میں سے کوئی دو صفتیں پائی جائیں، ان کا آپس میں لین دین یا خرید وفروخت کسی ایک کو زیادہ کر کے جائز نہیں ("کیلی" اور" وزنی "فقہی اور تجارتی اصطلاحات ہیں جن کا تعلق اشیاء کی خرید وفروخت اور پیمائش سے ہے)۔جن چیزوں میں یہ تینوں صفات معدوم ہوں، یاان کی جنس مختلف ہو، تو پھر کسی کی زیادتی سود نہیں ہوگی، جیسا کہ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:" سونا سونے کے بدلے ، چاندی چاندی کے بدلے، گیہوں گیہوں کے بدلے، جو جو کے بدلے اور کھجور کھجور کے بدلے، برابر بیچنا جائز ہے، لیکن ان میں سے کسی ایک کو گھٹا بڑھا کر بیچنا یا دینا سود ہے"۔(مسلم، احمد) اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز جتنی دی جائے اتنی ہی واپس لینی چاہیئے، جتنا سونا یا چاندی دی ہو، یا جتنا روپیہ دیا ہو، اتنا ہی واپس لینا چاہیئے، اصل مال پر کچھ زائد رقم کا لینا، چاہے وہ رقم کم ہو یا زیادہ، سود ہے۔

مضاربہ، مشارکہ، مرابحہ اور اجارہ کا مختصر اور جامع مفہوم

اسلام نے اس ظلم کے مقابلے میں ایک متوازن، شفاف اور عادلانہ نظام دیا۔مضاربہ، مشارکہ، مرابحہ اور اجارہ جیسے اصولوں میں نفع ونقصان دونوں فریقوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔کوئی کسی پر ظلم نہیں کرتا، نہ کوئی بلا وجہ فائدہ اٹھاتا ہے۔

1: مضاربہ ایک ایسا کاروباری معاہدہ ہے جس میں ایک فریق اپنا سرمایہ فراہم کرتا ہے (جسے رب المال کہتے ہیں۔ربّ المال کا معنیٰ:" مال کا مالک" یا سرمایہ کار۔اس کا مفہوم: اسلامی تجارتی معاہدوں (خاص طور پر مضاربت) میں اس شخص یا فریق کو ربّ المال کہا جاتا ہے جو کاروبار کے لیے سرمایہ فراہم کرتا ہے) اور دوسرا فریق اپنی محنت، مہارت اور انتظامی صلاحیتیں لگاتا ہے (جسے' مضاربہ کہتے ہیں)۔نفع (Profit) دونوں کے درمیان پہلے سے طے شدہ تناسب سے تقسیم ہوتا ہے، جبکہ نقصان (Loss) کی صورت میں صرف سرمایہ دار کا مالی نقصان ہوتا ہے اور محنت کرنے والے کی محنت ضائع جاتی ہے۔2. مشارکہ ایک قسم کی شراکت داری ہے۔اس میں دو

یا دو سے زائد افراد مل کر سرمایہ لگاتے ہیں۔تمام فریقین کاروبار میں حصہ لیتے ہیں اور نفع باہمی رضامندی سے طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔نقصان کی صورت میں ہر فریق اپنے لگائے گئے سرمائے کے تناسب سے نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے۔3 مرابحہ دراصل ایک طے شدہ منافع پر فروخت کا نام ہے۔اس میں فروخت کنندہ (جیسے بینک) خریدار کو اپنی لاگت (خریداری کی قیمت) بتا دیتا ہے اور اس پر ایک متعین منافع (Profit margin) جوڑ کر شے کی حتمی قیمت فروخت طے کرتا ہے۔اسلامی بینکاری میں یہ طریقہ عام طور پر قسطوں پر اشیاء کی خریداری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔4 اجارہ کے لغوی معنیٰ "کرایہ پر دینے" کے ہیں۔اسلامی فقہ میں یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں کوئی شخص اپنی کسی چیز (جیسے مکان، گاڑی، یا مشینری) کا منافع یا استعمال ایک مخصوص مدت کے لیے معاوضہ (کرایہ) لے کر دوسرے شخص کے حوالے کر دیتا ہے،لیکن اس چیز کی اصل ملکیت مالک ہی کے پاس رہتی ہے۔

یہ نظام عدل وتعاون پر مبنی ہے،جو اصل میں انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔آج کا عالمی مالیاتی نظام سود پر قائم ہے۔اسی نے ترقی پذیر اقوام کو قرضوں کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔عالمی بینک اور سودی ادارے غریب ممالک سے ان کے وسائل نچوڑ رہے ہیں۔سود کا یہ عالمی جال ایک ایسی زنجیر ہے جو قوموں کے بازوؤں سے محنت کا حق چھین کر غلامی کے طوق پہنا دیتی ہے۔اسلام چاہتا ہے کہ انسان دولت کا مالک نہیں بلکہ امانت دار بنیں۔سودی نظام انسان کو مال کا غلام بنا دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سود کو صرف ایک مالی گناہ نہیں بلکہ اللہ عزوجل اور رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کے مترادف قرار دیا۔سود وہ آگ ہے جو بظاہر کمائی دکھتی ہے مگر دراصل ایمان، اخلاق اور برکت کو جلا دیتی ہے۔اس آگ کی لپیٹیں صرف فرد تک محدود نہیں بلکہ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی نظاموں کو سود سے پاک کریں۔اپنے گھروں، کاروباروں اور قومی اداروں میں حلال اور پاکیزہ مالی اصول اپنائیں۔سود سے بچنا صرف ایک دینی فریضہ نہیں بلکہ ایمان کی حفاظت ہے۔جو قوم سود چھوڑ دیتی ہے، اللہ

اس کے رزق میں برکت عطا فرماتا ہے۔اسلامی نظامِ معیشت میں سکون، عدل اور خیر ہے،جبکہ سودی نظام میں اضطراب،ظلم اور بے برکتی۔ہمیں وہ نظام اختیار کرنا ہے جو انسان کو خدا کے قریب کرے، نہ کہ اس کے غضب کے قریب۔سود سے پاک معیشت ہی حقیقی اسلامی زندگی اور قوموں کی آزادی کا ضامن ہے۔

عصرِ حاضر میں ہم کیا کریں؟

عصرِ حاضر کی پوری دنیا کے علماء پر مشتمل اہم تنظیم ''مجمع الفقه الاسلامي'' کی اس موضوع پر متعدد میٹنگیں ہو چکی ہیں، مگر ہر میٹنگ میں اس کے حرام ہونے کا ہی فیصلہ ہوا ہے۔برِصغیر کے جمہور علماء بھی اس کے حرام ہونے پر متفق ہیں کہ موجودہ بینکنگ کا نظام بھی واضح سود پر مبنی ہے۔سیونگ اکاؤنٹ اور پی ایل ایس تو واضح سود ہیں، کرنٹ اکاؤنٹ میں اگرچہ سود نہیں دیا جاتا مگر بنک وہ رقم آگے سود پر چلاتا ہے، آج کل اسلامی بینکنگ کا بہت شور ہے مگر علماء نے،جن میں حنفی علماء بھی شامل ہیں،اسے سودی حیلہ پر مبنی قرار دیا ہے۔بیمہ (انشورنس) بھی سود اور جوئے کا مرکب ہے۔اسی طرح انعامی بانڈ بھی سود اور جوئے کا مرکب ہے۔

1:-اگر کوئی شخص بینک سے قرض لینے یا جمع شدہ رقم پر سود کے جائز ہونے کو کہے تو پوری دنیا کے 99.99٪ علماء کے موقف کو سامنے رکھ کر اس سے بچیں۔

2:-اس بات کو اچھی طرح ذہن میں رکھیں کہ علماء کرام نے قرآن وحدیث کی روشنی میں بینک سے قرض لینے اور بینک میں جمع شدہ رقم پر Interest کی رقم کے حرام ہونے کا فیصلہ آپ سے دشمنی نکالنے کے لیے نہیں، بلکہ آپ کے حق میں کیا ہے، کیونکہ قرآن وحدیث میں سود کو بہت بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔شراب نوشی،خنزیر کھانے اور زناکاری کے لیے قرآن کریم میں وہ لفظ استعمال نہیں کیے گئے جو سود کے لیے اللہ تعالیٰ نے استعمال کیے ہیں۔

3:-جس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اُمتی ہونے پر ہم فخر کرتے ہیں، اس نے سود لینے اور دینے والوں پر لعنت فرمائی ہے، نیز شک وشبہ والی چیزوں سے بھی بچنے کی تعلیم دی ہے۔

4:- بینک سے قرضہ لینے سے بالکل بچیں، دنیاوی ضرورتوں کو بینک سے قرضہ لیے بغیر پورا کریں، کچھ دشواریاں، پریشانیاں آئیں تو اس پر صبر کریں۔

5:- اگر کوئی شخص ایسے ملک میں ہے جہاں واقعی سود سے بچنے کی کوئی شکل نہیں ہے، تو اپنی وسعت کے مطابق سودی نظام سے بچے، ہمیشہ اس سے چھٹکارہ کی فکر رکھے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا رہے۔

6:- جو حضرات سود کی رقم استعمال کر چکے ہیں، وہ پہلی فرصت میں اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور آئندہ سود کی رقم کا ایک پیسہ بھی نہ کھانے کا عزمِ مصمم کریں اور سود کی بقیہ رقم کو کسی مستحق زکوٰۃ کو بلانیتِ ثواب دے دیں۔

7:- اگر کوئی شخص سونے کے پرانے زیورات بیچ کر سونے کے نئے زیورات خریدنا چاہتا ہے، تو اس کو چاہیے کہ دونوں کی الگ الگ قیمت لگوا کر اس پر قبضہ کرے اور قبضہ کرائے، نئے سونے کے بدلے پرانے سونے اور فرق کو دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ بھی سود کی ایک شکل ہے۔

ایک اہم نکتہ

دنیا کی بڑی بڑی اقتصادی شخصیات کے مطابق موجودہ سودی اور بینکنگ کے نظام سے صرف اور صرف سرمایہ کاروں کو ہی فائدہ پہنچتا ہے، نیز اس میں بے شمار خرابیاں ہیں۔

بعض مادہ پرست لوگ سود کے جواز کے لیے دلیل دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں وارد سود کی حرمت کا تعلق ذاتی ضرورت کے لیے قرض لینے سے ہے، لیکن تجارت کی غرض سے سود پر قرض لیا جاسکتا ہے، اسی طرح بعض مادہ پرست لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں جو سود کی حرمت ہے، اس سے مراد سود پر سود ہے، لیکن Single سود قرآن کے اس حکم میں داخل نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن میں کسی شرط کو ذکر کیے بغیر سود کی حرمت کا اعلان کیا گیا ہے تو قرآن کے اس عموم کو مختص کرنے کے لیے قرآن وحدیث کی واضح دلیل درکار ہے جو قیامت تک پیش نہیں کی جاسکتی، اسی لیے خیر القرون سے آج تک کسی بھی مشہور مفسر نے سود کی حرمت والی آیت کی تفسیر اس طرح نہیں کی نیز

قرآن میں سود کی حرمت کے اعلان کے وقت ذاتی اور تجارتی دونوں غرض سے سود لیا جاتا تھا، اسی طرح ایک مرتبہ کا سود یا سود پر سود دونوں رائج تھے، 1400 سال سے مفسرین ومحدثین وعلماء کرام نے دلائل کے ساتھ اسی بات کو تحریر فرمایا ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ قرآن کریم میں شراب پینے کی حرمت اس لیے ہے کہ اُس زمانہ میں شراب گندی جگہوں میں بنائی جاتی تھی، آج صفائی ستھرائی کے ساتھ شراب بنائی جاتی ہے، حسین بوتلوں میں اور خوبصورت ہوٹلوں میں ملتی ہے، لہٰذا یہ حرام نہیں ہے۔ ایسے دنیا پرست لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے۔ آخر میں یاد دہانی کیلئے سود کی تباہ کاریوں پر ایک نظر پھر فرما لیجئے: 1۔ سود خور، اللہ کی رحمت سے دور، اور وہ اللہ اور اس کے رسول اسے حالت جنگ میں رہتا ہے۔ 2۔ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی کبیرہ گناہ کے مرتکب کو وہ دھمکی نہیں دی اور اس عذاب کا وعدہ نہیں کیا جو سود خور کے لئے کیا ہے۔ 3۔ سود ایک اجتماعی جرم ہے، وہ جس معاشرے میں رواج پا جائے گا اسے تباہ و برباد کردے گا اور اس کی (اقتصادی) بنیادوں کو منہدم کردے گا، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جن غریب ممالک نے عالمی بینکوں سے سے قرض لیا ہے وہ سود در سود ادا کرتے کرتے تباہ ہو گئے، لیکن قرض بدستور برقرار ہے۔ 4۔ سود کھانے والے شخص کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ" حرام کا ایک لقمہ کھانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے کی چالیس دن کی عبادت قبول نہیں فرماتا"۔ (ترمذی) نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:" اگر کوئی شخص ایسا لباس پہنتا ہے جس میں نو درہم تو حلال کے ہیں اور ایک درہم حرام کا ہے تو یہ لباس جب تک اسکے جسم پر رہے گا اللہ تعالیٰ اس کی کسی عبادت کو قبول نہیں فرماتا"۔ (ابن ماجہ) 5 اللہ تعالیٰ کبھی کبھی کافر اور مشرک کی دعا بھی قبول کرلیتا ہے، لیکن اس کی بارگاہ میں سود خور کی دعا تک قبول نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہماری سود سے حفاظت فرمائے، اور قرآنی احکام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے آمین

قرض کا اسلامی تصور اور موجودہ دور کی خرابیاں/ قرض لینے کے احکام وآداب

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ
وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ
فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ
فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ
وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ

"آيَةُ الْمُدَايَنَةِ" قرآن کی سب سے لمبی آیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ	اے وہ لوگو! جو	اٰمَنُوْٓا	ایمان لائے ہو!	اِذَا	جب
تَدَايَنْتُمْ	تم آپس معاملہ کرو	بِدَيْنٍ	ادھار کا		
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى	ایک وقت مقررہ تک	فَاكْتُبُوْهُ	تو اسے لکھ لیا کرو		
وَلْيَكْتُبْ	اور چاہیئے کہ لکھ دے	بَّيْنَكُمْ	تمہارے درمیان		
كَاتِبٌۢ	ایک کاتب	بِالْعَدْلِ	انصاف کے ساتھ		

وَلَا يَأْبَ	اور نہ انکار کرے	كَاتِبٌ	کاتب				
اَنْ	(اس سے) کہ	يَّكْتُبَ	وہ لکھے	كَمَا	جس طرح		
عَلَّمَهُ اللّٰهُ	اُسے اللہ نے سکھایا	فَلْيَكْتُبْ	و چاہیئے کہ وہ لکھے				
وَلْيُمْلِلِ	اور چاہیئے کہ وہ لکھاتا جائے	الَّذِيْ	وہ شخص جو				
عَلَيْهِ	اس پر	الْحَقُّ	حق (قرض) ہے				
وَلْيَتَّقِ	اور چاہیئے کہ وہ ڈرے	اللّٰهَ	اللہ سے				
رَبَّهٗ	جو اُس کا رب ہے	وَلَا	اور نہ	يَبْخَسْ	کم کرے		
مِنْهُ	اس میں سے	شَيْـًٔا	کوئی چیز	فَاِنْ	پھر اگر		
كَانَ	ہے	الَّذِيْ	وہ شخص	عَلَيْهِ الْحَقُّ	اس پر حق (قرض) ہے		
سَفِيْهًا	بے وقوف	اَوْ	یا	ضَعِيْفًا	کمزور	اَوْ	یا
لَا يَسْتَطِيْعُ	نہیں وہ استطاعت رکھتا	اَنْ	(اس بات کی) کہ				
يُّمِلَّ هُوَ	لکھوائے وہ خود	فَلْيُمْلِلْ	تو چاہیئے کہ لکھوائے				
وَلِيُّهٗ	اس کا سرپرست	بِالْعَدْلِ	انصاف کے ساتھ				

اسلام پورے عالم کے لیے رحمت ہے، اس کی عالمی تعلیمات میں سے ایک بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر انسان وہ ہے، جو دوسروں کے لیے مفید اور کام آنے والا ہو، اسی لیے اسلام میں آپسی تعاون کی بہت تاکید کی گئی ہے، "قرض" بھی آپسی تعاون کی ایک قدیم شکل ہے، ہر انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس کی ضرورت پیش آجاتی ہے؛ لہٰذا اسلام نے اس کی بہت ترغیب بھی دی ہے اور قرض دینے والے کے لیے بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے اور قرض کے لین دین کے لیے بہت سے حدود اور احکام بیان فرمائے ہیں؛ تاکہ نہ کوئی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے اور نہ کوئی کسی شریف انسان کو پریشان کرسکے۔ ارشاد ہوتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ: اس آیت کو "آيَةُ الدَّيْن" یا "آيَةُ الْمُدَايَنَةِ" کہا جاتا ہے۔ یہ قرآن کی

سب سے لمبی آیت ہے جس میں ادھار سے تعلق رکھنے والے معاملات کو ضبط تحریر میں لانے کی ہدایات دی جا رہی ہے۔ مثلاً جائیدادوں کے بیع نامے، بیع سلم کی تحریر یا ایسے تجارتی لین دین کی تحریر جس میں پوری رقم یا اس کا کچھ حصہ ابھی قابل ادائیگی ہو۔ تاکہ بعد میں اگر کوئی نزاع پیدا ہو تو یہ تحریر شہادت کا کام دے سکے اور یہ حکم استحباباً ہے واجب نہیں، ہمارے ہاں آج کل ایسی تحریروں کے سند یافتہ ماہرین موجود ہیں جنہیں وثیقہ نویس کہا جاتا ہے۔ وثیقہ نویس تقریباً انہی اصولوں کے تحت سرکاری کاغذات پر ایسے معاہدات لکھ دیتے ہیں اور چونکہ یہ ایک مستقل فن اور پیشہ بن چکا ہے۔ لہٰذا ان کے انکار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ الا یہ کہ معاملہ میں کوئی قانونی سقم ہو۔ جب سود حرام کیا گیا تو قرض کا صحیح طریقہ بیان کرنا ضروری تھا، چنانچہ وہ اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور اصولی طور پر تین باتیں ضروری قرار دی ہیں، ایک اسے لکھ لینا، دوسری مدت مقرر کر لینا، تیسری گواہ بنا لینا۔ عموماً لوگ ادھار یا قرض کے معاملے میں تحریر کو معیوب اور باہمی بے اعتمادی کی علامت سمجھتے ہیں، آیت کے آخر میں اس کی حکمت بیان فرما دی گئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف والی، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی اور ہر قسم کے شک وشبہ سے بچانے والی چیز ہے۔ اس بنا پر ایسے معاملات میں اس قسم کی احتیاط مناسب ہے، تاکہ آئندہ جھگڑا پیدا نہ ہو سکے۔ (ابن کثیر)

قرض چکانے کے لئے ادھار میں معاملہ کرنے کا حکم

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى جب تم کسی خاص مدت تک ادھار کا معاملہ کرو فَاكْتُبُوْهُ پس اس کو لکھ لیا کرو۔ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ اور چاہئے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے کیونکہ قلم کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ بسا اوقات اسکی وجہ سے بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لہٰذا کاتب کے لیے ضروری ہے کہ لکھنے والے کو عادل (قابل اعتماد) ہونا چاہیے۔ تاکہ اس کی تحریر پر اعتبار کیا جا سکے۔ فاسق کے نہ قول کا اعتبار ہے نہ لکھنے کا۔ لکھنے والے پر فرض ہے کہ فریقین کے درمیان انصاف سے کام لے۔ وہ رشتہ داری، دوستی وغیرہ کی وجہ سے کسی ایک فریق کی طرف مائل نہ ہو وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ " کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے

انکار نہ کرے" یعنی جس پر اللہ نے یہ احسان کیا ہے کہ اسے لکھنے کا علم عطا فرمایا ہے، اسے بھی اللہ کے ان بندوں پر احسان کرنا چاہیے جو اس سے لکھوانے کے محتاج ہیں ۔لہٰذا ان کو لکھ کر دینے سے انکار نہ کرے ۔کاتب کو حکم ہے کہ صرف وہی چیز لکھے، جس کو وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ حق ہے ۔ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا اور کوئی لکھنے والا اس سے انکار نہ کرے کہ لکھے جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے، سو اسے لازم ہے کہ لکھ دے اور وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق (قرض) ہو، اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے یعنی معاہدہ کی املا اس شخص کو کروانی چاہیئے جو مقروض ہو کیونکہ ادائیگی کا بار اس کے سر پر ہے ۔پھر اگر وہ شخص جس کے ذمے حق (قرض) ہے، بے سمجھ یا کمزور ہے، یا وہ طاقت نہیں رکھتا کہ خود لکھوائے تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے ۔ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ پھر اگر وہ شخص جس کے ذمے حق (قرض) ہے، بے سمجھ یا کمزور ہے، یا وہ طاقت نہیں رکھتا کہ خود لکھوائے تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے ۔بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لکھوانے والا اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ درست طریقے سے دستاویز تیار کروا سکے ایسی صورت کے متعلق فرمایا یعنی اگر مقروض جسے دستاویز لکھوانے کا حق ہے، بے عقل ہے یا ضعیف ہے ۔ یا تحریر کروانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مقصد یہ کہ اس میں کوئی ایسی فطری کمزوری ہے جسکی بنا پر وہ درست تحریر کروانے سے قاصر ہے ۔ایسا کم عقل ہے کہ معاملے کو سمجھتا نہیں یا بہت کمزور یا بوڑھا ہے کہ حواس درست نہیں یا زبان نہ جاننے کی وجہ سے لکھانے کی استطاعت نہیں رکھتا ،تو فرمایا هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ، اس کے ترجمان، ولی، سرپرست، نمائندہ یا وکیل کی ذمہ داری ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ تحریر مکمل کرا دے اور کسی قسم کی رو رعایت نہ کرے ۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مقروض کو حکم دیا ہے کہ وہ کاتب کو لکھوائے، جب وہ اس کے اقرار کے مطابق لکھے گا تو اس کا مضمون اور اس کے نتائج بھی معتبر ہوں گے ۔

انسانی معاشرے میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ضرورتوں کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے،

اسی سلسلے میں قرض بھی انسانی ضروریات میں سے ہے۔اس کے احکام وآداب شریعت اسلامی میں بہت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں،حتیٰ کہ قرآن کریم کی مذکورہ سب سے بڑی آیت قرض کے لین دین کے ہی احکام وآداب کے بارے میں نازل ہوئی ہے،اس سے اس معاملے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انہی احکام وآداب میں سے اس آیت کی روشنی میں چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

قرض لینے کے احکام وآداب

1-بلا مجبوری قرضہ لینا ناپسندیدہ ہے:

شریعت بغیر کسی شدید مجبوری کے قرض لینے کو اچھا نہیں سمجھتی،لہٰذا جب کوئی معقول اور جائز ضروری حاجت قرض لیے بغیر پوری نہ ہو رہی ہو،تب قرض لینا چاہیے۔(واضح رہے کہ شدید مجبوری میں بھی سودی قرضہ لینے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔)

2-قرض لیتے وقت آپس میں تحریری معاہدہ کرنا۔

دو گواہوں کی موجودگی میں قرض کا معاہدہ لکھ لیا جائے،جس میں قرض خواہ اور قرض دھندہ کا مکمل تعارف ہو،قرض کی رقم لکھی ہو،کتنی مدت کے لیے قرض دیا جارہا ہے،یہ بات طے ہو اور واپسی کی تاریخ بھی متعین ہو،تاکہ کل کو اس بارے میں جھگڑا نہ ہو،لیکن چونکہ قرضہ فی نفسہ تبرع (احسان کا معاملہ) ہے،لہٰذا واپسی کی تاریخ متعین ہونے کے باوجود قرض دھندہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہے،اگر وہ اپنے طور واپسی کی تاریخ ہی کی پابندی کرتا ہے اور اس سے قبل مطالبہ نہیں کرتا تو یہ اس کا دوسرا تبرّع ہے۔(تبرّع معنیٰ:ہدیہ کرنا،عطیہ دینا یا احسان کرنا مفہوم:شرعی اصطلاح میں تبرّع سے مراد ایسا مالی لین دین یا عمل ہے جس میں کوئی شخص بغیر کسی معاوضے،بدلے یا شرط کے اپنی خوشی سے کسی دوسرے کو فائدہ پہنچائے)

3-قرض خواہ کی ذمہ داری:

قرض لے کر اسے واپس ادا کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے اور اس سلسلے میں مکمل ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے،یہی وجہ ہے کہ شریعت نے قرض دہندہ کے مال کے تحفظ کے لیے

مقروض سے کوئی چیز لے کر گروی رکھنے کی بھی اجازت دی ہے، لہذا قرضہ لینے سے پہلے واپسی کے امکانات کا جائزہ لینا ضروری، صرف دوسرے کو جھوٹا آسرا دینا اور وعدے پر وعدہ کرنا، آپس میں نفرت کو جنم دیتا ہے، اگر واپسی کا بظاہر کوئی امکان نہ ہو تو قرض دہندہ سے واضح طور پر کہہ دینا چاہیے: کہ میری مالی حالت یہ ہے، تاکہ وہ سوچ سمجھ کر قرض دینے کا فیصلہ کرے۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ شہید کے تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، مگر کسی کا قرضہ معاف نہیں کرتا۔ (صحیح مسلم)

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی سے اس نیت سے قرض لے کہ وہ اس کو ادا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے قرض کی ادائیگی کے لئے آسانی پیدا کرتا ہے اور اگر قرض لیتے وقت اس کا ارادہ ہڑپ کرنے کا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی طرح کے اسباب پیدا کرتا ہے جس سے وہ مال ہی برباد ہو جاتا ہے۔ (صحیح البخاری)

4- مقروض باوجود قدرت کے ٹال مٹول نہ کرے۔

جو لوگ قرض کی واپسی پر قدرت رکھنے کے باوجود اس میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں احادیث میں سخت وعید آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی شخص اس نیت سے قرض لیتا ہے کہ وہ اس کو بعد میں ادا نہیں کرے گا، تو وہ چور کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ (سنن ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرض کی ادائیگی پر قدرت کے باوجود وقت پر قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔ (صحیح بخاری ومسلم)

قرض کی ادائیگی پر قدرت کے باوجود قرض کی ادائیگی نہ کرنے والا ظالم وفاسق ہے۔ (شرح النووی لصحیح المسلم، فتح الباری شرح صحیح البخاری)

ذیل میں قرض دینے کے چند احکام ومسائل لکھے جاتے ہیں:

قرض دینے کی فضیلت:

قرآن وحدیث میں محتاج لوگوں کی مدد کرنے کی ترغیب آئی:

ترجمہ: بھلائی کے کام کروتا کہ تم کامیاب ہوجاؤ۔(سورہ الحج ۷۷)

ترجمہ: اچھے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔(سورہ المائدہ ۲)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس شخص نے کسی مسلمان کی کوئی بھی دنیاوی پریشانی دور کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پریشانیوں کو دور فرمائے گا۔جس نے کسی پریشان حال آدمی کے لئے آسانی کا سامان فراہم کیا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیاو آخرت میں سہولت کا فیصلہ فرمائے گا۔اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندہ کی مدد کرتا ہے، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے۔(صحیح مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کو دومرتبہ قرضہ دیتا ہے تو ایک بار صدقہ ہوتا ہے۔(نسائی، ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شب معراج میں میں نے جنت کے دروازہ پر صدقہ کا بدلہ 10 گنا اور قرضہ دینے کا بدلہ 18 گنا لکھا ہوا دیکھا۔میں نے کہا اے جبرئیل! قرض صدقہ سے بڑھ کر کیوں؟ جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ سائل مانگتا ہے، جبکہ اس کے پاس کچھ مال موجود ہو، اور قرضدار ضرورت کے وقت ہی سوال کرتا ہے۔(سنن ابن ماجہ)

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں کسی مسلمان کو 2 دینار قرض دوں، یہ میرے نزدیک صدقہ کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔(کیونکہ قرض کی رقم واپس آنے کے بعد اسے دوبارہ صدقہ کیا جاسکتا ہے یا اسے بطور قرض کسی کو دیا جاسکتا ہے، نیز اس میں واقعی محتاج کی ضرورت پوری ہوتی ہے)۔(السنن الکبری للبیہقی)

1- قرض دینے والے کو قرض پر کسی قسم کا نفع لینا ناجائز ہے۔

2- تنگ دست مقروض کو مہلت دینا بھی اجروثواب کا باعث ہے۔

لہٰذا ہمیں جہاں معاشرے میں پریشان حال لوگوں کی مدد کرنی چاہیے، ضرورت کے موقع پر قرض یا کسی صورت سے ان کا تعاون کرنا چاہیے، انتظام نہ ہونے کی شکل میں قرض کی واپسی میں سختی

سے کام نہیں لینا چاہیے، وہیں قرض لینے والے کو چاہیے کہ وہ جلد از جلد قرض واپس کرنے کی فکر میں رہے، بلا ضرورت ٹال مٹول نہ کرے، بلکہ اچھے انداز سے قرض واپس کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کے موقع پر حضرت عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی سے تیس یا چالیس ہزار قرض لیے تھے، پھر جب حنین سے واپس تشریف لائے تو قرض واپس فرمایا اور انہیں دعائیں بھی دیں اور فرمایا کہ قرض کا بدلہ یہ ہے کہ پورے طور پر اسے ادا کیا جائے اور قرض دینے والے کی تعریف بھی کی جائے۔ ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض دینے والے کو اس کے اونٹ سے بہتر اونٹ واپس دیتے ہوئے فرمایا: تم میں بہتر وہ شخص ہے جو اچھے انداز سے قرض ادا کرے۔ اے کاش کہ ہم بھی ان بہترین تعلیمات پر عمل کر کے ایک پرسکون معاشرہ کی تشکیل میں اپنے حصہ کا کردار ادا کرتے!

قرض نادہندگی کے مسائل اور ان کا شرعی حل/ لوگوں کے قرض لینے کی چند بڑی وجوہات

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ
وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا
الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ
كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ
اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا
تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ وَاِنْ
تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ﴿٢٨٢﴾

قرض کے معاہدہ کو تحریر کیا جائے/گواہ بنانے کی حکمت

وَاسْتَشْهِدُوْا	اور تم گواہ بنالو	شَهِيْدَيْنِ	دو گواہ
مِنْ رِّجَالِكُمْ	اپنے (مسلمان) مردوں میں سے	فَاِنْ	چنانچہ اگر

لَّمۡ يَكُوۡنَا	نہ ہوں	رَجُلَيۡنِ	دو مرد		
فَرَجُلٌ	تو (گواہی دیں) ایک مرد	وَّامۡرَاَتٰنِ	اور دو عورتیں		
مِمَّنۡ	اُن میں سے جنہیں	تَرۡضَوۡنَ	تم پسند کرو		
مِنَ الشُّهَدَآءِ	گواہوں سے	اَنۡ	(یہ اُس سبب سے) کہ اگر		
تَضِلَّ	بھول جائے	اِحۡدٰىهُمَا	ایک عورت ان دو میں سے		
فَتُذَكِّرَ	تو یاد دلا دے	اِحۡدٰىهُمَا	ان میں سے ایک		
الۡاُخۡرٰى	دوسری کو	وَلَا يَاۡبَ	اور نہ انکار کریں		
الشُّهَدَآءُ	گواہ	اِذَا	جب (بھی)	مَا دُعُوۡا	وہ بلائے جائیں
وَلَا	اور نہ	تَسۡـَٔمُوۡۤا	تم سستی کرو	اَنۡ	(اُس سے) کہ
تَكۡتُبُوۡهُ	تم لکھو اُس کو	صَغِيۡرًا	چھوٹا (معاملہ) ہو	اَوۡ	یا
كَبِيۡرًا	بڑا	اِلٰٓى اَجَلِهٖ	اس کے مقررہ وقت تک		
ذٰلِكُمۡ اَقۡسَطُ	یہ (لکھنا) زیادہ قرین انصاف ہے	عِنۡدَ اللّٰهِ	اللہ کے نزدیک		
وَاَقۡوَمُ	اور زیادہ مضبوط	لِلشَّهَادَةِ	گواہی کے لیے		
وَاَدۡنٰٓى	اور زیادہ قریب ہے (اس بات کے)	اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا	کہ نہ تم شک میں پڑو		
اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ	سوائے یہ کہ ہو	تِجَارَةً	سودا		
حَاضِرَةً	حاضر (یعنی ہاتھوں ہاتھ)	تُدِيۡرُوۡنَهَا	(کہ) تم لیتے دیتے ہو اسے		
بَيۡنَكُمۡ	آپس میں	فَلَيۡسَ	تو نہیں	عَلَيۡكُمۡ	تم پر
جُنَاحٌ	کوئی گناہ	اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَا	یہ کہ تم وہ نہ لکھو اُس کو		
وَاَشۡهِدُوۡۤا	اور تم گواہ بنا لو	اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ	جب تم آپس میں سودا کرلو		
وَلَا يُضَآرَّ	اور نہ نقصان پہنچایا جائے	كَاتِبٌ	لکھنے والے کو		
وَّلَا شَهِيۡدٌ	اور نہ گواہ کو	وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا	اور اگر تم ایسا کرو گے		

فَاِنَّهٗ	تو بیشک یہ	فُسُوْقٌ	نافرمانی ہے

بِكُمْ	(جس کا گناہ ہوگا) تمہیں	وَاتَّقُوا	اور تم ڈرو	اللّٰهَ	اللہ سے
وَيُعَلِّمُكُمُ	اور سکھلاتا ہے تمہیں	اللّٰهُ	اللہ	وَاللّٰهُ	اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز کو	عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا ہے۔(282)

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں پسند کرلو تاکہ ایک کی بھول چوک کو دوسری یاد دلادے۔"

گواہ بنانے کی حکمت جیسا کہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے کہا: "اس لئے کہ یہ جھگڑے کے امکان کو دور کرتا ہے اور انکار سے بھی بچاتا ہے"۔ سودی نظام کی سختی سے ممانعت اور صدقات وخیرات کی تاکید بیان کی گئی تو پھر ایسے معاشرے میں قرضوں کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ سود تو ویسے ہی حرام ہے اور ہر شخص صدقہ وخیرات کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ہر شخص صدقہ لینا پسند بھی نہیں کرتا۔ پھر اپنی ضروریات وحاجات پوری کرنے کے لئے قرض ہی باقی رہ جاتا ہے۔ اسی لئے احادیث میں قرض دینے کا بڑا ثواب بیان کیا گیا ہے۔ تاہم قرض جس طرح ایک ناگزیر ضرورت ہے، اس میں بے احتیاطی یا تساہل جھگڑوں کا باعث بھی ہے اللہ تعالیٰ نے قرض کے سلسلے میں ضروری ہدایات دی ہیں تاکہ یہ ناگزیر ضرورت لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بنے۔ اس کے لئے ایک حکم یہ دیا گیا ہے کہ مدت کا تعین کرلو، دوسرا یہ کہ اسے لکھ لو، تیسرا یہ کہ اس پر دو مسلمان مرد کو، یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالو۔ یہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو مقرر کرنے کی علت وحکمت ہے۔ یعنی عورت عقل اور یادداشت میں مرد سے کمزور ہے (جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں بھی عورت کو ناقص العقل کہا گیا ہے) اس میں عورت کے استخفاف اور فروتری کا اظہار نہیں ہے (جیسا کہ بعض لوگ باور کراتے ہیں) بلکہ ایک فطری کمزوری کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کی حکمت ومشیت پر مبنی ہے۔ مُكَابَرَةً کوئی

اس کو تسلیم نہ کرے تو اور بات ہے۔ (مُكَابَرَةً عربی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے۔ اس کا بنیادی معنیٰ کسی کے سامنے ہٹ دھرمی کرنا، ضد کرنا، عداوت یا سینہ زوری دکھانا ہے، یعنی ضد اور ہٹ دھرمی حق یا سچ بات واضح ہو جانے کے باوجود محض انا، ضد یا بحث برائے بحث کی خاطر اسے تسلیم نہ کرنا اور مخالفت پر اڑے رہنا مکابرہ کہلاتا ہے) لیکن حقائق و واقعات کے اعتبار سے یہ ناقابل تردید ہے۔ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا اور گواہ جب بھی بلائے جائیں انکار نہ کریں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کسی شخص کو بوقتِ معاہدہ گواہ بنایا جائے، یا بعد میں تنازع کے حل کے لیے عدالت میں شہادت دینے کے لیے بلایا جائے، تو وہ ہرگز انکار نہ کرے تاکہ مظلوم کا حق ضائع نہ ہو اور معاشرے میں انصاف قائم رہے۔

کیا تھوڑے قرضے کو بھی لکھا جائے؟

ہمارے معاشرے میں ایک بہت بڑی خرابی در آئی ہے کہ لوگ کم قرض کو لکھتے ہی نہیں کہتے ہیں کہ بھائی چند سو ہی تو ہیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ یا پھر اس وجہ سے بھی نہیں لکھتے کہ جس کو قرض دے رہے ہیں وہ بڑا نیک یا قریبی رشتہ دار ہے دینے والے کو اس پر اندھا اعتماد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی اعتماد بعد میں بداعتمادی میں بدل جاتا ہے۔ سیکڑوں لوگ اس وجہ سے رو رہے ہیں کہ انہوں نے کسی شخص کو محض اعتماد کی بنا پر قرض دیا اور کوئی لکھت پڑھت نہیں کی۔ مگر اگر شرعی اصولوں کو دیکھا جائے تو قرض کے لکھنے کے جو احکامات ہیں یہ سب سے پہلے صحابہ کرام پر نازل ہوئے اور قرآن کریم کے سب سے پہلے مخاطب وہی تھے۔ اور یہ لکھنے کا حکم سب سے پہلے انہی صحابہ کو دیا گیا تھا۔ تو کیا کوئی شخص صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اعتماد اور امانت میں شک کر سکتا ہے؟ (حاشا وکلا) لیکن اس کے باوجود بھی لکھنے کا کہا گیا کیونکہ شیطان ابن آدم کے وجود میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔ ہم نے جب شرعی اصول کو چھوڑ کر اعتمادوں کی فضا میں بسیرا کیا تو وہاں سے ہمارے اعتمادوں کو ٹھیس پہنچنے لگی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان بچھڑ گئے، رشتہ داریاں ختم ہو گئیں، دوستیاں دشمنیوں میں بدل گئیں، جس کا سبب یہی اندھا اعتماد تھا۔

وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اور اس سے مت اکتاؤ وہ چھوٹا (معاملہ) ہو یا بڑا کہ اسے اس کی مدت تک لکھو۔ یہ کام اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف والا اور شہادت کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو۔ یعنی یہ لکھنے کے فوائد ہیں کہ اس سے انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے، گواہی بھی درست رہے گی (کہ گواہ کے فوت یا غائب ہونے کی صورت میں بھی تحریر کام آئے گی) اور شک وشبہ سے بھی فریقین محفوظ رہیں گے۔ کیونکہ شک پڑنے کی صورت میں تحریر دیکھ کر شک دور کرلیا جاسکتا ہے۔ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ مگر یہ کہ نقد سودا ہو، جسے تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اسے نہ لکھو۔ اور جب آپس میں خرید وفروخت کرو تو گواہ بنالو۔ یعنی یہ وہ خرید وفروخت ہے جس میں ادھار ہو یا سودا طے ہو جانے کے بعد بھی انحراف کا خطرہ ہو۔ ورنہ اس سے پہلے نقد سودے کو لکھنے سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔ بعض نے اس بیع سے مکان دکان، باغ یا حیوانات کی بیع مراد لی ہے۔ (ایسر التفاسیر) وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ اور نہ کسی لکھنے والے کو تکلیف دی جائے اور نہ کسی گواہ کو۔ ان کو نقصان پہچانا یہ ہے کہ دور دراز کے علاقے میں ان کو بلایا جائے کہ جس سے ان کی مصروفیات میں حرج یا کاروبار میں نقصان ہو یا ان کو جھوٹی بات لکھنے یا اس کی گواہی دینے پر مجبور کیا جائے۔ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اور اگر ایسا کرو گے تو بلاشبہ یہ تم میں بڑی نافرمانی ہے اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ یعنی جن باتوں کی تاکید کی گئی ہے، ان پر عمل کرو اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے، ان سے اجتناب کرو۔

عصر حاضر میں بینکوں اور مالیاتی اداروں میں بالخصوص اور معاشرتی سطح پر قرض خواہوں کو بالعموم ایک پیچیدگی اور مشکل کا سامنا ہے کہ قرضدار پیسہ لیکر واپس نہیں کرتے۔ معاشرے میں بددیانتی، کرپشن اور بے دینی کی وجہ سے صورت حال یوں ہو چلی ہے کہ پیسہ دینے والا واپس ملنے

کی امید سے مایوس ہو جاتا ہے۔اسی وجہ سے ضرورت مندوں کو قرضوں کے حصول میں بھی انتہائی مشکلات کا سامنا ہے۔قرض خواہوں نے تو تلاش بسیار کے بعد جب انہیں کوئی حل سجھائی نہیں دیا تو معاصر قوانین نے یہ حل تجویز کیا کہ جو مقررہ وقت پر ادا نہ کرے اس پر جرمانہ لگا دیا جائے۔اور معاہدے کے وقت قرضدار اور قرض خواہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اگر وہ وقت پر ادا نہ کرسکا تو جتنا قرضہ لیا ہے اس سے زیادہ ادا کرے گا۔کمرشل بینکوں میں اسے سود میں شمار کیا جاتا ہے جبکہ اسلامی بینک اور ادارے اسے صدقہ کہہ دیتے ہیں۔الغرض قرض لینے والا تاخیر کی صورت میں بہرصورت اصل رقم سے زیادہ ادا کرتا ہے۔موجودہ مالیاتی سسٹم میں اس طریقہ کار کو ریکوری کیلئے اور قرض نادہندگی سے بچنے کیلئے بڑا کامیاب طریقہ تصور کیا جاتا ہے۔لیکن اس طریقے کو اگر شرعی نوعیت سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو یہ آسودہ حال اور تنگ دست کو ایک ہی چھڑی سے ہانکنے کا فلسفہ ہے۔جو ظلم اور استحصال پر مبنی ہے۔اس سے بھی افسوسناک امر یہ ہے کہ ہم حل وہاں سے تلاش کرتے ہیں جہاں سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔اور جہاں سے حل ملتا ہے اس سے پہلوتہی اختیار کرتے ہیں۔

قرض کے اسباب

لوگوں کے قرض لینے کی چند بڑی وجوہات درج ذیل ہیں:(1) تجارتی قرضے(2) جرمانے اور مالیاتی سزاؤں کی ادائیگی کیلئے لئے جانے والے قرضے(3) بنیادی انسانی ضرورریات پورا کرنے کیلئے قرضے(4) پرتعیش زندگی گذارنے کیلئے قرضے۔لوگ قرضے واپس کیوں نہیں کرتے وہ اسباب جن کی وجہ سے قرض خواہ کا پیسہ پھنس جاتا ہے۔ادائیگی میں دشواریاں پیش آتی ہیں اسلام نے ان اسباب پر نظر رکھنے اور ہر سبب سے ایک مخصوص طریقے سے نپٹنے کے طریقے بتلائے ہیں۔

قرض کی عدم ادائیگی کے اسباب

(1) دیوالیہ ہو جانا۔تنگ دستی: وہ شخص جس کے قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ دیوالیہ ہو جانا یا کسی بھی قدرتی آفت یا بے اختیار سبب کے باعث تنگ دست ہو جانا جس کے بعد اس کیلئے قرض ادا کرنا ممکن نہیں ہوتا کیونکہ اس کے پاس ادائیگی کے لئے رقم ہی نہیں ہوتی۔(2) مقروض کی بدنیتی

کے باعث جان بوجھ کرٹال مٹول سے کام لینا: جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَطۡلُ الۡغَنِيِّ ظُلۡمٌ (صحیح البخاري) "مالدار کا ادائیگی قرض میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے"۔

(3) مقروض کی موت: اگر کسی انسان کی موت واقع ہو جائے تو اس کا اپنے مال سے تعلق ختم ہو جاتا ہے اور وہ اس کے ورثہ کے قبضے میں چلا جاتا ہے اور ان پر واجب ہے کے مال کی تقسیم سے پہلے اس (میت) کے تمام واجبات ادا کر دیں۔ لیکن اگر میت نے کوئی مال نہ چھوڑا ہو تو ان پر اس (میت) کے واجبات ادا کرنا لازم نہیں ہے جس کے سبب قرض کی ادائیگی پھنس جاتی ہے۔ (4) مقروض کا قرض سے مکر جانا: اگر کوئی قرض لے کر مکر جائے کہ میں نے تو کوئی قرض نہیں لیا تو یہ بھی ایک بڑا سبب ہے جس سے قرض کی واپسی میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ (5) روپے کی قدر گر جانا یا روپے کی مندی یا کرنسی کالعدم کر دیا جانا: اگر کسی ملک کی کرنسی ماند پڑ جائے یا اس کی قدر میں کمی واقع ہو جائے تو اس سے بھی قرض کی واپسی میں دشواری ہو جاتی ہے۔ کہ آیا اب قرض کی ادائیگی کس صورت میں کی جائے؟

قرض کی ادائیگی کو کیسے محفوظ بنایا جاسکتا ہے؟

شریعت کی جانب سے ادائیگی قرض کو یقینی بنانے کیلئے اختیار کئے جانے والے وسائل:

اسلام نے قرض کی واپسی کو محفوظ اور ممکن بنانے کے لئے چند ایسے رہنما ضابطے متعین کئے ہیں جن سے نہ صرف دیا گیا قرض محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ اس کی واپسی بھی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ یہ وسائل قرض دینے سے پہلے اختیار کرنے ضروری ہیں۔

جو لوگ قرض لیکر مکر جاتے ہیں شریعت نے اس حوالے سے چند رہنما ضابطے متعین کئے ہیں جن کے اختیار کرنے سے مقروض کبھی بھی مکر نہیں سکتا۔ قرضوں کے مسائل حل کرنے اور ان کی وصولی ممکن بنانے کیلئے چند اہم سفارشات: (1) صرف بنیادی ضروریات یا تجارت کیلئے قرض دیا جائے۔ پر تعیش اشیاء کی خریداری کیلئے قرضے نہ دئے جائیں۔ (2) قرض دینے سے پہلے قرض لینے والے شخص کی مالی پوزیشن کا جائزہ لے لینا چاہئے کہ یہ ادا کر بھی پائے گا یا نہیں۔ (3) قرضوں کی واپسی کیلئے قرآن وسنت کی روشنی میں

قانون سازی کی جائے۔(4)ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کیلئے بیت المال نظام کو فعال کیا جائے تاکہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں وہاں سے پوری کی جائیں اورانہیں قرض لینے کی نوبت ہی نہ آئے۔(5)قرض لینے والے قرضہ انتہائی مجبوری کی حالت میں لیں۔اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز میں قرض سے پناہ مانگا کرتے تھے۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں دعا کیا کرتے تھے اور کہتے تھے: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ ”اے اللہ! یقیناً میں گناہ اور قرض سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔“(6)قرض دینے سے پہلے تمام شرعی اور قانونی ضابطے پورے کرلئے جائیں۔جن میں قرض کے معاہدہ کا لکھنا، قرض پر گواہ بنانا، بطور گروی کوئی چیز رکھنا، ضامن متعین کرنا، اور مقروض کی مالی پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے قرضہ دیا جانا چاہیئے۔(7)جان بوجھ کر ٹال مٹول کرنے والے قرض نادہندگان کو بلیک لسٹ کیا جانا چاہیئے اور کوئی ادارہ بعد ازاں انہیں قرض فراہم نہ کرے۔(8)عوام میں شعور وآگہی کیلئے قرض سے متعلق خوف وڈر کی شرعی آیات واحادیث کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔کہ جس میں مقروض کی نماز جنازہ نہ پڑھانا، موت کے بعد انسان کی مغفرت کا ادائیگی قرض تک روک لیا جانا، وغیرہ شامل ہیں۔(9)مالیاتی ادارے اور بینک جو ہاؤس فائنانسنگ اور لیزنگ پر گاڑیاں دینے کیلئے قرضے دیتے ہیں انہیں کم بلکہ ختم کیا جانا چاہیئے اور صرف بغیر چھت کے رہنے والوں کو بقدر ضرورت قرض دیا جائے۔(10)مقروض کو بطور قرض لی ہوئی رقم سے زیادہ کی ادائیگی کا پابند نہ کیا جائے۔کیونکہ یہ سود ہے اور سود کی حرمت قطعی اوراٹل ہے۔محض نام بدلنے سے حقائق نہیں بدل جاتے۔اللہ تعالیٰ ہمیں نظام معیشت کو شرعی خطوط پر استوار کرنے کی توفیق عطا فرمائے

رہن کی شرعی حیثیت اوراس کی مدت کا بیان نیز گروی رکھی ہوئی چیز سے استفادے کا حکم

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ
بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ
وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٣﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ
فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾

رہن کی شکلیں اورمالِ مرہون سے استفادہ

وَاِنْ	اوراگر	كُنْتُمْ	ہوتم	عَلٰى سَفَرٍ	سفرمیں	وَّلَمْ	اورنہ
تَجِدُوْا	تم پاؤ	كَاتِبًا	کوئی لکھنے والا	فَرِهٰنٌ	تورہن (کےطورپر)		
مَّقْبُوْضَةٌ	قبضے میں دے دی جائے (کوئی چیز)	فَاِنْ	پھراگر				
اَمِنَ	اعتبارکرے	بَعْضُكُمْ	بعض تمہارا	بَعْضًا	بعض کا		
فَلْيُؤَدِّ	توچاہیےکہ اداکردے	الَّذِي	جوشخص				

اؤْتُمِنَ	امین بنایا گیا	اَمَانَتَهٗ	اس کی امانت کا
وَلْيَتَّقِ	اور چاہیے کہ ڈرے	اللّٰهَ	اللہ سے
رَبَّهٗ	جو اس کا رب ہے	وَلَا تَكْتُمُوا	اور تم نہ چھپاؤ
الشَّهَادَةَ	گواہی کو	وَمَنْ	اور جو شخص
يَّكْتُمْهَا	چھپائے گا اُس (گواہی) کو	فَاِنَّهٗ	تو بیشک وہ

اٰثِمٌ	گنہگار ہے	قَلْبُهٗ	اس کا دل	وَاللّٰهُ	اور اللہ

بِمَا	اسے جو	تَعْمَلُوْنَ	تم عمل کرتے ہو	عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں امت کو درپیش مختلف النوع مسائل میں شریعتِ اسلامیہ نے مکمل راہنمائی کی ہے۔ زندگی کے ہر گوشہ کو واضح طور پر اجاگر کیا ہے، تاکہ امت قرآن وحدیث اور اسلامی شریعت کے سائے تلے اپنے سارے مسائل کو حل کرسکے؛ لیکن بعض دفعہ معاشرہ میں کچھ ایسی چیزیں رواج پاجاتی ہیں، جن کا تعلق شریعت سے بالکل نہیں ہوتا اور لوگ دانستہ یا نادانستہ اسی پر عمل کرتے چلے جاتے ہیں۔ آج معاشرہ میں رائج "رہن" کا معاملہ بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ جس میں تقریباً ۹۰ / فیصد لوگ مالِ مرہون سے فائدہ اٹھانے کو مباح اور اپنا حق سمجھتے ہیں؛ یہاں تک کہ راہن اور مرتہن کوئی بھی اس کو قبیح اور غیر شرعی نہیں سمجھتا۔ ضرورت ہے اس کی صحیح اسلامی صورت معلوم کر کے عمل کرنے کی۔ فرمایا: وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ یہ بیع اور قرض کی ایک دوسری شکل ہے، یعنی اگر تم سفر میں قرض کا معاملہ کرو اور تمہیں لکھنے والا نہ مل سکے، یا لکھنے کے لیے قلم دوات وغیرہ میسر نہ ہوں تو مقروض کو چاہیے کہ قرض دینے والے کے پاس کوئی چیز رہن (گروی) رکھ دے۔ رہن وہ چیز ہوتی ہے جو قرض کے بدلے میں کسی شخص کے پاس رکھی جاتی ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر قرضہ کی رقم مقررہ مدت میں ادا نہ کی جائے تو قرض خواہ اس چیز کو فروخت کر کے اپنی رقم پوری کرے اور جو کچھ باقی بچے وہ مقروض کو لوٹا دے۔ تاہم اگر مَرْهُوْنَة (گروی رکھی ہوئی چیز) ایسی ہے جس سے

نفع موصول ہوتا ہے تو اس نفع کا حق دار مالک ہوگا نہ کہ دائن۔ البتہ اس پر دائن کا اگر کچھ خرچ ہوتا ہے تو اس سے وہ اپنا خرچہ وصول کرسکتا ہے۔ باقی نفع مالک کو ادا کرنا ضروری ہے۔ رہن میں چیز پر قبضہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر رہن مکمل نہیں ہوتا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ میں اسی طرف اشارہ ہے رہن میں منقولہ یا غیر منقولہ کوئی بھی جائیداد رکھی جا سکتی ہے، مثلاً مکان، زمین، باغ، جانور، زیور، گاڑی وغیرہ وغیرہ۔ یعنی اگر معاملہ کو لکھنا دشوار ہو تو اطمینان و اعتماد کی دوسری صورت رہن کی ہے کہ جس کے ذمہ حق ہے، وہ کوئی شیٔ دوسرے فریق کے پاس یا ان دونوں کی رضامندی سے کسی تیسرے شخص کے پاس رکھ دے، 'سفر' کی قید محض اتفاقی ہے سفر کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ معاملہ زیادہ تر سفر میں پیش آتا ہے، ورنہ رہن (گروی) رکھنا حضر میں بھی جائز ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر عملاً اس کی وضاحت کر دی۔ [بخاری، البیوع، باب شراء ال إمام الحوائج بنفسه:2096۔ مسلم:1603] چناچہ سفر میں رہن نص قرآنی سے ثابت ہے اور حضر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل سے۔ (شوکانی) فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ پھر اگر تم میں سے کوئی کسی پر اعتبار کرے تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے وہ اپنی امانت ادا کرے، اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص قرض لینے والے کا اعتبار کرے اور اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر اسے قرض دے دے تو اسے بھی چاہیے کہ اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کا قرض ادا کر دے۔ یعنی اگر ایک دوسرے پر اعتماد ہو تو بغیر گروی رکھے بھی ادھار کا معاملہ کرسکتے ہو۔ امانت سے مراد یہاں قرض ہے، اللہ سے ڈرتے ہوئے اسے صحیح طریقے سے ادا کرے۔

گواہی کا چھپانا کبیرہ گناہ

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ اور شہادت مت چھپاؤ اور جو اسے چھپائے تو بیشک وہ، اس کا دل گناہ گار ہے، گواہی کا چھپانا کبیرہ گناہ ہے، اس لئے اس پر سخت وعید یہاں قرآن میں اور احادیث میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اسی لئے صحیح گواہی دینے کی

فضیلت بھی بڑی ہے۔صحیح مسلم کی حدیث ہے۔نبی ﷺ نے فرمایا: "وہ سب سے بہتر گواہ ہے جو گواہی طلب کرنے سے قبل ہی از خود گواہی کے لئے پیش ہوجائے" أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ الشُّهَدَاءِ؟ الَّذِي يَأْتِي بِشَهَادَتِهِ قَبْلَ أَنْ يُسْأَلَهَا. (صحیح مسلم) ایک دوسری روایت میں بدترین گواہ کی نشان دہی بھی فرمادی گئی ہے۔ أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِشَرِّ الشُّهَدَاءِ؟ الَّذِي يَشْهَدُونَ قَبْلَ أَنْ يُسْتَشْهَدُوا (صحیح بخاري) "کیا میں تمہیں وہ گواہ نہ بتلاؤں جو بدترین گواہ ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جو گواہی طلب کرنے سے قبل ہی گواہی دیتے ہیں۔" مطلب ہے یعنی جھوٹی گواہی دے کر گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔نیز آیت میں دل کا خاص ذکر کیا گیا ہے، اس لئے کہ کتمان دل کا فعل ہے۔علاوہ ازیں دل تمام اعضا کا سردار ہے اور یہ ایسا مضغۂ گوشت ہے کہ اگر یہ صحیح رہے تو سارا جسم صحیح رہتا اور اگر اس میں فساد آجائے تو سارا جسم فساد کا شکار ہوجاتا ہے۔ أَلَا! وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا! وَهِيَ الْقَلْبُ۔ (صحیح بخاري)

بہر حال اگر کوئی شخص کسی بات کا گواہ ہو اور کوئی دوسرا گواہ نہ ہو، اگر وہ گواہی نہ دے تو صاحب حق حق سے محروم ہوجائے یا دوسرے فریق کے غلط دعویٰ کی وجہ سے ناحق اس پر کوئی حق عائد ہوجائے تو گواہی دینا واجب اور گواہی سے انکار کرنا حرام ہے اور اگر متعدد گواہ موجود ہوں تو گواہی دینا واجب علی الکفایہ ہے، یعنی کوئی گواہی نہ دے تو سب گنہگار ہوں گے اور کوئی بھی دو اشخاص گواہی دے دیں تو دوسروں سے بھی بارِ گناہ ختم ہوجائے گا۔ (تفسیر خازن: ۱/ ۲۱۴)

رہن اور تَعذُّر کا بنیادی معنی ومفہوم

اس آیت کریمہ سے ملنے والی معلومات: "رہن" عربی لفظ ہے، اردو زبان میں اسے "گروی" کہتے ہیں۔اور ہماری علاقائی زبان میں اس کو "بھرنا" اور "بندھک" کہتے ہیں۔رہن کی شرعی تعریف یہ ہے کہ کسی مالی شے کو دَین (قرض) کے بدلے محبوس کرنا کہ اس سے یا اس کی قیمت سے بہ وقتِ تعذر اپنے دَین کی وصولی ممکن ہو۔(تَعذُّر عربی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں بھی مستعمل

ہے۔اس کا بنیادی معنی اور مفہوم کسی کام کا دشوار یا ناممکن ہونا، معذوری، اور عذر (بہانہ یا معذرت) پیش کرنا ہے۔اس کا مفہوم اور استعمال: عدمِ امکان/مجبوری: کسی کام کے نہ ہونے کی صورت میں پیش آنے والی رکاوٹ یا ناممکن پن کو تعذر کہتے ہیں۔اسلامی فقہ میں جب کسی شرعی حکم پر عمل کرنا حد درجہ مشکل یا نقصان دہ ہو جائے، تو اس صورتحال کو "متعذر" (جو ممکن نہ رہے) قرار دیا جاتا ہے) یعنی اگر کوئی شخص کسی سے قرض لے تو قرض دینے والا بطورِ ضمانت وو ثیقہ قرض دار سے کوئی قیمتی چیز لے کر اپنے قبضے میں رکھتا ہے کہ اگر قرض دار قرض نہ ادا کر سکے تو اس قیمتی چیز سے قرض کی رقم کی ادائیگی کا انتظام کیا جاسکے۔"رہن" کا شرعی حکم یہ ہے کہ ضرورت کی وجہ سے کسی قرض کے مقابلے میں "رہن" لینا اور دینا درست ہے، لیکن رہن میں رکھی جانے والی چیز کی حیثیت محض ضمانت کی ہوتی ہے، اور رہن میں رکھے جانے کے بعد بھی رہن (گروی) رکھی ہوئی چیز اس کے اصل مالک کی ہی ملک رہتی ہے؛ البتہ قبضہ مرتہن (جس کے پاس گروی رکھی ہوئی ہے) کا ہوتا ہے۔نیز اس میں پیدا ہونے والی زیادتی بھی مالک کی ملک قرار پاتی ہے۔اور مرتہن (جس کے پاس چیز گروی رکھی ہو) کے لیے شرعاً اس کے استعمال اور اس سے نفع کمانے کی اجازت نہیں ہوتی۔رہن میں کوئی بھی قیمتی چیز رکھی جاسکتی ہے، چناں چہ زمین کو بھی رہن کے طور پر رکھنا درست ہے۔ لیکن جس کے پاس زمین رہن رکھوائی جائے اس کے لیے زمین میں کاشت کر کے اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔قرض واپس کرنے پر زمین واپس کرنا لازم ہے۔رہن رکھی ہوئی چیز یا اس سے حاصل شدہ اضافے سے فائدہ اٹھانا قرض دے کر نفع اٹھانے کی وجہ سے سود کے حکم میں ہے۔باقی رہن کی کوئی مدت نہیں ہے، فریقین جتنی مدت تک معاملہ کریں اتنی مدت تک رہن رکھوایا جاسکتا ہے۔

آج کل زمینوں کو طویل المیعاد قرضوں کے بدلے گروی رکھوایا جاتا ہے اور ان زمینوں پر کاشت کاری کر کے نفع اٹھایا جاتا ہے، اور قرض کی ادائیگی کی صورت میں اصل مالک کو زمین واپس کر دی جاتی ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ شرعاً یہ جائز نہیں ہے۔بعض لوگ گروی سے فائدہ اٹھانے کو جواز فراہم کرنے کے لیے قرض اور رہن کی لین دین کے وقت یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم اتنی رقم

میں زمین کا سودا کر رہے ہیں، البتہ اتنے عرصے بعد یا جب بھی ہم یہ رقم آپ کو واپس کر دیں تو یہ زمین آپ ہمیں واپس کرنے کے پابند ہوں گے، اس معاملے میں اصل مقصد قرض کے عوض گروی لینے والے شخص کے لیے گروی رکھی ہوئی چیز سے نفع اٹھانے کا جواز ہوتا ہے، اور بیع کی یہ کارروائی محض حیلے کے طور پر کی جاتی ہے، اور قرض کی ادائیگی کی مدت پوری ہونے پر زمین واپس کر دی جاتی ہے؛ لہٰذا اس کا حکم بھی یہ ہے کہ اس طرح نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔

ہاں اگر واقعۃً زمین کے مالک کو رقم کی ضرورت ہو اور حقیقت میں زمین کا سودا کرے اور معاملہ کرتے وقت زمین واپس کرنے کی شرط نہ لگائی جائے، بلکہ زمین کی قیمت وصول کر کے بایں طور زمین مکمل طور پر خریدار کی ملکیت میں دے دی جائے کہ وہ جب چاہے زمین کسی اور کو بیچ سکے پھر اتفاقاً زمین بیچنے والے شخص کے پاس زمین کی قیمت کے بقدر رقم آجائے اور وہ دوبارہ وہی زمین خرید لے تو اس کی اجازت ہوگی۔ اس آیت مبارکہ میں اللہ نے اپنے بندوں کو یہ جو عمدہ مسائل بتائے ہیں ان میں بہت سی حکمتیں اور عام فوائد موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر بندے اللہ کی ہدایات پر عمل کریں تو ان کا دین درست ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا بھی سنور جائے۔ کیونکہ ان میں انصاف، فائدہ، حقوق کی حفاظت اور لڑائی جھگڑے کا خاتمہ، اور معاشی معاملات کی درستی پائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا ذکر

لِلّٰهِ	اللہ ہی کے لیے ہے	مَا	جو کچھ	فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں
وَمَا	اور جو کچھ	فِي الْاَرْضِ	زمین میں ہے	وَاِنْ	اور اگر
تُبْدُوْا	تم ظاہر کرو	مَا	اُس کو جو	فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ	تمہارے دلوں میں ہے
اَوْ تُخْفُوْهُ	یا تم چھپاؤ اُس کو	يُحَاسِبْكُمْ	تم سے حساب لے گا		
بِهِ	اس کا	اللّٰهُ	اللہ	فَيَغْفِرُ	پھر وہ بخش دے گا
لِمَنْ يَّشَآءُ	جس کو وہ چاہے گا	وَيُعَذِّبُ	اور وہ عذاب دے گا		

مَنْ	جس کو	يَّشَآءُ	وہ چاہے گا	وَاللّٰهُ	اور اللہ	عَلٰى	اوپر
كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز کے	قَدِيْرٌ	خوب قدرت رکھنے والا ہے۔(284)				

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: یہ پچھلی آیت میں موجود (وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ) کی علت ہے، یعنی جب آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا ذکر ہوا ہے۔ (1) ملک، یعنی وہ ہر چیز کا مالک ہے، (2) علم، یعنی اس کا علم اتنا وسیع ہے کہ دلوں کے راز تک جانتا ہے، (3) قدرت، یعنی اسے سزا دینے اور معاف کر دینے کے کلی اختیارات حاصل ہیں اور یہی تین صفات ذرا تفصیل کے ساتھ آیت الکرسی میں بیان کی گئی ہیں جس سے مقصود یہ ہے کہ عبادات اور معاملات سے متعلق جو بیشمار احکام دیئے گئے ہیں۔ مسلمان کو اس کی تعمیل میں نہ حیلوں بہانوں سے کام لینا چاہئے اور نہ سینہ زوری اور ظلم و زیادتی سے۔ بلکہ اللہ سے ڈر کر اس کی مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔ کیونکہ کسی بھی ظاہری یا پوشیدہ امر میں انسان اس کی نافرمانی کر کے نجات نہیں پا سکتا۔

دل میں گزرنے والے خیالات پر محاسبہ نہیں

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ: اس سے معلوم ہوا کہ دل کے فعل پر بھی محاسبہ ہوگا، مگر اس سے مراد دل کے وہ اعمال ہیں جن پر انسان کو اختیار ہو اور جن کا وہ پختہ ارادہ کر لے، مثلاً ایمان، کفر، کسی نیکی یا بدی کا عزم اور پختہ ارادہ، مثلاً ایک شخص دل میں کفر رکھتا ہے، یا چوری اور زنا کا عزم رکھتا ہے، مگر اسے کفر کے اظہار کا یا چوری اور زنا پر عمل کا موقع نہیں ملتا تو اس پر محاسبہ ضرور ہوگا۔ رہے وہ خیالات جو انسان کی طاقت اور اختیار سے باہر ہیں، خود بخود آتے جاتے رہتے ہیں، اگر آدمی ان کو اپنے دل میں جگہ نہ دے تو ان پر محاسبہ نہیں ہوگا، احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بڑے پریشان ہوئے۔ انہوں نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نماز، روزہ، زکوٰۃ و جہاد وغیرہ یہ سارے اعمال، جن کا

ہمیں حکم دیا گیا ہے، ہم بجالاتے ہیں۔کیونکہ یہ ہماری طاقت سے بالا نہیں ہیں۔لیکن دل میں پیدا ہونے والے خیالات اور وسوسوں پر تو ہمارا اختیار ہی نہیں ہے اور وہ تو انسانی طاقت سے ہی ماوراہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر بھی محاسبہ کا اعلان فرمادیا ہے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔فی الحال تم سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ہی کہو۔چنانچہ صحابہ (رضي اللہ عنہم) کے جذبہ سمع وطاعت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالے نے اسے آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا "اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"، سے منسوخ فرمادیا (ابن کثیر وفتح القدیر) صحیحین وسنن اربعہ کی یہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِي عَنْ أُمَّتِي مَا وَسْوَسَتْ بِهِ صُدُورُهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ (صحیح بخاري) "اللہ تعالیٰ نے میری امت سے جی میں آنے والی باتوں کو معاف کر دیا ہے۔البتہ ان پر گرفت ہوگی جن پر عمل کیا جائے یا جن کا اظہار زبان سے کر دیا جائے"، اس سے معلوم ہوا کہ دل میں گزرنے والے خیالات پر محاسبہ نہیں ہوگا، صرف ان پر محاسبہ ہوگا جو پختہ عزم وارادہ میں ڈھل جائیں یا عمل کا قالب اختیار کرلیں۔یعنی دل میں جو باتیں ہوتی ہیں، وہ دو طرح کی ہیں، ایک وہ ہیں جن میں قصد وارادہ کو دخل نہیں، بلا قصد وارادہ خیالات کی آمد ورفت ہوتی رہتی ہے، اس پر مؤاخذہ نہیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس بات کا دل میں خیال آئے، جب تک انسان اسے نہ بولے یا اس پر عمل نہ کرے، اللہ نے اس کو میری اُمت سے معاف کر دیا ہے، (بخاری عن ابی ہریرۃ، باب إذا حنث ناسیافي الأیمان، حدیث نمبر: ۶۶۶۴) دوسرے ایسے خیالات ہیں جن کو دل میں جمایا جائے یا کسی برائی کا عزمِ مصمم اور پختہ ارادہ کرلیا جائے، یہ اختیاری خیالات اور ارادے ہیں، ان پر پکڑ ہوسکتی ہے، یہاں ایسے ہی خیالات کا ذکر ہے۔

محاسبہ (احتساب یا جائزہ) معاقبہ (مواخذہ یا تادیب)

امام ابن جریر طبری کا خیال ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے کیونکہ محاسبہ معاقبہ کو لازم نہیں ہے۔(محاسبہ معاقبہ دو الگ الگ اسلامی اور اخلاقی اصطلاحات ہیں۔اس کا مفہوم اپنے اعمال کا

جائزہ لینا اور کوتاہیوں پر اپنے نفس کو سزا دینا ہے۔اس کا تفصیلی معنی ومفہوم درج ذیل ہے: محاسبہ (احتساب یا جائزہ) اس سے مراد اپنے روزمرہ کے اعمال، خیالات اور نیتوں پر گہری نظر رکھنا اور ان کا جائزہ لینا ہے۔رات کو سونے سے پہلے یہ سوچنا کہ آج کے دن میں کتنے نیک کام کیے اور کتنی برائیاں یا کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔معاقبہ (مواخذہ یا تادیب) محاسبہ کے بعد اگر انسان کو اپنی کسی غلطی، گناہ یا سستی کا احساس ہو، تو نفس (خواہشات) پر کڑی نظر رکھنا اور اسے کسی جائز طریقے (مثلاً نفلی روزے رکھنا، صدقہ دینا، یا رات کی عبادت) سے سزا دے کر راہِ راست پر لانا" معاقبہ" کہلاتا ہے۔یعنی ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا بھی محاسبہ کرے، اس کو سزا بھی ضرور دے، بلکہ اللہ تعالیٰ محاسبہ تو ہر ایک کا کرے گا لیکن بہت سے لوگ ہوں گے کہ محاسبہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا بلکہ بعض کے ساتھ تو یہ معاملہ فرمائے گا کہ اس کا ایک ایک گناہ یاد کرا کے ان کا اس سے اعتراف کروائے گا اور پھر فرمائے گا کہ میں نے دنیا میں ان پر پردہ ڈالے رکھا، جا آج میں ان کو معاف کرتا ہوں (یہ حدیث صحیح بخاری، مسلم وغیرہما میں ہے۔بحوالہ ابن کثیر)

اسلام کے تمام عقائد کا اجمالی تذکرہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ
وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا
غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

اسلام کے بنیادی عقائد

اٰمَنَ	ایمان لائے	الرَّسُوْلُ	رسول	بِمَآ	اُس پر جو
اُنْزِلَ	نازل کی گئی	اِلَيْهِ	اُن کی طرف		
مِنْ رَّبِّهٖ	اُن کے رب کی طرف سے	وَالْمُؤْمِنُوْنَ	اور سارے مومن (بھی)		
كُلٌّ	سب	اٰمَنَ	ایمان لائے	بِاللّٰهِ	اللہ پر
وَرُسُلِهٖ	اور اس کے رسولوں (پر)	لَا نُفَرِّقُ	(کہتے ہیں) نہیں ہم تفریق کرتے		
بَيْنَ	درمیان	اَحَدٍ	کسی کے		
مِّنْ رُّسُلِهٖ	اس کے رسولوں میں سے	وَقَالُوْا	اور انہوں نے کہا		
سَمِعْنَا	ہم نے سنا	وَاَطَعْنَا	اور ہم نے اطاعت کی		
غُفْرَانَكَ	(ہم طلب کرتے ہیں) تیری بخشش	رَبَّنَا	اے ہمارے رب		

وَاِلَيْكَ	اور تیری طرف	الْمَصِيْرُ	لوٹ کر جانا ہے۔(285)

اس آیت میں اسلام کے تمام عقائد کا اجمالی تذکرہ ہے، ان میں سے کسی کا بھی انکار کفر ہے۔ اسلام کے تمام بنیادی عقائد کا تعلق ”ایمان“ سے ہے ایک مسلمان ہونے کے لیے ان بنیادی عقائد پر پختہ یقین رکھنا لازمی ہے:

بِاللهِ: اللہ پر سب سے پہلے ایمان باللہ کا درجہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہونا کیونکہ یہ بنیادی چیز ہے، نہ صرف اس کا وجود ہے بلکہ وہ واجب الوجود بھی ہے یعنی اس کا وجود خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اللہ کے علاوہ ہر چیز کا وجود عطا کیا ہوا ہے اور عارضی ہے مگر اللہ ہی ایک واحد ذات ہے جو واجب الوجود ہے، اللہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور اس لفظ میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔ واجب الوجود وہ ذات ہے جس میں تمام صفات کمال پائی جاتی ہیں، اس ذات میں نہ کوئی عیب ہے اور نہ کوئی نقصان والی چیز ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ دائم وقائم رہے گا، اسے کبھی زوال نہیں آئے گا، جب لفظ اللہ بولا جاتا ہے تو یہ تمام صفات اس میں آجاتی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان (توحید) اس بات پر یقین رکھنا کہ اللہ ایک ہے، وہ ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ: اور اس کے فرشتے۔ فرشتوں پر ایمان: اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے فرشتے پیدا کیے ہیں، جو ہمہ وقت اس کی عبادت اور احکامات کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں۔ فرشتوں پر ایمان لانا، ایمان کا دوسرا رکن ہے سب سے پہلے فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا ہوگا، اس نورانی مخلوق میں روح، عقل اور شعور پایا جاتا ہے، وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے رہتے ہیں اور یہ عبادت الٰہی سے نہ تھکتے ہیں، نہ اکتاتے ہیں۔ وہ معصوم ہیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرب مخلوق ہے۔

وَكُتُبِهٖ: اور اس کی کتابوں پر، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل کیے۔ قرآن مجید آخری اور مکمل کتابِ ہدایت ہے۔ اجمالاً تمام آسمانی کتب پر ایمان

لانا اور تفصیلاً قرآن پاک پر ایمان لانا ضروری ہے۔قرآن پاک کا ہر حکم صحیح، برحق اور واجب التعمیل ہے۔پہلی کتابیں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمائیں۔ان کے تمام احکام پر عمل کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے اکثر احکام منسوخ ہو چکے ہیں، تاہم ان کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے۔رہا یہ سوال کہ اللہ نے کل کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں، اس بارے میں قرآن پاک کی کسی آیت یا کسی صحیح روایت میں کوئی تصریح نہیں ملتی، ہاں بزرگان دین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے کل 104 آسمانی کتب اور صحیفے نازل فرمائے۔ان میں 4 مشہور بڑی کتب اور 100 چھوٹے صحیفے شامل ہیں۔ 4 مشہور کتب اور ان کے نزول کی تفصیل: تورات: حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔زبور: حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔انجیل: حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔قرآن مجید: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔یہ آخری اور مکمل آسمانی کتاب ہے۔یہ چار کتابیں تو بڑی ہیں، یعنی زبور، تورات، انجیل اور قرآن پاک اس کے علاوہ کچھ چھوٹی کتابیں یا صحیفے ہیں۔

وَرُسُلِهٖ: اور اس کے رسولوں (پر) حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء کو اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا۔آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ایمان کے چوتھے جزو کے متعلق فرمایا ورسلہ یعنی اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے اس کے بعد بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر حضور خاتم النبیین ﷺ تک ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء اور رسول بھیجے ہیں، اگر کوئی شخص اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے گا، تو کافر ہو جائے گا۔تمام رسولوں پر ایمان لانے کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی رسول کو مان لیا اور کسی کو انکار کر دیا۔جب تک ہر رسول پر ایمان نہ رکھیں خواہ ان کا نام معلوم ہے یا نہیں۔اللہ تعالیٰ نے جس جس دور میں جس جس نبی کو مبعوث فرمایا۔

وہ سب اس کے برگزیدہ بندے تھے، اپنی اپنی قوم کے ہادی اور رہنما تھے، ہم ان سب کی تصدیق کرتے ہیں وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ جو کچھ بھی اللہ نے اپنے نبیوں کو دیا ہے سب برحق ہے اور ہمارا ان پر ایمان ہے۔

اسی طرح سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 177 میں فرمایا: وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ روزِ آخرت (قیامت) پر ایمان: مرنے کے بعد ایک روز دوبارہ اٹھایا جائے گا، دنیا کے تمام اعمال کا حساب ہوگا، اور انسان کو اس کے اچھے یا برے اعمال کے مطابق جنت یا دوزخ ملے گی۔ تقدیر پر ایمان (خیر و شر): اچھی اور بری تقدیر کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے، اللہ کی مرضی اور علم سے ہوتا ہے۔ یہ بنیادی عقائد اسلامی تعلیمات کا مرکز ہیں ان کے علاوہ دین اسلام کے پانچ ارکان بھی ہیں جنہیں عملی جامہ پہنانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ان میں کلمہ طیبہ، نماز، زکوۃ، روزہ اور حج شامل ہیں۔

لَا نُفَرِّقُ: (کہتے ہیں) نہیں ہم تفریق کرتے تفریق کی نفی سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام رسولوں کو مانتے ہیں ایسا نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں۔ جس طرح عیسائیوں نے حضرت خاتم النبیین ﷺ اور یہودیوں نے آپ کے ساتھ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا بھی انکار کیا۔ بلکہ تمام انبیاء و رسل پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ ہیں (جن کے ذریعے ہمیں اللہ کے اوامر و نواہی کا علم ہوتا ہے) لہٰذا کسی نبی کا انکار کرنا تمام نبیوں کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی یعنی اے اللہ تو نے ہمیں جن کاموں کا حکم دیا ہے اور جن سے منع کیا ہے ہم نے انہیں توجہ سے سن لیا ہے (واطعنا) "اور ہم نے اطاعت کی" یہ تمام احکام تسلیم کر لیے۔ ان لوگوں میں شامل نہیں ہوئے جنہوں نے کہا تھا: (سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا) (البقرہ کی آیت نمبر: 93 میں ہے "ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔" غُفْرَانَكَ: (ہم طلب کرتے ہیں) تیری بخشش یعنی ہم سے جو کوتاہی اور گناہ ہوئے ہیں، ہم تجھ سے ان کی بخشش طلب کرتے ہیں اور ہم جن عیوب میں ملوث ہوئے ہیں، ان گناہوں کو مٹا دینے کی درخواست کرتے ہیں۔ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ: اے ہمارے رب : اور تیری

طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ایمان کے اجزا کے متعلق فرمایا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے معاد یعنی قیامت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کہ ایک وقت آئے گا جب قیامت برپا ہوگی۔ پھر سب کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ اس کے بغیر بھی انسان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا، گویا یہ ایمان کے پانچ جزو ہو گئے، توحید، رسول، ملائکہ، کتب اور قیامت کا دن۔ لہٰذا آخرت کے دن (Last Day) پر ایمان لانا بھی ضروری ہے کہ وہ دن آنے والا ہے، جب حساب کتاب ہوگا اور اس کے نتیجے میں جزا یا سزا اور جنت یا دوزخ کی منزل برحق ہے، جب انسان کو مکلف بنایا گیا ہے، تو پھر اس کے لیے جزاء سزا کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس کی تصدیق ضروری ہے، ورنہ آدمی کافر ہو جائے گا۔ جب تک ایمان کے تمام ارکان پر ایمان نہیں لائے گا، گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ یہ وہی اجزائے ایمان ہیں، جن کے متعلق سورہ کی ابتداء میں اشارہ کیا گیا تھا۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ یعنی متقین وہ ہیں جو بن دیکھے ایمان رکھتے ہیں۔ یہاں پر اسی چیز کی تشریح ہے کہ وہ کون کون سے امور ہیں، جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تو یہاں پر واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بمع اسکی صفات ملائکہ، کتابیں رسول اور روز قیامت ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے، حالانکہ نہ ملائکہ کو دیکھا، نہ رسولوں کو اور نہ قیامت کو دیکھا مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے یہی ایمان بالغیب ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعریف

اس آیت میں درحقیقت اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان کی تعریف فرمائی ہے۔ (علیہم الرضوان کا معنی ان پر اللہ کی رضامندی ہو ہے۔ یہ ایک دعائیہ کلمات کا مجموعہ ہے۔ اسے عموماً صحابہ کرام، اہل بیتِ اطہار اور تابعین کے اسمِ مبارک کے بعد بطورِ احترام اور دعائے مغفرت و خوشنودی کے لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ یہ ان ہستیوں کی عظمت اور اللہ کے ہاں ان کے بلند درجے کی تصدیق کرتا ہے۔) کیونکہ انہوں نے دلی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول کیا اور اس میں کسی قسم کا لیت ولعل نہ کیا، بلکہ اللہ کے حضور اپنی عاجزی کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو صحابہ

علیہم الرضوان کی ادا پسند آئی اور اس کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ کا ذکر مبارک بھی ہے۔ جس کی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان مزید بلند ہوگئی۔ حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر کر کے یہ بات واضح کی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حضور ﷺ کی طرح ایماندار تھے۔ اور ان کے ایمان حضور ﷺ کے ایمان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، اگرچہ پیغمبر کا ایمان اکمل درجے کا ہوتا ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان کامل درجے کا، مگر دونوں طرح کے ایمانوں کو باہم ملانے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات کی بلندی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح ہوگئی اور ان کی حوصلہ افزائی ٹھہری اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کمال عاجزی وانکساری کے ساتھ اللہ کے حکم کو قبول کیا اور اپنی لغزشوں کی معافی طلب کی۔ ہمارے چاروں طرف زندگی کا جو کارخانہ چل رہا ہے، اسے کس نے چلایا ہے، کیوں چلایا ہے اور ہم اس کارگاہ زندگی میں کیوں پیدا ہوئے ہیں؟ زندگی، جوانی، بڑھاپا اور موت۔ یہ چکر ہزاروں سال سے چل رہا ہے اور نا معلوم مدت تک چلتا رہے گا۔ آخر اس پورے سلسلہ عمل کی غایت اور نہایت کیا ہے؟ ان سوالات پر انسان ہمیشہ غور کرتا رہا مگر کوئی معقول جواب سمجھ میں نہ آیا حتی کہ انسان کے دماغ کے آگے تاریکی پھیل گئی۔ قادر مطلق نے انسان کی یہ بے چارگی دیکھی تو کرم فرمایا اور زندگی کی تخلیق کا مقصد بتانے کے لیے پیغمبر بھیجنے شروع کیے۔ سب سے آخر میں خاتم النبیین محسن انسانیت حضرت محمد ﷺ کو پیدا فرمایا۔ انہوں نے وحی کی روشنی میں بتایا کہ زمین و آسمان، چاند سورج، سمندر، پہاڑ، انسان، حیوان اور چرند پرند سب کچھ ایک قادر مطلق ہستی نے اپنی قدرت سے پیدا فرمایا ہے۔ اللہ ہی ہم سب کا خالق، مالک اور رازق ہے۔ اس نے اس دنیا کو آزمائش گاہ بنایا ہے۔ انسان اس دنیا میں اپنا عرصہ امتحان بسر کر کے عالم آخرت کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ اس دنیا میں احساس ذمہ داری کا مظاہرہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے، اس کے نتیجے میں اس دنیا میں بھی عزت اور کامیابی ہوگی اور آخرت میں بھی جنت کی لازوال نعمتیں مرحمت فرمائی

جائیں گی۔اللہ تعالیٰ کے احکام کیا ہیں اور ان کی تعمیل کس طرح کرنی چاہیے؟

کردارسازی (عملی نمونہ)

یہ تعلیمات جب تک کتابوں میں بند رہتی ہیں، اپنی بہار نہیں دکھاتیں لیکن جب یہ انسان کی عملی زندگی میں جھلملاتی ہیں تو پورے ماحول کو منور کر دیتی ہیں۔اسلامی تعلیمات کا سب سے بڑا مرکز انسان کی اصلاح اور بہترین کردار کی تشکیل ہے۔جب تک ہم اخلاص، سچائی، اور دیانت داری کو اپنی روزمرہ زندگی میں نافذ نہیں کرتے، کتابی علم معاشرے پر مثبت اثرات مرتب نہیں کر سکتا۔اور اسلامی تعلیمات کا اصل حسن اور تاثیر اس وقت تک نکھر کر سامنے نہیں آتی جب تک انہیں اپنی عملی زندگی کا حصہ نہ بنا لیا جائے۔صرف کتابوں تک محدود رہنے سے ان کا نظریاتی ادراک تو ہو سکتا ہے لیکن ان کے وہ انقلابی ثمرات جو معاشرے میں امن، عدل، اور اخلاقی اقدار کو فروغ دیتے ہیں، تبھی حاصل ہوتے ہیں جب انہیں کردار اور عمل میں ڈھالا جائے۔خلاصہ کلام یہ کہ کتابیں علم حاصل کرنے کا ذریعہ اور رہنمائی کی حد تک بہترین ہیں، لیکن اسلامی تعلیمات کا اصل ثمر ان کی عملی تطبیق میں ہی پوشیدہ ہے۔لہٰذا ان مبارک تعلیمات پر صدق دل سے عمل کیجیے۔اس طرح آپ کی زندگی سنور جائے گی اور آپ دنیا و آخرت میں کامیاب اور بامراد ہوں گے۔

شریعتِ محمدی میں آسانیاں ہی آسانیاں/
سورۃ البقرہ کی فضیلت واہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا
لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا وقفة
وَاغْفِرْ لَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

اللہ تعالیٰ کی رحمت وشفقت اور فضل وکرم کا تذکرہ

لَا يُكَلِّفُ	نہیں تکلیف دیتا	اللّٰهُ	اللہ
نَفْسًا	کسی نفس کو	اِلَّا	مگر
وُسْعَهَا	اس کی وسعت کے مطابق	لَهَا	اسی کے لیے ہے
مَا كَسَبَتْ	جو اس نے (بھلائی) کمائی	وَعَلَيْهَا	اور اسی پر ہے (وبال)
مَا اكْتَسَبَتْ	جو اس نے (برائی) کمائی	رَبَّنَا	اے ہمارے رب!
لَا تُؤَاخِذْنَآ	تو نہ مواخذہ کرنا ہمارا	اِنْ نَّسِيْنَآ	اگر ہم بھول جائیں

اَوْ اَخْطَاْنَا	یا ہم چوک جائیں	رَبَّنَا	اے ہمارے رب!
وَلَا	اور نہ	تَحْمِلْ	ڈال
عَلَیْنَآ	ہم پر	اِصْرًا	بوجھ
کَمَا	جیسا کہ	حَمَلْتَهٗ	تونے ڈالا تھا یہ
عَلَى الَّذِیْنَ	اُن لوگوں پر جو	مِنْ قَبْلِنَا	ہم سے پہلے تھے
رَبَّنَا	اے ہمارے رب!	وَلَا	اور نہ
تُحَمِّلْنَا	ہم سے اٹھوا	مَا	جو کہ
لَا طَاقَةَ	نہیں طاقت	لَنَا	ہمیں
بِهٖ	اس (کے اٹھانے) کی	وَاعْفُ	اور درگزر فرما
عَنَّا	ہم سے	وَاغْفِرْ لَنَا	اور بخشدے ہمیں
وَارْحَمْنَا	اور ہم پر رحم فرما	اَنْتَ	تو ہی
مَوْلٰىنَا	ہمارا کارساز ہے	فَانْصُرْنَا	پس تو ہماری مدد فرما
عَلَى	اوپر	الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ	کافر قوم کے۔(286)

اس آیت میں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت وشفقت اوراس کے فضل وکرم کا تذکرہ ہے کہ اس نے انسانوں کوکسی ایسی بات کا مکلف نہیں کیاہے جو ان کی طاقت سے بالا ہو۔اللہ تعالیٰ کا یہ ایک عام قانون ہے کہ وہ کسی انسان کواس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اوراس سے ایسے احکام کی تعمیل کا مطالبہ نہیں کرتا جواس کی طاقت سے باہرہوں۔فرمایا: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اس جملہ میں اللہ تعالیٰ اپنے قانون سزاوجزا کا کلیہ بیان فرمادیا۔یعنی جو کام کسی انسان سے استطاعت سے بڑھ کرہیں ان پرانسان سے باز پرس نہیں ہوگی، باز پرس توصرف اسی بات پرہوگی جوانسان کے اختیار اوراستطاعت میں ہواورجہاں انسان مجبورہوجائے وہاں گرفت نہ ہوگی۔مگراس اختیار، استطاعت اورمقدرت کافیصلہ انسان کونہایت نیک نیتی سے کرناچاہئے

کیونکہ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اگر کوئی شخص اچھا کام کرے گا تو اسے اس کا اجر ملے گا اور اگر برا کام کرے گا تو اس کا وبال بھی اسی پر ہے، اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون جزاوسزا کا دوسرا کلیہ بیان فرمایا جو یہ ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے خود کمایا ہو اور وہ ضرور اسے ملے گا اور جو کوئی برا کام کیا ہو تو اس کی سزا بھی اسے ہی ملے گی اور ضرور ملے گی نہ یہاں آباؤ اجداد کی نیکی کام آسکتی ہے اور نہ اس کا نسب، یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ کسی شخص نے کسی نیک کام کی بنیاد رکھ دی ہو جس کے اثرات اس کی موت کے بعد بھی جاری رہیں۔ تو اس میں نیکی کے کام میں اس کو بھی برابر کا حصہ ملتا رہے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی برے کام کی بنیاد رکھی ہو۔ اور اس کی موت کے بعد بھی اس کے اثرات جاری رہیں تو وہ اس برائی کے گناہ میں بھی برابر کا حصہ دار ہوگا اور یہ اصول قرآن کریم اور بہت سے احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ بہرحال یہ ممکن نہیں کہ جس بھلائی یا برائی میں انسان کی نیت اور سعی وعمل کو کچھ دخل نہ ہو، اس کی جزاوسزا یا اس میں سے کچھ حصہ اسے مل سکے۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا (ایمان والو! اللہ سے یوں دعا کرو) اے ہمارے پروردگار! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو اس پر گرفت نہ کرنا! اللہ تعالیٰ نے دعا کا یہ جملہ خود ہی مسلمانوں کو سکھلا کر نہ صرف ان کے سابقہ خلجان کو ختم کر دیا بلکہ مزید تسلی وتشفی کا سامان بھی مہیا فرمادیا۔ ان کا خلجان یہ تھا کہ دل میں پیدا ہونے والے خیالات جو ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے ان پر مواخذہ نہ ہو اور اس آیت کی رو سے ظاہری اعمال جو بھول چوک سے صادر ہوں ان سے بھی معافی کی درخواست سکھلائی گئی اور جب دعا قبول کرنے والا ہی یہ دعا سکھلا رہا ہو تو اس کی قبولیت میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ میری امت سے خطاونسیان کو معاف کر دیا گیا ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ اے ہمارے پروردگار! ہم پر اتنا بھاری بوجھ نہ ڈال جتنا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے

پروردگار! جس بوجھ کو اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں وہ ہم سے نہ اٹھوائیو۔ یہاں بوجھ سے مراد سخت قسم کے شرعی احکام ہیں۔

دین میں آسانی ہے

شریعتِ محمدی میں بہت آسانی ہے مثلاً ☆ شریعتِ مُوسَوِی (حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی شریعت) میں تمام احکامِ الٰہیہ ایک ساتھ نازل ہوئے جبکہ شریعتِ محمدی میں بتدریج (حسبِ موقع) نازل ہوئے ☆ شریعتِ مُوسَوِی میں کپڑا پاک کرنے کے لئے نجس حصّے کو کاٹنا ضروری تھا جبکہ شریعتِ محمدی میں دھونے سے کپڑا پاک ہو جاتا ہے ☆ شریعتِ مُوسَوِی میں قتل کی سزا صرف قتل تھی (دِیَت کی کوئی صورت نہ تھی) جبکہ شریعتِ محمدی میں دِیَت کی بھی صورت موجود ہے۔ یوں ہی مختلف شریعتوں میں اس طرح کے مسائل بھی تھے مثلاً رات میں کیا گیا گناہ صبح دروازے پر لکھا ہوتا تھا، عبادت خانوں کے علاوہ کہیں عبادت کرنے کی اِجازت نہیں تھی، تَیَمُّم کے ذَریعے پاکی حاصل کرنے کی نعمت مُیَسَّر نہیں تھی، زکوٰۃ میں مال کا چوتھا حصّہ دینا فرض تھا، مالِ زکوٰۃ کو آسمان سے اُترنے والی آگ جلا دیتی تھی، ایک نیک کام پر 10 نیکیوں کے بجائے ایک ہی نیکی ملتی تھی۔ (نور الانوار، ص 175) شرائعِ سابقہ (یعنی پہلی شریعتوں میں) افطار کے بعد کھانا پینا نمازِ عشاء تک حلال تھا بعد نمازِ عشاء یہ سب چیزیں شب میں بھی حرام ہو جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے سخت احکام میں تخفیف فرمادی۔ ”اوامر و نواہی بنیادی طور پر ایسے نہیں جو انسانوں کے لئے انتہائی دشوار ہوں۔ بلکہ یہ تو روح کی غذا، بدن کی دوا اور نقصان سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔ اللہ نے بندوں کو جن کاموں کا حکم دیا ہے، وہ رحمت اور احسان کی بنا پر دیا ہے۔ اس کے باوجود جب کوئی عذر پیش آجائے جس سے مشقت کا اندیشہ ہو تو اللہ تعالیٰ تخفیف اور آسانی فرما دیتا ہے۔ کبھی تو اس عمل کو مکلف کے ذمہ سے مکمل طور پر ساقط فرما دیتا ہے۔ کبھی اس کا کچھ حصہ معاف کر دیتا ہے۔ جیسے بیمار اور مسافر کے لئے بعض احکام میں تخفیف کر دی گئی ہے۔

مگر دِین آسان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص اپنی مَن مانی کرتا پھرے اور جو سمجھ میں

آئے کرتا جائے جیسا کہ ☆ بعض لوگ نماز میں ایسی غلطیاں کردیتے ہیں جس سے نماز کا لوٹانا واجب ہوتا ہے مگر وہ نہیں لوٹاتے، سمجھانے پر کہہ دیتے ہیں کہ بس ہم نے پڑھ لی اللہ عَزَّ وَجَلَّ قبول فرمائے ☆ رَمَضانُ المبارک میں روزہ نہیں رکھتے کہ روزہ رکھنا دشوار ہے، اللہ عَزَّ وَجَلَّ ہم پر آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا ☆ زکوٰۃ فرض ہونے پر حساب لگا کر پوری پوری زکوٰۃ ادا کرنے کے بجائے کچھ رقم صدقہ وخیرات کرکے اپنے دِل کو منا لیتے ہیں کہ ہم نے زکوٰۃ ادا کردی اللہ تعالیٰ قبول کرنے والا ہے۔ یہی لوگ دُنیوی معاملات میں آسان سے آسان کام کو بھی خوب سوچ سمجھ کر اور اس کے جاننے والوں سے راہنمائی لے کر کرتے ہیں تاکہ نقصان نہ ہوجائے مگر دِینی معاملات میں علمائے کرام سے راہنمائی لینا گوارا نہیں کرتے حالانکہ دُنیوی نقصان کے مقابلے میں دِینی نقصان زیادہ خَسارے کا باعِث ہے کیونکہ یہ آخِرت کا معاملہ ہے۔

دِین میں آسانی کا مطلب

اللہ تعالیٰ نے اپنی عِبادت ہم پر فَرض فرمائی لیکن اپنی رَحمت سے ہم پر تنگی نہیں کی بلکہ آسانی فرماتے ہوئے مُتَبادِل بھی عطا فرمادئیے۔ روزہ فرض کیا لیکن رکھنے کی طاقت نہ ہو تو بعد میں رکھنے کی اِجازت دیدی، بعض صورتوں میں فدیہ کی اِجازت دیدی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر ورنہ لیٹ کر اِشارے سے پڑھنے کی اِجازت دیدی، ایک مہینہ روزہ کا حکم فرمایا تو گیارہ (11) مہینے دن میں کھانے کی اِجازت دیدی اور رمضان میں بھی راتوں کو کھانے کی اِجازت دی بلکہ سحری وافطاری کے کھانے پر ثواب کا وعدہ فرمایا۔ گنتی کے چند جانوروں کا گوشت حرام قرار دیا تو ہزاروں جانوروں، پرندوں کا گوشت حلال فرمادیا۔ کاروبار کے چند ایک طریقوں سے منع کیا تو ہزاروں طریقوں کی اِجازت بھی عطا فرمادی۔ مَرد کو ریشمی کپڑے سے منع کیا تو بیسیوں قسم کے کپڑے پہننے کی اِجازت دیدی۔ اَلغرض یوں غور کریں تو آیت کا معنیٰ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسانی چاہتا ہے اور وہ ہم پر تنگی نہیں چاہتا۔ معلوم ہوا کہ ہمارے دِین میں بڑی آسانی ہے اور یہ آسانی نبیِّ رحمت صَلَّی اللہ تعالیٰ علیہ واٰلہٖ وسَلَّم کی بدولت ہے۔ اب اگر کوئی اس

آسانی سے یہ مُراد لے کہ دِین سیکھنا ضروری نہیں بس اپنی مَن مانی کرتے جاؤ تو یہ بالکل غلَط ہے اور ایسی سوچ رکھنے والوں کو غور کرنا چاہئے کہ اگر آسانی کا یہی مطلب ہے تو قرآنِ مجید میں کم وبیش 500 آیاتِ کریمہ صرف اَحکامات سے متعلق کیوں نازل ہوئیں؟ ہزاروں اَحادیثِ مُبارکہ میں ڈھیروں ڈھیر اَحکام ومَسائل کیوں بیان کئے گئے؟ یاد رکھئے! یہ شیطان کا کُھلا وار ہے، شیطان کے اس وار کو ناکام بناتے ہوئے علمِ دِین سیکھئے اور صحیح طریقے سے عبادت کرکے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی بارگاہ میں قبولیت کی دُعا کیجئے۔

تین چیزوں کی درخواست

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

اس میں اکٹھی تین چیزوں کی درخواست ہے۔عفو، مغفرت اور رحم۔عفو کے معنی چشم پوشی کے بھی ہیں اور معاف کردینے کے بھی۔ یہاں لفظ دوسرے معنی میں ہے۔غفر کے معنی ڈھانک دینے کے ہیں، رحم کا مفہوم واضح ہے۔ بندے کا سارا اعتماد بس انہی تینوں چیزوں پر ہونا چاہیے۔رب کریم کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، گناہوں کو ڈھانک دے اور اپنی رحمت سے نوازے آخرت کا سارا سہارا بس یہی تین چیزیں ہیں۔عطا سے منقول ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان آیتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تلاوت فرمایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر دعاء پر' آمین یارب العالمین' کہتے جاتے تھے۔(فتح القدیر للشوکانی: ۱/ ۳۸۶)

دعائیہ جملہ رضی اللہ عنہ کی تبدیلی کا طریقہ کار عربی گرامر کی رو سے

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ جب اس سورہ کی تلاوت سے فارغ ہوتے تو' آمین' کہا کرتے۔(تفسیر طبری: ۳/ ۱۰۷)(علمائے امت فرماتے ہیں کہ یہ کلمات رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام کے نام کے ساتھ لکھنا یا پڑھنا مستحب ہے، کلماتِ رضی اللہ عنہ عربی گرامر کی رو سے دعائیہ جملے ہیں۔واحد، تثنیہ اور جمع کے صیغوں کے مطابق ضمیر(ہ) کی تبدیلی کا طریقہ یہ ہے: واحد(مذکر): رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ(اللہ اس سے راضی ہوا)۔واحد

(مؤنث): رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا (اللہ اس عورت سے راضی ہوا)۔ تثنیہ (دو اشخاص کے لیے): رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا (اللہ ان دونوں سے راضی ہوا)۔ جمع (مذکر/مخلوط): رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ (اللہ ان سب سے راضی ہوا)۔ جمع (مؤنث): رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُنَّ (اللہ ان سب عورتوں سے راضی ہوا)۔ بہر حال معلوم ہوا کہ دعا کے اختتام پر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے آمین کہنا ثابت ہے اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان آیتوں کے بعد آمین کہنے کی ترغیب دی۔ (ابن کثیر) لہٰذا نماز سے باہر اور نفل نمازوں میں ان دُعائیہ آیتوں کے بعد ’آمین‘ کہنا چاہیے۔

سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتوں کی فضیلت

فضائل آیات آخر سورہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص ان آیات کو رات کے وقت تلاوت کریگا۔ یہ آیات اس کے لیے ساری رات کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ یا فرمایا تہجد کے قائم مقام ہوں گی بشرطیکہ انسان فرائض کا پابند ہو اور خلوص نیت کے ساتھ تلاوت کرے، یہ بڑی فضیلت والی آیتیں ہیں، انہیں ورد کے طور پر اختیار کر لینا چاہیے اور سیدنا ابن عباس (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزائن میں سے نازل فرمائی ہیں جس کو تمام مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے خود رحمٰن نے اپنے ہاتھ سے لکھ دیا تھا، جو شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے تو وہ اس کے لیے قیام اللیل یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہے، اور مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اللہ نے سورہ بقرہ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اس خزانہ خاص سے عطا فرمائی ہیں جو عرش کے نیچے ہے، اس لیے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو، اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ۔ اور فرمایا: دو آیتیں قرآن کا مخصوص حصہ ہیں جو شفاء بخشنے والی ہیں اور منجملہ ان چیزوں کے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں۔ اور وہ سورہ بقرہ کی آخر والی دو آیتیں ہیں۔ (دیلمی بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ۔ اور علمائے امت نے فرمایا ان میں نسیان کا علاج ہے: جس نے سوتے وقت بقرہ کی درج ذیل دس آیتیں پڑھنے کا معمول بنالیا وہ قرآن کبھی نہیں بھولے گا۔

شروع والی چار آیتیں۔آیۃ الکرسی اور اس کے بعد والی دو آیتیں، اور بقرہ کی آخر والی تین آیتیں۔ (دارمی) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نہیں جانتا کہ اسلام کے جاننے والوں میں سے کوئی شخص آیت الکرسی اور سورہ بقرہ کی آخری آیتیں پڑھے بغیر سو جائے، یہ وہ خزانہ ہے جو تمہارے نبی ﷺ عرش تلے کے خزانہ سے دیئے گئے ہیں۔

دُعائیہ آیتوں کے بعد ’آمین‘

جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان آیتوں کو آپ ﷺ پر تلاوت فرمایا، تو آپ ﷺ ہر دعاء پر ’آمین یارب العالمین‘ کہتے جاتے تھے، لہٰذا نماز سے باہر اور نفل نمازوں میں ان دعائیہ آیتوں کے بعد ’آمین‘ کہنا چاہئے۔ یا اللہ! تو ہمارا ولی و ناصر ہے، تجھی پر بھروسہ ہے، تجھی سے ہم مدد طلب کرتے ہیں، تو ہی ہمارا سہارا ہے، تیری مدد کے سوا نہ تو ہم کسی نفع کے حاصل کرنے پر قادر ہیں نہ کسی برائی سے بچ سکتے ہیں، تو ہماری ان لوگوں پر مدد فرما جو تیرے دین کے منکر ہیں تیری وحدانیت کو نہیں مانتے، تیرے نبی کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے، تیرے ساتھ دوسروں کی عبادت کرتے ہیں، مشرک ہیں اے اللہ تو ہمیں ان پر غالب کر دینا اور دین میں ہم ہی ان پر فاتح رہیں۔ اللہ پاک ہمیں معاف فرمائے اور قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھنے، عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہمارا ایمان پر خاتمہ کرے اور ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین اللّٰھم آمین یارب العٰلمین۔

سورہ آل عمران کا بنیادی تعارف اور پس منظر
علم محیط اور قدرت کاملہ کا عقلی تقاضا

سورۃ آلِ عمران قرآنِ مجید کی تیسری اور مدنی سورت ہے۔اس میں 20 رکوع اور 200 آیات ہیں۔اس کا نام حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ حضرت مریم کے خاندان" آلِ عمران" کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح پہلی سورہ میں بقرہ یعنی گائے کا ذکر ہے،تو اس کا نام سورہ بقرہ ہے۔مفسرین کرام فرماتے ہیں،کہ عمران دو ہیں۔ایک حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے والد اور دوسرے حضرت مریم (علیہا السلام) کے والد۔چونکہ اس سورہ میں زیادہ تر حضرت مریم (علیہا السلام) اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر ہے۔اس لیے یہاں پر عمران سے مراد حضرت مریم (علیہا السلام) کے والد ہیں۔حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے والد بھی پیغمبر نہیں تھے۔اور حضرت مریم کے والد بھی پیغمبر نہیں۔البتہ یہ دونوں حضرات نیک، صالح اور ایماندار تھے تاہم حضرت مریم کے والد عمران بیت المقدس کے امام تھے۔ہاں! حضرت مریم کے خالو حضرت زکریا (علیہ السلام) اللہ کے نبی تھے۔یہ سورہ مدنی ہے کیونکہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی۔ہجرت سے پہلے نازل ہونے والی سورتیں مکی کہلاتی ہیں۔بنیادی تعارف اور پس منظر مقامِ نزول مدینہ منورہ، یہ سورت بنیادی طور پر توحید، رسالت، اور اہلِ کتاب (خصوصاً عیسائیوں) کے غلط عقائد کا رد کرتی ہے اور مسلمانوں کو صبر، اتحاد اور ثابت قدمی کی تلقین کرتی ہے۔سورت کے

ابتدائی حصے نجران سے آئے ہوئے عیسائی وفد کے ساتھ مکالمے پر مبنی ہیں، جس میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی الوہیت کے نظریے کو دلائل سے باطل قرار دیا گیا ہے اس میں حضرت مریم کی ولادت، حضرت زکریا (علیہ السلام) کی دعا، اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش کا تفصیلی تذکرہ ہے اس میں جنگِ احد کے واقعات، مسلمانوں کی لغزشوں، اور ان سے جڑے اسباق کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے تاکہ امت کو مستقبل کے لیے حکمتِ عملی مل سکے۔ اس سورت میں اسلامی تعلیمات کے بنیادی ستون، مثلاً عقیدہ توحید، جہاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اور حج کی فرضیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کو الزَّهْرَاوَيْنِ یعنی دو جگمگانے والی سورتیں، فرمایا اور امت کو ان کے پڑھتے رہنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ انہیں پڑھا کرو۔ قیامت کے دن وہ اس حال میں آئیں گی جیسے دو بادل یا دو سائبان یا پرندوں کے دو جھنڈ ہیں، اور وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے (اللہ تعالیٰ سے اس کی مغفرت کے لیے جھگڑا کریں گی۔ (مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل، قراءۃ القرآن وسورۃ البقرۃ) قرآن کریم کے علوم میں سے ایک علم مخاصمہ ہے۔ یعنی وہ علم جس کے ذریعہ باطل فرقوں کے عقائد و نظریات کی تردید کی گئی ہے۔ نزول قرآن کے وقت اکثر تین فرقے قرآن پاک کے مخاطب رہے جو مسلمانوں کے حریف تھے: مشرکین، یہود اور نصاریٰ، سورہ بقرہ میں مشرکین کے علاوہ یہود پر اللہ کے انعامات، ان کی عہد شکنیوں اور ان کے عقائد باطلہ کا تفصیلی طور پر ذکر ہوا تھا جب کہ اس سورہ آل عمران میں مشرکوں کے علاوہ نصاریٰ کے عقائد باطلہ کا تفصیلی طور پر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

الٓمّٓ ۝١ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝٢ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝٣ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝٤ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝٥ هُوَ الَّذِيْ

يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑥

الْحَيُّ اور الْقَيُّوْمُ اللہ تعالیٰ کی خاص صفات

الٓمّٓ ① یہ حروف مقطعات میں سے ہیں متشابہات میں شمار کیے جاتے ہیں ان کا معنی اللہ ہی کو معلوم ہے۔جیسا کہ سورۃ بقرہ کے شروع میں بیان کیا گیا۔

اَللّٰهُ	اللہ	لَآ اِلٰهَ	نہیں کوئی معبود	اِلَّا هُوَ	سوائے اس کے
الْحَيُّ	ہمشہ زندہ	الْقَيُّوْمُ	سب کو سنبھالنے والا ہے(2)		

حَیُّ اور قَیُّوم اللہ تعالیٰ کی خاص صفات ہیں جن کا مطلب وہ ازل سے ابد تک رہے گا اسے موت اور فنا نہیں قیوم کا مطلب سارے کائنات کا قائم رکھنے والا، محافظ اور نگران، ساری کائنات اس کی محتاج وہ کسی کا محتاج نہیں۔عیسائی حضرت عیسیٰ کو اللہ یا ابن اللہ یا تین میں سے ایک مانتے تھے گویا ان کو کہا جارہا ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کی مخلوق ہیں،(علیہ السلام ایک دعائیہ کلمہ ہے۔اس کا معنی ہے: اس پر سلامتی ہو، انبیاء اور فرشتے: یہ اصطلاح بنیادی طور پر تمام انبیاء علیہم السلام (جیسے حضرت آدمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ) اور فرشتوں کے ناموں کے ساتھ مخصوص ہے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور ان کا زمانہ ولادت بھی تخلیق کائنات سے بہت عرصہ بعد کا ہے تو پھر وہ اللہ یا اللہ کا بیٹا کس طرح ہو سکتے ہیں نیز ان پر موت بھی نہیں آنی چاہیے تھی لیکن ایک وقت آئے گا کہ وہ موت سے بھی ہمکنار ہوں گے اور عیسائیوں کے بقول ہمکنار ہو چکے۔احادیث میں آتا ہے کہ ان آیتوں میں اللہ کا اسم اعظم ہے جس کے ذریعے سے دعا کی جائے تو رد نہیں ہوتی۔ایک یہ آل عمران کی آیت۔دوسری آیت الکرسی۔اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقی الہ وہی ہو سکتا ہے جو ہمیشہ سے زندہ و قائم و دائم ہو اور پوری کائنات کے انتظام کو سنبھالنے والا اور اس نظام میں قدرت و تصرف کے پورے اختیار رکھتا ہو۔جس الہ میں یہ صفات نہ پائی جائیں وہ الہ نہیں ہو سکتا۔اس معیار کے مطابق تمام معبودان باطل خواہ وہ جاندار ہوں، موجود ہوں یا فوت ہو گئے ہوں اور خواہ بے جان ہوں سب کی نفی ہو گئی۔

پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے کا مطلب و مفہوم

نَزَّلَ	اس نے نازل کی	عَلَيْكَ	آپ پر
الْكِتٰبَ	کتاب	بِالْحَقِّ	حق کے ساتھ
مُصَدِّقًا	تصدیق کرنے والی ہے	لِّمَا	اُن (کتابوں) کی جو
بَيْنَ يَدَيْهِ	اس سے پہلی تھیں	وَاَنْزَلَ	اور اس نے نازل کی
التَّوْرٰىةَ	تورات	وَالْاِنْجِيْلَ	اور انجیل (3)

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ یہاں "الْكِتٰبَ" سے مراد قرآن مجید ہے، گویا کتاب کامل یہی ہے۔ الف لام عہد کا ہونے کی مناسبت سے "یہ کتاب" ترجمہ کیا ہے۔ "نَزَّلَ" کا معنی آہستہ آہستہ اتارنا ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس قرآن تیئیس (23) برس میں مکمل نازل ہوا۔ "بِالْحَقِّ" سے اس کا سچا اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونا مراد ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: اس کے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو خبریں اور بشارتیں مذکور ہیں اس میں بھی وہی خبریں اور بشارتیں ہیں، اگر یہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتیں تو ان میں بہت اختلاف ہوتا۔ ایک خبر یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کو آخری رسول بنا کر بھیجے گا اور بشارت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان پر قرآن نازل فرمائے۔ تو جب تم ان کتابوں کو مانتے ہو جن کی تصدیق ہو رہی ہے تو تصدیق کرنے والی کتاب کو بھی مانو۔ (ابن کثیر، رازی)

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: تورات سے مراد وہ کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور انجیل سے مراد وہ کتاب ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ اس وقت یہ دونوں کتابیں اصل شکل میں موجود نہیں ہیں۔ تورات بائبل کے عہد قدیم کی پہلی پانچ کتابوں کا نام ہے اور انجیل بائبل کے عہد جدید کی پہلی چار کتابوں میں متفرق طور پر درج ہے۔ یہود و نصاریٰ نے انھیں بڑی حد تک بدل ڈالا ہے اور ان میں اپنی طرف سے تشریحات ملا کر خلط ملط کر دیا ہے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی توحید کا مضمون جو قرآن نے بیان کیا ہے یہ کچھ قرآن کی یا پیغمبر اسلام (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) کی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی توراۃ وانجیل وغیرہ کتابیں اور انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، ان سب کا یہی دعوی اور یہی کلمہ تھا، قرآن مجید نے آ کر ان سب کی تصدیق کی ہے، کوئی نیا دعوی پیش نہیں کیا، جس کے سمجھنے یا ماننے میں لوگوں کو کوئی الجھن ہو۔ یعنی قرآن کریم جو عین حکمت کے موافق نہایت بروقت سچائی اور انصاف کو اپنی آغوش میں لے کر اترا۔

فرقان کا معنی ومطلب

مِنۡ قَبۡلُ	اس سے پہلے	هُدًى لِّلنَّاسِ	لوگوں کی ہدایت کے لئے
وَاَنۡزَلَ	اور اُس نے نازل کیا	الۡفُرۡقَانَ	فرقان
اِنَّ	بیشک	الَّذِيۡنَ	وہ لوگ جنہوں نے
كَفَرُوۡا	کفر کیا	بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	اللہ کی آیتوں کے ساتھ
لَهُمۡ	ان کے لیے	عَذَابٌ شَدِيۡدٌ	سخت عذاب ہے

وَاللّٰهُ	اور اللہ	عَزِيۡزٌ	غالب ہے	ذُو انۡتِقَامٍ	بدلہ لینے والا ہے۔(4)

مِنۡ قَبۡلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ یہ کتابیں پہلے زمانے میں لوگوں کے لیے ہدایت کا کام کرتی تھیں، مگر جب ان کے اندر باطل شامل ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے صحیح اور غلط میں فرق کرنے والی کتاب قرآن مجید اتاری اور اسی لحاظ سے اس کا نام "الفرقان" رکھا۔ اور یہاں قرآن کریم نے لفظ فرقان استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو صحیح اور غلط کے درمیان فرق واضح کرنے والی ہو، قرآن کریم کا ایک نام فرقان بھی ہے، اس لئے کہ وہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والی کتاب ہے؛ چنانچہ بعض مفسرین نہ یہاں فرقان سے قرآن ہی مراد لیا ہے، دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سے مراد معجزات ہیں جو انبیاء کرام (علیہ السلام) کے ہاتھ پر ظاہر کئے گئے اور جنہوں نے ان کی نبوت کا ثبوت فراہم کیا، نیز اس لفظ سے وہ تمام دلائل بھی مراد ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ آیت میں اس کی قدرت کاملہ اور قادر مطلق ہونے کا بیان ہے کہ اس نے انسان کو بطن مادر کی تین اندھیریوں میں کیسی حکمت بالغہ کے ساتھ بنایا، اور ان کی صورتوں

اور رنگوں میں وہ صنعتکاری فرمائی کہ اربوں انسانوں میں ایک کی صورت دوسرے سے ایسی نہیں ملتی کہ امتیاز نہ رہے، اس علم محیط اور قدرت کاملہ کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ عبادت صرف اسی کی کی جائے، اس کے سوا سب کے سب علم وقدرت میں یہ مقام نہیں رکھتے، اس لئے وہ لائق عبادت نہیں۔

اب اسے سچا مانے بغیر ہدایت حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔اور پہلی کتابوں میں تورات، زبور، انجیل، صحف آدم، صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ سب شامل ہیں اور یہ کتاب (قرآن کریم) اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ کتب مذکورہ فی الواقعہ منزل من اللہ ہیں۔تصدیق سے مراد یہ ہرگز نہیں کہ آج کل کی بائبل میں جو مواد پایا جاتا ہے۔وہ سب منزل من اللہ ہے۔کیونکہ قرآن کریم ہی سے ثابت ہے کہ اہل کتاب نے، خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ اپنی کتابوں میں تحریف کر ڈالی ہے۔ تورات سے مراد یا تو وہ احکام عشرہ ہیں جو حضرت موسیٰ کو تختیوں کی صورت میں عطا ہوئے تھے یا وہ وحی منزل من اللہ ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوئی۔لیکن موجودہ بائیبل کے عہد نامہ قدیم میں جسے تورات کا نام دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سا مواد شامل کر دیا گیا ہے اور انجیل دراصل حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے خطابات اور مواعظ کے مجموعہ کا نام ہے جو آپ منزل من اللہ وحی کی روشنی میں لوگوں کو بتلاتے رہے۔انجیل چونکہ آپ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے مدتوں بعد آپ کے کئی حواریوں نے اپنے طور پر مرتب کی۔اس لیے اس میں شدید اختلافات بھی ہیں اور اس کے مواد میں مزید بہت سے اضافہ کر دیے گئے ہیں۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ان باتوں کے متعلق جن کے متعلق قرآن کریم خاموش ہے۔مسلمانوں کو یہ ہدایت فرما دی کہ تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔(بخاری، کتاب التفسیر، باب (قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا)

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ اس میں نازل شدہ آیات کا انکار کرنے والوں کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور اللہ پر یہ کچھ مشکل نہیں، وہ سب پر غالب بھی ہے اور انتقام لینے والا بھی ہے۔ یہ سزا دنیا میں بھی مل چکی اور آخرت میں بھی ملے گی۔دنیا میں اس طرح کہ آپ کی زندگی میں ہی اللہ تعالیٰ نے اسلام کو سربلند فرمایا اور اسلام کے

مخالفین سب کے سب خواہ وہ مشرکین تھے یا منافقین، یہودی تھے یا نصاریٰ ذلیل ورسوا ہوئے، قتل ہوئے، قیدی بنے، جلاوطن ہوئے یا جزیہ ادا کیا۔ رہا عذاب آخرت تو اس بارے میں وضاحت فرما دی کہ اللہ تعالیٰ زور آور ہے، بدلہ لینے والا ہے، یعنی وہ بدلہ لینے کی پوری طاقت رکھتا ہے اور یقیناً ان سے بدلہ لے گا۔

ہر چیز اللہ کی نظر میں

اِنَّ	بیشک	اللّٰهَ	اللہ	لَا يَخْفٰى	نہیں چھپی ہوئی
عَلَيْهِ	اس پر	شَيْءٌ	کوئی چیز	فِي الْاَرْضِ	زمین میں
وَلَا فِي السَّمَآءِ			اور نہ آسمان میں (5)		

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ یقیناً اللہ تعالیٰ پر زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ اس آیت میں فرمایا: دنیا کی تمام اشیاء جو زمین و آسمان کے درمیان موجود ہیں ان کا انتظام اور دیکھ بھال ہر چیز اللہ کی نظر میں ہے۔ کوئی ایک ذرہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کی ہر بڑی اور چھوٹی، ظاہر اور پوشیدہ چیز کا علم ہے، حالانکہ وہ عرش معلی پر ہے اور پھر اس طرف اشارہ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ایک بندے ہیں۔ جس طرح دوسرے انسانوں کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے ماں کے پیٹ میں پیدا کیا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماں کے پیٹ میں جیسے چاہا پیدا کیا، پھر وہ خدا یا خدا کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے، جیسا کہ نصرانیوں کا غلط عقیدہ ہے۔

اللہ رب العزت کی قدرت کا بیان

هُوَ	وہی ہے	الَّذِيْ	جو کہ
يُصَوِّرُكُمْ	تمہاری صورتیں بناتا ہے	فِي الْاَرْحَامِ	رحموں میں
كَيْفَ	جیسے	يَشَآءُ	وہ چاہتا ہے

لَآ اِلٰهَ	نہیں کوئی معبود	اِلَّا هُوَ	اس کے سوا
الْعَزِيْزُ	نہایت غالب ہے	الْحَكِيْمُ	خوب حکمت والا ہے۔(6)

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

وہ ماں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے،اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں وہ غالب ہے،حکمت والا ہے۔اس آیت میں بھی رب العزت کی قدرت کا بیان ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ایک قطرہ جو ماں کے رحم میں پڑتا ہے وہ بھی اللہ کی حکمت سے نشوونما پا کر ایک انسان کا بچہ بن کر دنیا میں آموجود ہوتا ہے۔وہ خوبصورت یا بدصورت،مذکر یا مونث،نیک بخت یا بد بخت،ناقص الخلقت یا تام الخلقت۔جب رحم مادر میں یہ سارے تصرفات صرف اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) الٰہ کس طرح ہو سکتے ہیں جو خود بھی اسی مرحلۂ تخلیق سے گزر کر دنیا میں آئے ہیں جس کا سلسلہ اللہ نے رحم مادر میں قائم فرمایا ہے۔اس کا نقشہ اس کی سیرت اور اس کا نصیب سب کچھ اللہ کی مرضی اور اس کی اجازت سے مکمل ہوتا ہے۔کوئی نہیں جان سکتا کہ آنے والا بچہ کیا نصیب کیا شکل اور کیا کردار لے کر آ رہا ہے مگر یہ سب اللہ کو معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ زبردست حکمت والا ہے۔ عام انسان کی پیدائش ماں اور باپ کی محتاج ہے لیکن اللہ تعالیٰ قدرت کاملہ رکھتا ہے وہ بغیر ماں باپ کے بھی انسان کو پیدا کر سکتا ہے۔جیسا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور پھر ان کی پیدائش میں اس کی کیا کچھ حکمتیں تھیں؟ یہ سب وہی جانتا ہے۔کسی بشر کو اجازت نہیں کہ اس کی حکمتوں سے انکار کرے یا اس کی قدرت،طاقت اور بڑائی سے انکار کرے۔

ان آیات میں دو باتوں کی وضاحت ملتی ہے۔ایک یہ کہ اللہ کی دی ہوئی راہنمائی یعنی قرآن پر یقین کامل کرنا اور دوسرے توحید پر یقین کامل رکھنا کہ بس وہی اللہ وحدہ لاشریک ہے اور کوئی عبادت کے لائق نہیں ہو سکتا۔

تاویلات کی شرعی حیثیت/علمِ تاویل کی تعریف وتوضیح

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ
مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ
الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ
يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑦

آیات متشابہات اور تاویل کا معنی ومفہوم

هُوَ الَّذِيْٓ	وہی ہے جس نے	اَنْزَلَ	نازل کی	عَلَيْكَ	آپ پر		
الْكِتٰبَ	کتاب	مِنْهُ اٰيٰتٌ	اُس کی بعض آیتیں	مُّحْكَمٰتٌ	محکم (واضح) ہیں		
هُنَّ	وہ	اُمُّ الْكِتٰبِ	کتاب کی اصل	وَاُخَرُ	اور (کچھ) دوسری		
مُتَشٰبِهٰتٌ	متشابہ (غیرواضح) ہیں	فَاَمَّا	درحقیقت				
الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	فِيْ قُلُوْبِهِمْ	ان کے دلوں میں	زَيْغٌ	کجی ہے		
فَيَتَّبِعُوْنَ	سو وہ پیروی کرتے ہیں	مَا	(اُن آیتوں کے) جو				
تَشَابَهَ	متشابہ ہیں	مِنْهُ ابْتِغَآءَ	اُن میں تلاش کرنے کیلئے				
الْفِتْنَةِ	فتنہ	وَابْتِغَآءَ	اور تلاش کرنے کیلئے	تَاْوِيْلِهٖ	اُن کی تاویل		

وَمَا	حالانکہ نہیں	يَعْلَمُ	جانتا	تَأْوِيلَهٗ	اُن کی تاویل (مطلب کوئی بھی)	
اِلَّا	سوائے	اللّٰهُ	اللہ کے	وَالرّٰسِخُوْنَ	اور وہ لوگ جو پختہ ہیں	
فِي الْعِلْمِ	علم میں	يَقُوْلُوْنَ	وہ کہتے ہیں	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے	
بِهٖ	اس پر	كُلٌّ	(یہ) سب	مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا	ہمارے رب کی طرف سے ہے	
وَمَا	اور نہیں	يَذَّكَّرُ	نصیحت حاصل کرتے	اِلَّآ	مگر	
اُولُوا الْاَلْبَابِ	عقل والے۔(7)					

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری جس میں واضح مضبوط آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ آیتیں ہیں مُحْكَمٰتٌ سے مراد وہ آیات ہیں جن میں اوامر ونواہی، احکام ومسائل اور قصص وحکایات ہیں جن کا مفہوم واضح اور اٹل ہے، اوران کے سمجھنے میں کسی کو اشکال پیش نہیں آتا۔یعنی قرآن مجید کی وہ آیات مراد ہیں، جن کا معنی ومقصود بالکل واضح ہے، اس کی مراد میں کوئی ابہام اوراشتباہ نہیں ہے، ان کے اصل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی احکام خداوندی کے جاننے کا مدار اور ہدایت کے لئے کافی وشافی ہیں۔اس کے برعکس آیاتٌ مُتَشَابِهَاتٌ ہیں مثلاً اللہ کی ہستی، قضاوقدر کے مسائل، جنت دوزخ، ملائکہ وغیرہ یعنی ماوراعقل حقائق جن کی حقیقت سمجھنے سے عقل انسانی قاصر ہو یاان میں ایسی تاویل کی گنجائش ہو یا کم ازکم ایسا ابہام ہو جس سے عوام کو گمراہی میں ڈالنا ممکن ہو۔یعنی ’متشابہ‘‘ ایسے کلام کو کہتے ہیں، جس کی مراد واضح نہ ہو، یا تو اس لفظ کا معنی ہی معلوم نہ ہو جیسے: ’’الم، الر‘‘ اور دوسرے حروف مقطعات، یا اصل معنی تو معلوم ہو؛ لیکن اس کا مصداق اوراس کی کیفیت معلوم نہ ہو، جیسے: يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ (الفتح:١٠)’اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے‘ یہاں ’’يَدُ الله‘‘ کا معنی معلوم ہے؛ لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کی کیفیت کیا ہوگی ؟اس سے اللہ کی قوت ونصرت مراد ہے یا واقعی اللہ کا ہاتھ مراد ہے؟اور ہاتھ ہی مراد ہو تو اس کی کیفیت کیا ہے؟اسی لئے متشابہات کے بارے میں سلف صالحین کی رائے ہے کہ ان پر اجمالی

ایمان لانا کافی ہے اور اس کی کھوج، کرید میں پڑنا نامناسب ہے۔ اسی لئے آگے کہا جارہا ہے کہ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ آیات متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کے ذریعے سے (فتنے) برپا کرتے ہیں۔ یعنی جو صاف اور صریح آیتیں ہیں، ان کے احکام پر تو عمل نہیں کرتے اور جن آیتوں پر صرف ایمان لانے کا حکم ہے، اُن سے عمل کا تعلق نہیں، محض اپنی کج ذہنی کی وجہ سے اُن کے معانی کی بے جا جستجو میں پڑے ہوئے ہیں۔ جیسے عیسائی ہیں۔ قرآن نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو عبداللہ اور نبی کہا ہے یہ واضح اور محکم بات ہے۔ لیکن عیسائی اسے چھوڑ کر قرآن کریم سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ جو کہا گیا ہے، اس سے اپنے گمراہ کن عقائد پر غلط استدلال کرتے ہیں۔ یہی حال اہل بدعت کا ہے۔ قرآن کے واضح عقائد کے برعکس اہل بدعت نے جو غلط عقائد گھڑ رکھے ہیں، وہ انہی مُتَشَابِهَاتٌ کو بنیاد بناتے ہیں۔ اور بسا اوقات مُحْكَمَاتٌ کو بھی اپنے فلسفیانہ استدلال کے گورکھ دھندے سے مُتَشَابِهَاتٌ بناتے ہیں۔ أَعَاذَنَا اللهُ مِنْهُمْ ۔ ان کے برعکس صحیح العقیدہ مسلمان محکمات پر عمل کرتا ہے اور مُتَشَابِهَاتٌ کے مفہوم کو بھی (اگر اس میں اشتباہ ہو) محکمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ قرآن نے انہی کو (اصل کتاب) قرار دیا ہے۔ جس سے وہ فتنے سے بھی محفوظ رہتا ہے اور عقائد کی گمراہی سے بھی۔ جَعَلَنَا اللهُ مِنْهُمْ ۔

زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لئے، حالانکہ ان کے حقیقی مراد کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ تاویل کا لفظ اَوْل سے مشتق ہے یعنی اپنی اصل کی طرف لوٹنا'' حوالہ: (غریب القرآن للاَصفہانی) اصطلاح شرع میں، ایک لفظ کو اس کے ظاہری معنی سے ہٹا کر ایک ایسے معنی پر محمول کرنا جس کا وہ احتمال رکھتا ہو اور وہ احتمال کتاب وسنت کے موافق ہو، مثلاً اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ'' وہ (اللہ تعالیٰ) مردے سے زندہ کو نکالتا ہے'' اگر اس

آیت میں انڈے سے پرندے کو نکالنا مراد ہو تو تفسیر ہے اور اگر کافر سے مومن کو پیدا کرنا یا جاہل سے عالم کو پیدا کرنا مراد ہو تو یہ تاویل ہے" حوالہ: (کتاب التعریفات، ص: 22، مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ، مصر) تاویل کی تعریف میں محی السّنۃ امام بغوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: پس جہاں تک تاویل کا تعلق ہے، پس یہ آیت کو کسی ایسے معانی کی طرف پھیرنا ہے جس کا وہ احتمال رکھتی ہے، جو اپنے ماقبل اور اپنے مابعد کے موافق ہو، استنباط کے طریقے سے جو قرآن وسنت کے مخالف نہ ہو، پس اہل علم نے اس کی اجازت دی ہے" حوالہ: (تفسیر بغوی، مقدمہ) سلف صالحین نے جہاں تاویلات کے جواز کیلئے بہت سے دلائل رقم فرمائے ہیں وہاں اس کے لیے کڑی شرائط بھی رقم فرمائیں تا کہ کوئی تاویل کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا تا رہے جیسا کہ علامہ جلال الدین سیوطی (رحمۃ اللہ علیہ) نے مفسر کے لیے فرمایا ہے کہ وہ ان 15 علوم کا جامع ہو۔ "علم لغت، علم نحو، علم صرف، علم اشتقاق، علم معانی، علم بیان اور علم بدیع، علم قرات، علم اصول دین، علم اصول فقہ، علم ناسخ ومنسوخ، علم فقہ، ان احادیث مبارکہ کا علم جو کہ تفسیر، مجمل اور مبہم کی مبیّن ہیں اور وہبی علم" یعنی اس قول کا مطلب یہ ہے کہ تاویل اس سے خاص ہے یعنی ان مذکورہ علوم کے علاوہ تاویل کے لیے نورِ معرفت ونورِ بصیرت بھی ضروری ہے کیونکہ تاویل کا تعلق قرآن کے باطن سے ہے اور اس کے بارے میں وہی بات کر سکتا ہے جس کا خود باطن روشن ہو۔

فتنہ سے مراد شر وفساد ہے

یعنی جن لوگوں کے دل حق سے متنفر اور باطل کی طرف مائل ہیں وہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جس سے ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں مختلف قسم کے شکوک وشبہات پیدا کریں۔ وہ متشابہات کے اصل مفہوم کی کرید میں لگ جاتے ہیں۔ جب ان کا اصل مفہوم حاصل نہیں کر پاتے تو مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ تاویل کے ایک معنی تو ہیں (کسی چیز کی اصل حقیقت) اس معنی کے اعتبار سے اِلَّا اللّٰہُ پر وقف ضروری ہے۔ جمہور علماء اور محدثین فرماتے ہیں کہ اس کی اصل مراد صرف اللہ کو معلوم ہے۔

اگر اللہ پر وقف کیا جائے تو مطلب بنے گا کہ: اور اللہ کے سوا کوئی اس کی تاویل نہیں جانتا۔ کیونکہ ہر چیز کی اصل حقیقت واضح طور پر صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ تاویل کے دوسرے معنی ہیں "کسی چیز کی تفسیر وتعبیر اور بیان وتوضیح" اس اعتبار سے اِلَّا اللہ پر وقف کے بجائے وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ پر بھی وقف کیا جاسکتا ہے، وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ اور پختہ ومضبوط علم والے یہی کہتے ہیں کہ ہم تو ان پر ایمان لاچکے، یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ مضبوط علم والے بھی صحیح تفسیر وتوضیح کا علم رکھتے ہیں۔ "تاویل" کے یہ دونوں معنی قرآن کریم کے استعمال سے ثابت ہیں۔ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ "یہاں بیان فرمایا ہے کہ یہ لوگ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس میں تحریف کرتے ہیں (یعنی یہاں تاویل بمعنی تحریف ہے جو تمام مکاتب فکر کے نزدیک جائز نہیں) مزید آگے فرماتے ہیں کہ بعض علماء "رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ" پر وقف کرتے ہیں، یہی اکثر مفسرین اور اہلِ اصول کی رائے اور دلیل یہ ہے کہ ایسی چیز جو سمجھ میں نہ آئے ایسا خطاب اللہ تعالیٰ کی جناب سے بعید ہے، حضرت عبداللہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ میں ان علماء راسخین میں سے ہوں، جو تاویل کو جانتے ہیں، پھر متشابہ آیات کی تفسیر ان محکم آیات سے کرتے ہیں جن میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ہوتی یوں قرآن کریم کی تمام آیات باہم مربوط اور منظم ہوجاتی ہیں، نیز ایک دوسرے کی تصدیق ہوجاتی ہے" (ملخص از ابن کثیر)

من گھڑت تاویلات کا شرعی حکم

تاویل کے جواز کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہر کوئی فرقہ باطنیہ کی طرح کی اپنے من پسند مطالب نکال کر اپنی خواہشات کی تکمیل کرتا رہے بلکہ یہ ایک نازک موضوع ہے اور اس کی اجازت "راسخون فی العلم" کو ہے اور "راسخون فی العلم" کے بارے میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہِ اقدس میں عرض کیا گیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "هو من برت يمينه وصدق لسانه وعف فرجه وبطنه فذالك الراسخ فى العلم"

''جس کی قسم پوری ہو، جس کی زبان نے سچ بولا ہو، اس کا دل مستقیم ہو، جس کی بطن اور شرمگاہ عفت مآب ہو، وہ ''راسخ فی العلم'' ہے'' حوالہ: (مجمع الزوائد للھیثمی، کتاب التفسیر)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ''تفسیر مظہری'' میں ''راسخون فی العلم'' کی تعریف میں صوفیاء کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو دل، نفس، عناصر کو فناء کرنے کے بعد خواہش نفس سے مطلقاً الگ تھلگ ہو چکے ہیں تجلیات ذاتیہ سے فیض یاب ہو رہے ہیں، انہیں کسی قسم کا شبہ لاحق نہیں ہوتا'' حوالہ: (تفسیر مظہری، سورۃ العمران زیر آیت: 7)

تاویل کرنے کا صرف اس کو حق حاصل ہے، جو اس کا اہل ہے اس لیے قرآن کی تفسیر چاہے جس صنف (صوفیانہ، صرفی، نحوی، فقہی، سائنسی وغیرہ) کی ہو اس کی اصل قرآن وحدیث ہے، کوئی تفسیر جب بھی اسلامی اصول کے مآخذ سے ٹکرائے گی اس کو رد کر دیا جائیگا جہاں تک قرآن پاک کی من مانی تاویلات کا تعلق ہے جیسا کہ فریب دینے والے گمراہ فرقوں کا طریق ہے کہ وہ نہ صرف ظاہر کا انکار کرتے ہیں بلکہ آیات مبارکہ کی اپنی طرف سے ایسی تاویلات کرتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تاویل کے اقرار وانکار کے بارے دو انتہائیں ہیں جنہوں نے صورتحال مکدّر کر رکھی ہے، ایک تو ایسے گمراہ فرقے تھے جنہوں نے تاویل کا سہارا لے کر گمراہ عقائد ونظریات کو فروغ دیا۔ دوسری انتہا وہ لوگ ہیں جو سرے سے تاویل کا انکار کرتے ہیں، تاویل کا مطلقاً انکار بھی ایک طرح کی گمراہی ہے۔ دراصل جو لوگ قرآن مجید کے بارے میں کسی درست رائے کو بھی اہمیت نہیں دیتے، شاید وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری نئی نسل علوم جدیدہ بالخصوص سائنس وغیرہ کی رہنمائی صرف یورپ سے حاصل کرے اور علوم جدیدہ کا بنیادی ذریعہ مغرب کو قرار دے۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کی سنت پہ عمل پیرا ہو کر تمام چیزوں کو قرآن مجید سے اخذ کرے جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) فرمایا کرتے تھے:

'لو ضاع لی عقال بعیر لوجدته فی کتاب اللہ تعالیٰ'

''اگر میرے لئے کسی اونٹ کی رسی (بھی) گم ہو جائے تو میں اسے کتاب اللہ میں پالوں گا''

حوالہ: (التفسیر والمفسرون للذھبی، باب: الفصل السابع: تفسیر الفقہاء، الاتقان)

یہ ایک حقیقت ہے ہمارے پاس اسلاف کی طرح زرخیز دماغ نہ رہے، جو سود و زیاں سے بڑھ کر سوچتے ہوں اور نہ وہ روشن قلوب رہے جن میں ہمہ وقت عشقِ مصطفٰی (ﷺ) کی شمع جگمگاتی ہو (الا ماشاء اللہ)؛ اور ہم نے اپنے قلوب و اذہان کو اس نہج پہ تیار ہی نہیں کیا کہ اس کے ظاہری و باطنی علوم کو اپنے اندر سمو سکیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے:

"جمیعُ العلمِ فی القرآن لکن تَقَاصر عنه أفهامُ الرجال"

"تمام علوم قرآن میں موجود ہیں لیکن لوگوں کی سمجھ کی ان تک رسائی نہیں"۔

حوالہ: (مرقاۃ المفاتیح، باب مناقب أهل بيت النبی رضی اللہ عنہا)

خلاصہ کلام

قرآن و سنت کا مسلمہ اصول ہے کہ جب قرآن و احادیث مبارکہ دو اقوال اگر بظاہر متعارض آرہے ہوں تو ان میں تطبیق پیدا کی جائیگی تو یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہوگا کہ تاویل کا مطلق انکار نہیں کیا جائیگا بلکہ جن روایات سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ تاویل جائز نہیں اس سے مراد وہ تاویل جو اپنی رائے پہ مشتمل اور قرآن و سنت کے مخالف ہوگی۔ ایسی تاویل جو قرآن و سنت کی روشنی میں کی جائے وہ برحق ہے اور جو قرآن و سنت کے مخالف ہوگی اس کو ترک کر دیا جائے جیسا کہ اکابرین اُمّت کا فتوٰی موجود ہے: "پس وہ تاویل جو آیت مبارک یا شرع کے مخالف ہو پس وہ ممنوع ہے کیونکہ جاہلوں کی تاویل روافض کی تاویل کی طرح ہے" حوالہ: (البرھان فی علوم القرآن للزرکشی)

آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن پاک میں ہر چیز کا بیان ہے اور ہر قسم کا علم ہے تو ہم اس سے کیوں محروم ہیں، اور ہمیں اس سے وہ موتی کیوں نہیں ملتے جن سے ہمارے اسلاف اپنے دامن کو بھرتے تھے، اس کی ایک وجہ ہمارے قلوب کا عشقِ مصطفٰی (ﷺ) سے خالی ہونا اور دوسری وجہ تدبرِ قرآن کو ترک کرنا ہے۔ اگر آج بھی ہم اپنے قلوب میں عشقِ مصطفٰی (ﷺ) کا چراغ جلا کر صحیح معنوں میں قرآن پاک میں غور و فکر اور تدبر شروع کر دیں تو اب بھی ہمیں ہر قسم کے

مسائل کا حل اور فولادی کردار کی وہ دولت مل سکتی ہے جس کے سامنے دنیا کی جبر و استبداد کی ہر قوت سرنگوں ہو سکتی ہے- بقول علامہ محمد اقبال (رحمۃ اللہ علیہ):

قرآں میں ہو غوطہ زن ہو اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

حوالہ: (ضربِ کلیم)

اللہ پاک ہم سب کو قرآن کی صحیح فہم عطا فرمائے اور اس کے ظاہری و باطنی فیوض و برکات سے مالا مال فرمائے- آمین!

استقامت اور رحمت کی دُعا / خاتمہ بالخیر کی دعا

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَیۡتَنَا وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ
الۡوَهَّابُ ⑧ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوۡمٍ لَّا رَیۡبَ فِیۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخۡلِفُ
الۡمِیۡعَادَ ⑨ اِنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ
شَیۡـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ ⑩ كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ
قَبۡلِهِمۡ ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ⑪

ہدایت پر استقامت

رَبَّنَا	اے ہمارے رب	لَا تُزِغۡ	نہ ٹیڑھا کر	قُلُوۡبَنَا	ہمارے دلوں کو
بَعۡدَ	بعد اس کے	اِذۡ	جب	هَدَیۡتَنَا	تو نے ہمیں ہدایت دی
وَهَبۡ	اور عنایت فرما	لَنَا	ہمیں	مِنۡ لَّدُنۡكَ	اپنے پاس سے
رَحۡمَةً	رحمت	اِنَّكَ اَنۡتَ	بیشک تو ہی ہے		
الۡوَهَّابُ	سب سے بڑا عطا کرنے والا۔				

یہ دعا اللہ تعالیٰ نے خود تعلیم فرمائی ہے۔ آج کل اس دعا کی بڑی ضرورت ہے، کیونکہ اسلامی عقائد سے منحرف اور متزلزل کرنے والے بہت سے دشمن پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اللہ اپنے فضل

سے ان ظالموں سے بچائے ۔ یہ وہ دعا ہے جو راسخ فی العلم حضرات اللہ تعالیٰ کے حضور کرتے رہتے ہیں، ہدایت پر ثابت قدمی کی دعا کے ساتھ قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیش ہونے کا یقین بھی ہر وقت ان کے پیش نظر رہتا ہے، ان کی اصل کوشش اور دعا دنیا کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے لیے ہوتی ہے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے: (يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ) "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔" [ترمذی، الدعوات۔:3522، وصححہ الألبانی]

یعنی راسخون فی العلم یہ بھی کہتے ہیں رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کرنا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت سے نوازا ہے۔ ہمیں اسی راہ ہدایت پر قائم رکھ۔ اسی لیے حضور ﷺ دعا کیا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ۔ یعنی اے دلوں کے پھیرنے والے، ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر قائم رکھ وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً۔ اور اپنی طرف سے ہمیں رحمت بخش۔ کیونکہ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ تو ہی سب کچھ دینے والا ہے۔ ساری کی ساری مخلوق تیری ہی محتاج ہے۔ تیرے بغیر کوئی کسی کی حاجت روائی نہیں کرسکتا۔ اس لیے اپنی رحمت سے تو ہی ہماری حاجات پوری فرما وَهَّابُ: اللہ تعالیٰ کے 99 صفاتی ناموں میں سے ایک صفاتی نام ہے، جس کے لفظی معنی بڑا دینے سب کچھ دینے والا۔ انسان اللہ سے دعا کرتا ہے کہ ہمارے ایمان کو سلامت رکھنا کیونکہ اس کی توفیق تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کس قدر بڑے پیغمبر تھے پھر بھی اللہ سے ایمان کی سلامتی کی دعا کرتے رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں چاروں طرف بیشمار دنیاوی رنگینیاں اور شیطانی بہکاوے ہیں انسان کسی بھی وقت پھسل سکتا ہے۔ لیکن اگر دست بدعا پھیلائے رکھے کہ اے رب! تو جو کہ وہاب یعنی سب کچھ عطا کرنے والا ہے ہمیں اپنے فضل و کرم سے ایمان کی سلامتی عطا کردے تو پھر کوئی مشکل ہے اور نہ کوئی پریشانی۔ پھر انسان دعا کرتا ہے اے ہمارے رب! بیشک تو ہم سب کو ایک مقرر دن ضرور اپنے حضور جمع کرنے والا ہے۔ اس دن کے آنے میں کوئی

شک نہیں اور وہ دن ایسا ہوگا کہ جس دن ہر انسان کا حساب کتاب لیا جائے گا۔کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارا روز قیامت پر پکا یقین ہے۔اس سخت دن کی تیاری دعا اور توبہ کے ساتھ ہر وقت کرتے رہنا چاہئے۔یہ دعا اللہ تعالیٰ نے خود تعلیم فرمائی ہے۔آج کل اس دعا کی بڑی ضرورت ہے، کیونکہ اسلامی عقائد سے منحرف اور متزلزل کرنے والے بہت سے دشمن پیچھے پڑے ہُوئے ہیں، اللہ اپنے فضل سے ان ظالموں سے بچائے۔کیونکہ موت کے بعد عمل کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور وہ زندگی ہمیشہ رہنے والی ہوگی۔اللہ کا وعدہ بڑا پکا وعدہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس دن کی تیاری کے لئے ہمت، طاقت اور راہنمائی عطا کرے۔

دعا کے فضائل و برکات

اس دعا کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہے کہ اس نے جو سیدھا راستہ (ہدایت) دکھایا ہے، اس پر ہمیشہ قائم رکھے۔دلوں کا بدلنا اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اس دعا سے دل میں ایمان پختہ ہوتا ہے۔انسان اس دعا کے ذریعے فتنوں، شبہات اور برے حالات میں گمراہ ہونے سے بچ جاتا ہے اور اس کا دل شک و تردید سے پاک رہتا ہے۔اس دعا کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذکر ہے (وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً)۔معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا اللہ کی خاص رحمت، بخشش اور فضل کو متوجہ کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔زندگی کے آخری لمحات میں ایمان سلامت رہنا سب سے بڑی کامیابی ہے۔یہ دعا اس بات کی ضمانت بنتی ہے کہ اللہ انسان کا خاتمہ ایمان پر فرمائے گا۔احادیث کی روشنی میں اہمیت: نبی کریم ﷺ بھی اس دعا کا کثرت سے اہتمام فرماتے تھے۔

نظریہ آخرت

رَبَّنَآ	اے ہمارے رب	اِنَّكَ	بیشک تو	جَامِعُ	جمع کرنیوالا ہے
النَّاسِ	لوگوں کو	لِيَوْمٍ	ایک دن	لَّا رَيْبَ	نہیں شک
فِيهِ	اس میں	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ		

لَا يُخْلِفُ	نہیں خلاف ورزی کرتا	الْمِيعَادَ	وعدے کی (9)

فرمایا پختہ علم والے یہ بھی دعا کرتے ہیں رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ اے ہمارے پروردگار! تو ہی لوگوں کو اس دن میں جمع کرنے والا ہے۔جس میں کوئی شک نہیں۔وہ دن یقیناً آنے والا ہے جس دن تمام مخلوق اپنے رب کے ہاں پیش ہوگی۔جس طرح انسان کو اپنے وجود پر شک نہیں۔اسی طرح قیامت کے برپا ہونے اور پھر محاسبے کا عمل واقع ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں وَعْدًا عَلَيْنَا۔اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔کہ ہم انسانوں کو دوبارہ اٹھائیں گے اور ان کا حساب لیں گے اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ہم ضرور ایسا کرنے والے ہیں۔لہٰذا اس میں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔یعنی عقل صحیح رکھنے والے بھی اور ٹیڑھی سوچ رکھنے والے،متشابہات کے پیچھے پڑنے والے،خود گمراہ ہونے والے اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے مومن ومشرک سب کو اکٹھا کر کے اور ان پر حجت قائم کر کے ان کے درمیان عدل وانصاف سے فیصلہ کرے گا۔ایمان بالآخرت،ایمان بالغیب کا ایسا اہم جزو ہے جو انسان کی زندگی کا رخ بدلنے میں موثر کردار ادا کرتا ہے۔لہٰذا یاد دہانی کے طور پر اس نظریہ آخرت کو (رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ) اور مومنوں کی دعا کا حصہ بنا دیا گیا۔فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ: بیشک اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔اللہ تعالیٰ جھوٹ سے پاک ہے لہٰذا وہ وعدہ خلافی نہیں فرماتا۔اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ بولنے کی نسبت قطعی کفر ہے اور یہ کہنا کہ "جھوٹ بول سکتا ہے" یہ بھی کفر ہے۔اللہ تعالیٰ جو وعدہ کرتا ہے اس کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا۔وہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے اس لیے اس کے بندے اس کے آگے دعا کرتے ہیں کہ مالک الملک اس دن ہمیں رسوائی حاصل نہ ہو۔ہم ذلیل وخوار نہ ہوں بلکہ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ہمیں خصوصی رحمت اور مہربانی عطا فرما۔اس آیت میں اعتراف ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور اللہ تعالیٰ تمام بنی آدم کو حشر میں جمع کرے گا۔اور سب سے حساب لے گا۔اللہ کے نیک بندے ہر وقت فکر آخرت میں لگے رہتے ہیں اور خدا کے سامنے حساب وکتاب کے نظارے سے ہر وقت ترساں اور لرزاں رہتے ہیں۔اے اللہ!اے دلوں کے پھیرنے والے خدا،ہمارے

دلوں کو اپنی ہدایت سے منور فرما دے یا اللہ تو اپنی رحمت سے ہم کو دین کی فہم سمجھ عطا فرما دے اور پھر ہدایت کے بعد ہم کو اس پر استقامت بھی نصیب فرما دے اے اللہ! ہماری دستگیری فرما اور ہر طرح کی کجی و گمراہی سے ہماری حفاظت فرما۔

مال اور اولاد کی خاطر طرح طرح کی بدعنوانیاں

اِنَّ	بیشک	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جنہوں نے
كَفَرُوْا	کفر کیا	لَنْ تُغْنِيَ	ہرگز نہیں کام آئیں گے
عَنْهُمْ	ان کے	اَمْوَالُهُمْ	مال ان کے
وَلَآ	اور نہ	اَوْلَادُهُمْ	اولاد اُن کی
مِّنَ اللّٰهِ	اللہ (کے عذاب) سے	شَيْـًٔا	کچھ بھی
وَاُولٰٓئِكَ هُمْ	اور یہی لوگ ہیں	وَقُوْدُ	ایندھن
النَّارِ		آگ کا۔	

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بیشک جن لوگوں نے کفر کیا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ ہرگز کام نہ آئیں گے ان کے مال اور نہ اولاد کچھ بھی۔ یعنی جب اللہ کی گرفت آئے گی تو مال و اولاد جن کی خاطر وہ ایمان سے محروم رہے، انہیں اس گرفت سے بچا نہ سکیں گے۔ دوسرے مقام پر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا میں سورہ شعراء میں یہ بات مذکور ہے۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ۔ قیامت کے دن نہ کسی کو مال فائدہ دیگا اور نہ اس کے بیٹے کام آئیں گے۔ ہاں وہاں پر کامیاب وہ ہوگا۔ جو قلب سلیم لے کر حاضر ہوگا۔ جس کے دل و دماغ میں ایمان کی شمع روشن ہوگی۔ اور جو اخلاص اور توحید پر قائم ہوگا۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۙ﴿۱۰﴾ اور یہی لوگ ہیں دوزخ کے ایندھن۔ آج کتنے لوگ ہیں۔ جو مال اور اولاد کی خاطر طرح طرح کی بدعنوانیوں میں مبتلا ہیں۔ ناانصافی، رشوت خوری۔ ذخیرہ اندوزی بلیک مارکیٹنگ سب کچھ مال و اولاد کی خاطر ہو رہا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن یہ

لوگ تہی دست ہوں گے۔ دنیا میں کمائے ہوئے مال ان کے کچھ کام نہ آسکیں گے اور یہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائیں گے۔ سورۃ الحاقہ میں بھی آتا ہے کہ جس بد بخت کا اعمالنامہ اس کے بائیں ہاتھ میں آئیگا وہ چیخ و پکار کرے گا۔ کاش مجھے یہ اعمالنامہ ملتا ہی نہ، مجھ سے حساب کتاب نہ لیا جاتا، میرا کام ہی تمام کر دیا جاتا، کیونکہ مَآ اَغْنٰى عَنِّىْ مَالِيَهْ۔ آج میرے مال نے مجھے کوئی نفع نہ پہنچایا۔ ان آیات کا اشارہ مدینے کے ارد گرد بسنے والوں یہودیوں کی طرف بھی ہے جنگ بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ تو یہودیوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مکہ والے لڑائی سے نابلد تھے۔ اگر کہیں ہم سے پالا پڑتا تو مسلمانوں کو بتا دیتے کہ لڑائی کیسے ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں پر ان یہودیوں کا بھی رد ہے کہ یہ ان کی غلط فہمی ہے کہ وہ بڑے مالدار لوگ ہیں۔ سچے دین کے مقابلے میں ان کے مال اور اولاد ان کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتے۔ اس ذہن کے عیسائیوں اور دیگر مشرکین کو بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ظاہری ساز و سامان پر نہ اترائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے ماننے والوں کی مدد فرماتا ہے۔ تو مخالفین کی تمام تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اور اللہ کے دین کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔

گناہوں میں مبتلا اور تکبر کرنے والوں کا انجام

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ	آلِ فرعون کی عادت کی مانند	وَالَّذِيْنَ	اور اُن لوگوں کے جو
مِنْ قَبْلِهِمْ	اُن سے پہلے تھے	كَذَّبُوْا	انہوں نے جھٹلایا
بِاٰيٰتِنَا	ہماری آیتوں کو	فَاَخَذَهُمُ	پس انہیں پکڑا
اللّٰهُ	اللہ نے	بِذُنُوْبِهِمْ	ان کے گناہوں کے سبب
وَاللّٰهُ	اور اللہ	شَدِيْدُ الْعِقَابِ	سخت عذاب دینے والا ہے

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ داب کے معنی عادت اور خصلت کے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دو اقوام کے عادات و خصائل کا موازنہ فرمایا۔ یہ جملہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اللہ کے احکامات کو نہیں مانتے اور اس کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ پاک فرماتا ہے کہ ان کافروں کا انجام بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا فرعون اور اس کے ساتھیوں کا ہوا تھا، فرعون نے بہت تکبر (گھمنڈ) کیا۔

اس نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلا دیا۔اس کی پاداش میں، اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس کے لشکر کو پانی میں غرق کر کے ہمیشہ کے لیے ہلاک کر دیا۔ یہ مثال ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ گناہوں اور تکبر کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص بھی حق کی راہ چھوڑ کر ظلم اور انکار کا راستہ چنے گا، تو وہ اللہ کی سخت پکڑ سے نہیں بچ سکے گا۔ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد وہ تمام پہلی قومیں ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے انبیاء کا انکار کیا۔ فرمایا۔ کفار مکہ کی عادات بھی ان گذشتہ اقوام کی عادات وخصائل کے مطابق ہیں كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ آیات سے مراد احکام بھی ہیں اور معجزات بھی۔ گویا ان لوگوں نے نہ تو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پرواکی اور نہ ہی پیغمبر کے معجزے کو سچا جانا۔ بلکہ جب کبھی ایسی بات دیکھتے تو کہتے کہ یہ تو محض جادو کا کرشمہ ہے۔ انہوں نے اپنے انبیاء کو کبھی مجنوں کہا۔ کبھی شاعر کہا اور اس طرح ہمارے انبیاء اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۔اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں کی پاداش میں انہیں پکڑ لیا۔ گویا سمجھانا یہ مقصود ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس طرح اہل مکہ یا مدینہ کے یہود ونصاری بھی اپنی بری حرکتوں سے باز نہ آئے تو وہ بھی ایسی ہی گرفت میں آجائیں گے اور پھر ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ⑪ اور اللہ تعالیٰ سخت گرفت کرنے والا ہے۔ جب وہ پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں۔ جیسا کہ سورہ بروج میں فرمایا اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ۔ تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے اس کے غضب کو دعوت نہ دینا۔ وہ حلیم بھی ہے مہلت بھی دیتا ہے مگر جب پکڑتا ہے۔ تو رہائی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یعنی جس طرح کا عذاب قوم فرعون اور پہلی امتوں کو رسولوں کو جھٹلانے کی وجہ سے دیا گیا، اسی طرح کا عذاب ان اموال واولاد والے کفار کو دیا جائے گا۔ یہاں ان کفار سے مراد وفد نجران، یہود، مشرکین عرب اور دوسرے تمام کفار بھی ہوسکتے ہیں۔(شوکانی) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سب کافروں کو خواہ وہ مشرکین تھے یا یہود مدینہ یا منافقین اور مشرکین مدینہ یا نصاریٰ جو اسلام کے خلاف محاذ آرائی پر اتر آئے تھے۔ متنبہ فرمایا کہ اسلام دشمنی سے باز آجاؤ ورنہ جس طرح آل فرعون اور قوم عاد، ثمود وغیرہ تباہ و برباد کیئے جا چکے ہیں۔

تمہارا بھی وہی حشر ہونے والا ہے۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر اور گناہوں کی پاداش میں دھر لیا تھا اور تمہیں بھی دھرے گا کیونکہ اللہ اپنے مسلمان بندوں سے دشمنی رکھنے والوں کو سزا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔

چند ہی سال میں اسلام کا بول بالا/ فتح اللہ عزّ وجلّ کی نشانیوں میں سے بڑی نشانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَھَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِھَادُ ⑫ قَدْ
کَانَ لَکُمْ اٰیَۃٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ
یَّرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ
لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ⑬

یہود مدینہ بالخصوص اس آیت کے مخاطب

قُلْ	کہہ دیجئے	لِّلَّذِیْنَ	اُن لوگوں سے جنہوں نے
کَفَرُوْا	کفر کیا	سَتُغْلَبُوْنَ	عنقریب تم مغلوب کئے جاؤ گے
وَ تُحْشَرُوْنَ	اور تم اکٹھے کئے جاؤ گے	اِلٰی جَھَنَّمَ	جہنم کی طرف
وَبِئْسَ	اور (وہ) بہت برا	الْمِھَادُ	ٹھکانا ہے

ان کفار کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہوتا ہے قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔ ان کافروں سے کہہ دیجئے ۔ سَتُغْلَبُوْنَ تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے ۔ اور آج تم جن غریب، کمزور اور ناتواں مسلمانوں کو بے بس سمجھ رہے ہو، یہی تم پر غالب آئیں گے ۔ تمہارا یہ حشر تو اسی دنیا میں ہوگا ۔ جس میں

کوئی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اور آخرت میں وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ تمہیں جہنم کی طرف اکٹھا کیا جائے گا تم سب کو اس طرف ہانک کر لے جایا جائے گا۔ اس آیت میں اگرچہ روئے خطاب سب قسم کے کافروں سے ہے تاہم یہود مدینہ بالخصوص اس آیت کے مخاطب ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں مسلمانوں کو فتح عظیم عطا فرمائی اور اس سے متاثر ہو کر عبداللہ بن ابی (رئیس منافقین) نے اپنے ساتھیوں سمیت اسلام قبول کر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے درمیان بسنے والے یہود بنو قینقاع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے یہود! اسلام قبول کر لو تو عافیت میں رہو گے ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو مشرکین مکہ کا ہوا ہے لیکن وہ بجائے نصیحت قبول کرنے کے شیخی میں آگئے کہنے لگے کہ مکہ کے کافر تو جاہل اور فنون جنگ سے نا آشنا تھے جو پٹ گئے، ہم سے سابقہ پڑا تو سمجھ آجائے گی۔ اس سلسلہ میں مفسرین نے مکہ کے مشرکین کا بھی ذکر کیا ہے اور مدینہ کے یہود کا بھی، حقیقت یہ ہے کہ اس میں دونوں ہی گروہوں کا ذکر ہے، مشرکین مکہ پر غزوۂ بدر اور پھر فتح مکہ کے موقع سے مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا اور یہودیوں پر غزوۂ بنو قریظہ اور غزوۂ خیبر کے موقع سے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پیشین گوئی جس طرح حرف بہ حرف پورا ہوا اس پر تاریخ شاہد ہے کہ سب سے پہلے یہی یہود بنو قینقاع جلاوطن کئے گئے۔ تو انہوں نے خیبر جا کر دم لیا۔ پھر یہود بنو نضیر جلاوطن ہوئے تو انہوں نے بھی خیبر کی راہ لی، پھر بنو قریظہ کی باری آئی تو قتل کئے گئے اور لونڈی وغلام بنا لیے گئے۔ پھر خیبر میں یہود کی پٹائی ہوئی تو بحیثیت مزارعہ وہاں آباد رہنے کی درخواست کی جسے رسول اللہ ﷺ نے منظور فرما لیا۔ تاہم یہود چونکہ ایک فتنہ انگیز قوم ہے ان کی شرارتوں کی بنا پر بالآخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں یہاں سے بھی نکال باہر کیا۔ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ⑫ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ یاد رہے کہ کافروں کے حق میں یہ پیشین گوئی اس وقت کی گئی جب مسلمانوں پر ہر وقت خوف و ہراس کی فضا طاری رہتی تھی، اگرچہ اس وقت مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی نوزائیدہ ریاست کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ لیکن وہ ہر لحاظ سے کمزور اور اقلیت میں تھے اور عرب بھر کے مشرکین، یہود اور نصاریٰ اور منافقین اس ریاست کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے اور ان سب گروہوں کے مقابلہ

میں مسلمانوں کی کامیابی کے آثار دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن اللہ کی مدد مسلمانوں کے یوں شامل حال ہوئی اور حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ یہ سب فرقے باری باری مات کھاتے گئے اور چند ہی سال بعد عرب بھر میں اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

یہودِ مدینہ کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین

قَدْ كَانَ	تحقیق ہے	لَكُمْ	تمہارے لیے
اٰيَةٌ	(عظیم) نشانی	فِیْ فِئَتَيْنِ	اُن دو گروہوں میں
الْتَقَتَا	وہ باہم (لڑائی کیلئے) آمنے سامنے ہوئے	فِئَةٌ	ایک گروہ
تُقَاتِلُ	لڑتا تھا	فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ	اللہ کی راہ میں
وَ اُخْرٰى	اور دوسرا	كَافِرَةٌ	(گروہ) کافر تھا
يَّرَوْنَهُمْ	وہ (مسلمان) دیکھتے تھے اُن کو	مِّثْلَيْهِمْ	اپنے سے دگنا
رَاْیَ الْعَيْنِ	کھلی آنکھوں سے	وَ اللّٰهُ	اور اللہ
يُؤَيِّدُ	تائید کرتا ہے	بِنَصْرِهٖ	اپنی مدد کے ساتھ
مَنْ يَّشَآءُ	جس کو وہ چاہتا ہے	اِنَّ	بیشک
فِیْ ذٰلِكَ	اس میں	لَعِبْرَةً	البتہ عبرت ہے
لِّاُولِی الْاَبْصَارِ	اہلِ بصیرت کے لیے		

فرمایا قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِیْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا۔ تمہارے لیے آپس میں ٹکرانے والے دو گروہوں میں نشانی ہے۔ ان دو گروہوں سے مراد مسلمان مدینہ اور کفار مکہ ہیں۔ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ ایک گروہ وہ تھا جو اللہ کی راہ میں لڑتا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی جماعت۔ یہ گروہ نبی آخر الزماں (علیہ السلام) پر ایمان لانے والا گروہ تھا جو اللہ کی توحید اور اس کی کتاب کے غلبے کے لیے جہاد کر رہا تھا وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ اور دوسرا گروہ کفار مکہ کا تھا جو کفر کو غالب کرنا چاہتا تھا۔ پیچھے یہ پیشینگوئی کی گئی تھی کہ کفار مسلمانوں سے مغلوب ہوں گے، اب اس کی ایک مثال دینے کی غرض سے

جنگ بدر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں کافروں کا لشکر ایک ہزار مسلح لوگوں پر مشتمل تھا اور مسلمانوں کی تعداد کل تین سو تیرہ تھی، کافر کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور کافروں کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ ذکر کر کے یہود مدینہ کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ فرمایا مسلمانوں کی فتح کی جو وجہ تم سمجھ رہے ہو۔ یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ۔ وہ خود اپنی آنکھ سے انہیں دگنا دیکھتے ہیں۔ اس دیکھنے کا تعلق دونوں گروہوں سے ہے۔ اہل ایمان دیکھ رہے تھے۔ کہ کفار ان سے تعداد میں بھی زیادہ تھے۔ اور دوسری طرف یہ بھی معنی ہے کہ کفار مسلمانوں کو اپنے سے دگنی تعداد میں دیکھتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد کے کے لیے فرشتوں کو بھیج دیا تھا۔ اس کی تفصیل اور حکمت خداوند کریم نے سورہ انفال میں بیان فرمادی ہے۔ یہ آیت غزوہ بدر کے متعلق نازل ہوئی اور اس میں یہودیوں یا تمام کافروں یا مسلمانوں یا مذکورہ بالا سب کو خطاب ہے کیونکہ غزوہ بدر میں مسلمانوں اور کافروں سب کیلئے عبرت و نصیحت تھی۔ غزوہ بدر 17 رمضان 2 ہجری بروز جمعہ ہوا۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کا ظاہری حال تو یہ تھا کہ ایک ہزار مسلح افراد کے مقابلے میں صرف تین سو تیرہ یا تین سو انیس مجاہدین تھے۔ کل ستر اونٹ، دو گھوڑے چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں ان کا سامان جنگ تھا کفار کے پاس سامانِ ضرب وحرب میں ہر چیز موجود تھی۔ ہر روز اونٹ ذبح کر کے کھاتے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ ناچنے گانے والی عورتیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو کامل فتح ہوئی اور کفار کو شکستِ فاش، لہٰذا یہ فتح اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی نشانیوں میں سے بڑی نشانی ہے۔ بہر صورت یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی تائید تھی۔ اسی پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے جس کی چاہتا ہے تائید فرماتا ہے خواہ اس کی تعداد قلیل ہی ہو اور سر و سامان کی کتنی ہی کمی ہو۔

نصرتِ خداوندی

مگر اللہ تعالیٰ کا اعلان یہ ہے۔ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی

تائید سے مدد فرماتا ہے۔مسلمانوں کے پاس اس قدر کم تعداد اور قلیل سامان ہونے کے باوجود تائید ایزدی مسلمانوں کے حق میں تھی۔کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔کہ مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوگی ۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ⑬ ۔ایسے واقعات میں عبرت ہے۔ان لوگوں کے لیے جو صاحب بصیرت ہیں۔اللہ تعالیٰ نے طاقتور دشمن کو کیسی عبرتناک شکست دی۔مسلمانوں میں سے صرف چودہ شہید ہوئے۔جن میں ایک سولہ سال کا نوجوان بھی تھا۔

جوان اور نوجوان کے درمیان بنیادی فرق

(اردو میں جوان اور نوجوان کے درمیان بنیادی فرق عمر اور جذبے کا ہے۔نوجوان: یہ اس عمر کا ابتدائی حصہ ہے جس میں انسان نیا جوش، شوق اور کچی عمر کے جذبات رکھتا ہے۔۔نوجوان ایک مرکب لفظ (نو + جوان) ہے، جو 15 سے 24 سال تک کے ان افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے جو عمر کے ابتدائی حصے میں ہوں اور جن میں نیا جوش، ولولہ اور توانائی ہو۔جوان: یہ وہ مرحلہ ہے جب انسان جسمانی اور ذہنی پختگی کی طرف بڑھتا ہے اور زندگی کے اہم فیصلے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔جوان ایک صفت یا بالغ فرد ہے جس کی عمر عموماً 15 سے 40 سال کے درمیان ہو۔) بہرحال ان کی قبور وہیں میدان بدر میں ہیں۔برخلاف اس کے کفار کے بڑے بڑے سرکردہ اشخاص سمیت ستر مارے گئے۔اور اتنی ہی تعداد میں قیدی بنا لیے گئے۔بہت سا مال غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔بچے کھچے کفار نہایت ذلت کے ساتھ بھاگ گئے۔مکہ پہنچ کر بڑی خفت اٹھانی پڑی۔مکہ والے فتح کی خوشخبری کے منتظر تھے۔مگر ان کی امیدوں پر خاک پڑ گئی۔یہ واقعہ بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کی مراد یہودیوں کو عبرت دلانا ہے۔کہ تم سامان حرب پر فخر نہ کرنا۔ماہرین جنگ پر غرور نہ کرنا۔اپنے تجربے اور جنگی چالوں پر نہ جانا۔اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو قلیل لشکر کو کثیر پر غالب کر دیتا ہے۔اس آیت میں فرمایا: اللہ نے مومنوں کی مدد کی تو انہوں نے کفار کو شکست دی، ان کے سرداروں کو تہ تیغ کیا اور بہت سے افراد کو قید کر لیا۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جو کوئی اللہ کے دین کی مدد کرتا ہے، اللہ اس کی مدد کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے اللہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔اس میں

آنکھوں والوں کے لئے عبرت ہے۔

بصارت اور بصیرت سے مراد

یعنی جن کی بصیرت اور عقل کامل ہے، جس کی وجہ سے وہ دیکھ رہے ہیں کہ جس جماعت کی مدد کی گئی ہے وہی اہل حق ہیں اور دوسرے باطل پر ہیں۔ورنہ محض ظاہری اسباب، سامان اور تعداد پر نظر رکھنے والا یہی فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس چھوٹی سی جماعت کا اتنی بڑی جماعت پر فتح پانا بالکل محال اور ناممکن ہے۔لیکن بصارت سے نظر آنے والے ان اسباب کے پیچھے ایک عظیم تر سبب بھی ہے۔ جسے بصیرت، ایمان اور توکل علی اللہ کی نظر ہی دیکھ سکتی ہے اور وہ سبب ہے اللہ کا اپنے مومن بندوں کو فوقیت بخشنا اور اپنے کافر دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کرنا۔بصارت سے مراد ظاہری آنکھوں کی بینائی، دیکھنا یا مشاہدہ کرنا ہے، جبکہ بصیرت سے مراد باطنی آنکھ، عقل، فہم اور حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت ہے۔اسے سادہ الفاظ میں یوں سمجھا جاسکتا ہے: بصارت یہ ایک جسمانی فعل ہے جس سے انسان ظاہری چیزوں، مناظر اور رنگوں کو دیکھتا ہے۔یہ آنکھوں کا کام ہے جو ہر جاندار کو میسر ہے۔بصیرت یہ ایک روحانی اور ذہنی کیفیت ہے جو عقل، شعور اور سمجھ بوجھ سے تعلق رکھتی ہے۔یہ انسان کو حق و باطل میں تمیز کرنے، گہرائی میں جانے اور نتائج کا اندازہ لگانے کی صلاحیت دیتی ہے۔مختصر یہ کہ بصارت اشیاء کی بیرونی صورت دکھاتی ہے، جبکہ بصیرت ان کی اندرونی حقیقت اور معنی کو آشکار کرتی ہے۔بہرصورت یہ کئی لحاظ سے نہایت اہم جنگ تھی ایک تو اس لئے کہ یہ پہلی جنگ تھی دوسرے یہ جنگی منصوبہ بندی کے بغیر ہوئی مسلمان ابوسفیان کے قافلے کے لئے نکلے تھے جو شام سے سامان تجارت لے کر مکہ جارہا تھا مگر اطلاع مل جانے کی وجہ سے وہ اپنا قافلہ بچا کر لے گیا لیکن کفار مکہ اپنی طاقت وکثرت کے گھمنڈ میں مسلمانوں پر چڑھ دوڑے اور مقام بدر پر یہ پہلا معرکہ برپا ہوا تیسرے اس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد حاصل ہوئی چوتھے اس میں کافروں کو عبرت ناک شکست ہوئی جس سے آئندہ کے لئے کافروں کے حوصلے پست ہوگئے۔مسلمانوں کے پاس اسباب و ذرائع سے تو بہت ہی معمولی تھے مگر ایک چیز بڑی زبردست مسلمانوں کے پاس تھی

اور وہ تھی کامل توکل، استقلال، اللہ کی مدد اس کے وعدے اور ایمان کی طاقت پر بھروسہ، یہ سب جذبات مسلمانوں کی نصرت اور فتح یابی کا سبب بنے۔ کیونکہ کفار کے پاس نہ تو ایمان تھا نہ وہ جذبہ، نہ توکل اور نہ ہی یقین کامل تھا ان کو اگر بھروسہ تھا تو وہ صرف اپنے ساز و سامان پر اور اپنی بڑی تعداد پر اور یہی غلط جذبہ ان کی شکست کا سبب بنا۔ حق تعالیٰ جل شانہٗ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خصوصاً اصحاب بدر کی مقبولیت کی طفیل میں ہمیں بھی اسلام اور ایمان سے سچی محبت نصیب فرمائے اور اسلام کی عزت و شوکت کے لئے اپنی جان و مال کو قربان کرنے کا جذبہ عطا فرمائیں اور اپنی تائید و نصرت سے اہل اسلام کو غلبہ عطا فرمائیں اور دشمنان دین کو مغلوب فرمائیں اے اللہ! جیسے آپ نے جنگ بدر میں بے سر و سامان صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ہاتھوں کفار کو ذلیل و خوار فرما دیا اے اللہ! اب بھی اہل اسلام کی مدد فرما دے اور دشمنانِ دین کو ذلیل خوار فرما دے۔

دنیاوی زندگی گزارنے کا سامان/عورت جس قدر عفت مآب ہوگی صاحب فضیلت اور صاحب کمال ہوگی

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ
الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ⑭

من پسند چیزوں کی محبت

زُيِّنَ	خوشنما کر دی گئی	لِلنَّاسِ	لوگوں کے لیے			
حُبُّ الشَّهَوٰتِ	محبت (نفسانی) خواہشوں کی	مِنَ النِّسَآءِ	عورتوں سے			
وَالْبَنِيْنَ	اور بیٹوں (سے)	وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ	اور جمع کیے ہوئے خزانوں (سے)			
مِنَ الذَّهَبِ	سونے کے	وَالْفِضَّةِ	اور چاندی (کے)			
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ	اور نشان زدہ گھوڑوں (سے)	وَالْاَنْعَامِ	اور مویشیوں (سے)			
وَالْحَرْثِ	اور کھیتی (سے)	ذٰلِكَ	یہ (سب)			
مَتَاعُ	ساز و سامان ہے	الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	حیاتِ دنیا کا			

اچھا ٹھکانہ	حُسْنُ الْمَاٰبِ	اسی کے پاس ہے	عِنْدَهٗ	اور اللہ	وَاللّٰهُ

فرمایا: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ... الشَّهَوٰتِ" یہ "شَهْوَةٌ" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "کسی مرغوب چیز کی طرف نفس کا کھنچ جانا" یہاں "الشَّهَوٰتِ" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو طبیعت کو مرغوب ہیں، اور "مِنَ النِّسَآءِ" میں "مِنْ" بیانیہ ہے، یعنی وہ چیزیں یہ ہیں انسان کو جو چیزیں اپنی طرف راغب کرتی ہیں، ان میں سب سے زیادہ آدمی جن سے متاثر ہوتا ہے؛ وہ عورتیں ہیں، پھر اولاد، اس کے بعد مال و اسباب، قرآن نے اسی ترتیب سے ان تینوں چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اگر عورت کی محبت حد سے بڑھ جائے تو پھر یہی چیز انسان کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ تاریخ میں کتنے واقعات محفوظ ہیں۔ جن کا مرکزی کردار عورت تھی۔ اسی کی وجہ سے بڑی بڑی سازشیں پیدا ہوئیں بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہوگئیں۔ بے حیائی کو اس قدر ترقی حاصل ہوئی۔ کہ اب یورپ والے بھی کان پکڑتے ہیں۔ آج بیشتر گمراہی اور نیکی سے دوری عورت کی وجہ سے ہے۔ اور اس کے ذمہ دار خود مرد ہیں جو عورت کو ہر میدان میں گھسیٹ لائے۔ ان کی رسائی تعلیمی اداروں تک تو درست تھی کہ بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں اور پردے اور شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں مگر جب یہی عورتیں دکانوں کی زینت بن گئیں، دفتروں اور ہسپتالوں میں پہنچ گئیں ہوائی جہازوں میں ائرہوسٹس بن گئیں، فوج میں بھرتی ہونے لگیں، تو گمراہی کا ذریعہ بن گئیں۔ یہی کچھ انگریز نے کیا تھا۔ اور اب مشرق بھی مغرب کی تقلید میں بھاگا جا رہا ہے۔ حالانکہ حضور نبی کریم (علیہ السلام) کا فرمان ہے کہ عورت کو اس مقام پر رکھو جہاں اللہ نے اسے رکھا ہے نماز کے لیے عورت اگلی صف میں کھڑی نہیں ہوسکتی۔ اس کا مقام پچھلی صف حتیٰ کہ بچوں سے بھی پیچھے ہے۔ عورت جس قدر عفت مآب ہوگی صاحب فضیلت اور صاحب کمال ہوگی۔ جوں جوں عریانی کے کاموں میں آگے بڑھے گی، عورت عورت نہیں رہے کچھ اور چیز ہی بن جائیگی۔ کھیل کے میدان میں عورت کو فٹ بال، والی بال کرکٹ، ہاکی حتٰی کہ آج کل تو ریسلنگ تک وغیرہ کھلائی جا رہی ہے۔ مرد و زن سب دیکھ رہے ہیں۔ خرابی نہیں آئیگی تو اور کیا ہوگا۔ مردوں کے خیالات پراگندہ ہوں

گے۔اور نتیجہ ظاہر ہے اس لیے اسباب ضلالت میں عورت کو پہلے نمبر پر رکھا گیا ہے۔

پارلیمان میں خواتین کی نمائندگی

اب جمہوریت نے نیا گل کھلایا ہے۔ ہر سطح پر عورتوں کی نمائندگی بھی ضروری ہے۔ کہتے ہیں کہ مرد وزن ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دونوں پہیوں کو برابر چلنا چاہئے، ورنہ زندگی کی گاڑی جام ہو کر رہ جائے گی۔ لہٰذا مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو میونسپل کمیٹیوں کے ممبر بناؤ۔ صوبائی اور قومی اسمبلی میں نمائندگی دو۔ وزارت ومشاورت کے قلمدان ان کے سپرد کرو۔ ان کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ کس قدر گمراہی کی بات ہے۔ عورت سے مشورہ کرنے کی ممانعت نہیں۔ حضور ﷺ خود عورتوں کے مسائل میں اپنی عورتوں سے بات پوچھ لیتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر والی سے مشورہ کر لیتے تھے، مگر گھر میں، اپنے مقام پر۔ مشورہ کے لیے اسمبلی اور مجلس مشاورت میں کھینچ لانا کہاں سے نکال لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اَلنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّیْطَانِ۔ یعنی عورتیں شیطان کا جال ہیں۔ انہی کے ذریعے شیطان لوگوں کو پھانستا ہے۔ اور پھر بڑے بڑے قبیح واقعات پیش آتے ہیں۔ بڑے بڑے سکینڈل بنتے ہیں۔ حتی کہ تاریخ کا رخ مڑ جاتا ہے۔

وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ... اَلْقَنَاطِيْرِ" کا واحد "قِنْطَارٌ" ہے، اس کی مقدار میں مختلف اقوال ہیں، مگر سب کا حاصل یہ ہے کہ مال کثیر کو "قِنْطَارٌ" کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی) مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ یعنی لوگوں کیلئے من پسند چیزوں کی محبت کو خوشنما بنا دیا گیا، چنانچہ عورتوں، بیٹوں مال واولاد، سونا چاندی، کاروبار، باغات، عمدہ سواریوں اور بہترین مکانات کی محبت لوگوں کے دلوں میں رچی ہوئی ہے اور اِس آراستہ کئے جانے اور ان چیزوں کی محبت پیدا کئے جانے کا مقصد یہ ہے کہ خواہش پرستوں اور خدا پرستوں کے درمیان فرق ظاہر ہو جائے، چنانچہ سورۂ کہف، آیت 7 میں صراحت سے ارشاد فرمایا: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الکھف: ۷) بیشک ہم نے زمین پر موجود چیزوں کو اس لئے زینت بنایا تا کہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے۔

اسباب ضلالت

وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔ "وَالْخَيْلِ" یہ اسم جمع ہے، "خُيَلَاءٌ" سے مشتق ہے، جس کا معنی تکبر ہے۔ گھوڑے کی چال میں ایک طرح کا تکبر پایا جاتا ہے۔ عرب ان گھوڑوں پر نشان لگا کر رکھا کرتے تھے جو بہت تیز رفتار ہوتے اور گھوڑ دوڑ کے کام آتے، یہاں ایسے ہی گھوڑوں کا ذکر ہے، یہ بہت قیمتی سمجھے جاتے تھے۔ "اَلْاَنْعَامِ" یہ "نَعَمٌ" کی جمع ہے، اونٹ، گائے، بکریاں وغیرہ اور اکثر اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ طاقتور گھوڑے اور دیگر مال ڈنگر مویشی بھی اسباب ضلالت میں سے ہیں۔ یہ بھی انسان کی مرغوب اشیاء میں سے ہیں۔ انسان ان سے خوب نفع حاصل کرتا ہے۔ گائے بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ وغیرہ سے دودھ حاصل کرتا ہے۔ اور ان کا گوشت کھاتا ہے۔ ان سے سواری اور بار برداری کا کام بھی لیتا ہے۔ یہ انسان کی اچھی خاصی جائداد ہوتی ہے۔ اور ان سے محبت بھی فطری ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص ان کی محبت میں اس قدر غرق ہو جائے کہ ان کی دیکھ بھال میں نمازوں کی پروا نہ کرے۔ دیگر نیکی کے کاموں کی طرف توجہ ہی نہ دے سکے۔ گویا وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ گائے بیل کی دم پکڑ کر بیٹھا رہے۔ یہ سنن ابی داود اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کا جملہ ہے یعنی مال انسان کے لیے گمراہی کا سبب بن جائے گا۔ لہذا اس سے بھی خبر دار کیا گیا ہے۔ اس جملے میں" گائے کی دم میں پکڑنے" سے کنایہ ہے۔ اس سے مراد کاشتکاری، مال و دولت کمانے اور دنیا کی دنیاوی مشغولیات میں غرق ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب زراعت یا کاروبار کی مذمت نہیں، بلکہ اس روش کی مذمت ہے جس میں انسان دین کے بنیادی فریضے (جیسے جہاد اور اقامتِ دین) کو چھوڑ کر مکمل طور پر دنیا اور مال و دولت سمیٹنے میں لگ جائے اور آخرت کو فراموش کر دے۔

چنانچہ یہ چیزیں ایسی مرغوب ہوئیں کہ کافر تو بالکل ہی آخرت سے غافل ہو گئے اور کفر میں جا پڑے جبکہ دوسرے لوگ بھی انہی چیزوں کی محبتوں کے اسیر ہو گئے حالانکہ یہ تو دنیاوی زندگی گزارنے کا سامان ہے کہ اس سے کچھ عرصہ نفع پہنچتا ہے پھر یہ سامانِ دنیا فنا ہو جاتا ہے۔ انسان کو

چاہیے کہ دنیا کے سامان کو ایسے کام میں خرچ کرے جس میں اس کی عاقبت کی درستی اور آخرت کی سعادت ہو۔ یہ تمام چیزیں اگر دنیا کے لئے رکھی جائیں تو دنیا ہیں اور اگر اطاعت الٰہی میں مدد و معاونت کے لئے رکھی جائیں تو دین بن جاتی ہیں جیسے بیوی، اولاد، مال، سواری، زمین وغیرہ تمام چیزیں اگر اپنے دین کی حفاظت اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں معاونت کیلئے ہوں تو یہی چیزیں قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں جیسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مال دنیا نہیں، دین تھا۔ اس کے ساتھ فرمایا کہ ''دنیا کا سامان تو محض ایک سامان ہی ہے، رغبت ومحبت اور حرص وطلب کے قابل تو رضائے الٰہی کا مقام یعنی جنت ہے لہٰذا اس کی رغبت کرنی چاہیے اور اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارے لئے اس آیت میں بہت اعلیٰ درس ہے۔ ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی انہی دنیاوی چیزوں کی محبت میں مبتلا ہے، اہل خانہ اور اولاد کی وجہ سے حرام کمانا، مال و دولت کو اپنا مقصودِ اصلی سمجھنا، اسی کیلئے دن رات کوشش کرنا، بینک بیلنس بڑھانا، اپنے اثاثوں میں اضافہ کرنا، بہترین لباس، عمدہ مکانات اور شاندار گاڑی ہی تقریباً ہر کسی کا نصب العین اور مقصود و مطلوب ہے۔ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝۱۴ ہماری زبان میں اس کا ترجمہ ''خزانے'' ہوسکتا ہے۔ ''مَتَاعُ'' اس سامان کو کہا جاتا ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ حاصل یہ کہ انسان ان چیزوں کی محبت میں پھنس کر اللہ اور اس کے دین سے غافل ہو جائے اور انہیں تفاخر وزینت کا ذریعہ سمجھے اور غرور وتکبر پر اتر آئے تو یہ تمام چیزیں مذموم ہیں، ورنہ اگر ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت خیال کرتے ہوئے ذریعۂ آخرت بنایا جائے اور شریعت کی حدود میں رہ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ مذموم ومبغوض نہیں بلکہ نہایت مرغوب و محمود ہیں۔ اصل چیز نیت اور عمل ہے، اس لیے حدیث میں ایک طرف تو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہ ہے: ''میرے بعد مردوں کے لیے کوئی فتنہ عورتوں سے بڑھ کر نقصان دہ نہیں۔'' (بخاری)

اس آیت میں جن جن اشیاء کا نام لیا گیا ہے۔ ان کی محبت انسان کے دل میں فطری طور پر جاگزیں ہے اور انہی چیزوں سے انسان کی اس دنیا میں آزمائش ہوتی ہے اور انسانوں کی

اکثریت اس امتحان میں فیل ہی ہوتی رہی ہے۔ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو بذات خود بری ہو۔اوران سے محبت کرنا بھی ایک فطری امر ہے اورفطری امر بھی بذات خود برا نہیں ہوتا۔اگران چیزوں کی محبت انسان کے دل میں نہ ڈالی جاتی تواس دنیا کی رنگینیاں، یہ لہلہاتے کھیت اور باغات اورتہذیب وتمدن کے نظارے کچھ بھی نظر نہ آتا۔جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو یہ چیزیں بذات خود بری ہیں اور نہ ہی ان سے محبت اوران کا حصول بری چیز ہے۔بری چیز یہ ہے کہ انسان ان چیزوں کی محبت اور حصول میں اس قدر غرق ہو جائے کہ اسے آخرت یاد ہی نہ رہے۔البتہ جن لوگوں کے دلوں میں اللہ کا خوف اور فکر آخرت موجود ہوتی ہے۔وہ انہیں چیزوں کو اسی طرح حاصل کرتے اورانہیں استعمال کرتے ہیں کہ انہیں انہی چیزوں سے دنیا کی راحت وسکون بھی نصیب ہوتا ہے اورآخرت میں بھی یہی چیزوں اس کی نجات کا ذریعہ بن جاتی ہیں اوراس طرح ہی انسان کو بہتر ٹھکانا میسر آسکتا ہے جو اللہ کے پاس ہے۔

خلاصہ ومطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دلوں میں ڈال دی ہے، جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگرانسان طبعی طور پران چیزوں کی طرف مائل اوران سے محبت کرنے والا نہ ہوتا تو دنیا کا سارانظام درہم برہم ہو جاتا کسی کو کیا غرض تھی کہ کھیتی کرنے کی مشقت اٹھاتا، یامزدوری وصنعت کی محنت برداشت کرتا، یا تجارت میں اپنا روپیہ اورمحنت صرف کرتا، دنیا کی آبادی اور بقااس میں مضمر تھی کہ لوگوں کی طبائع میں ان چیزوں کی محبت پیدا کر دی جائے جس سے وہ خود بخود ان چیزوں کے مہیا کرنے اور باقی رکھنے کی فکر میں پڑ جائیں، دنیا کی محبت فطری ہے مگر اس میں غلو زیادتی مہلک ہے: حدیث میں ارشاد ہے ("حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ" یعنی دنیا کی محبت ہر برائی کا سرچشمہ ہے۔پہلی آیت میں دنیا کی چند اہم مرغوب چیزوں کا نام لے کر بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں ان کی محبت خوشنما بنادی گئی ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کی ظاہری رونق پر فریفتہ ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھتے ہیں، جن چیزوں کا نام اس جگہ لیا گیا ہے وہ عام طور پر انسانی رغبت ومحبت کا مرکز ہیں،

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر دنیوی نعمتوں سے رغبت ومحبت انسان کے دل میں نہ ہوتو اس کو اخروی نعمتوں کا نہ ذائقہ معلوم ہوگا نہ ان میں رغبت ہوگی، تو پھر اس کو کیا ضرورت کہ وہ نیک اعمال کی کوشش کرکے جنت حاصل کرے، اور برے اعمال سے پرہیز کرکے دوزخ سے بچے تیسری حکمت اور وہی اس جگہ زیادہ قابل نظر ہے یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دل میں پیدا کرکے انسان کا امتحان لیا جائے کہ کون ان چیزوں کی محبت میں مبتلا ہوکر آخرت کو بھلا بیٹھتا ہے اور کون ہے جو ان چیزوں کی اصل حقیقت اور ان کے آنی فانی ہونے پر مطلع ہوکر ان کی فکر بقدر ضرورت کرے اور ان کو آخرت کی درستی کے کام میں لگائے،

دنیا کا ساز وسامان پانی کے مانند ہے، اور اس میں انسان کا قلب ایک کشتی کی طرح ہے، پانی جب تک کشتی کے نیچے اور ارد گرد رہے تو کشتی کے لئے مفید اور معین اور اس کے مقصد وجود کو پورا کرنے والا ہے، اور اگر پانی کشتی کے اندر داخل ہوجائے تو یہی کشتی کی غرقابی اور ہلاکت کا سامان ہوجاتا ہے، اس طرح دنیا کے مال ومتاع جب تک انسان کے دل میں غلبہ نہ پالیں، اس کے لئے دین میں معین ومددگار ہیں، اور جس وقت اس کے دل پر چھاجائیں تو دل کی ہلاکت ہیں، اسی لئے اس آیت میں چند خاص مرغوبات دنیا کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ⑭ یعنی یہ سب چیزیں دنیوی زندگی میں صرف کام چلانے کے لئے ہیں، دل لگانے کے لئے نہیں، اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانا" یعنی وہ ٹھکانا جہاں ہمیشہ رہنا ہے، اور جس کی نعمتیں اور لذتیں نہ فنا ہونے والی ہیں نہ کم یا ضعیف ہونے والی انسان کو چاہیے کہ اپنی آخرت کی فکر کرے ایمان صالحہ سے آراستہ ہوتا کہ دار آخرت میں اچھا ٹھکانہ نصیب ہو۔

قرآن مجید کا تصور فلاح ونجات/ دنیا وآخرت میں فلاح وکامیابی دلانے والے اعمال

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِالْعِبَادِ ۚ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ
النَّارِ ۚ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ
بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

انسان کی ابدی فلاح

قُلْ	کہہ دیجئے	اَؤُنَبِّئُكُمْ	کیا میں تمہیں خبر دوں
بِخَيْرٍ	(بہت) بہتر	مِّنْ ذٰلِكُمْ	ان (سب) سے
لِلَّذِيْنَ	ان لوگوں کے لیے جو	اتَّقَوْا	پرہیزگار ہیں
عِنْدَ رَبِّهِمْ	ان کے رب کے پاس	جَنّٰتٌ	باغات ہیں
تَجْرِيْ	بہتی ہیں	مِنْ تَحْتِهَا	ان کے نیچے سے

الْاَنْهٰرُ	نہریں	خٰلِدِيْنَ	وہ ہمیشہ رہیں گے	فِيْهَا	اس میں

وَاَزْوَاجٌ	اور بیبیاں	مُّطَهَّرَةٌ	پاکیزہ
وَّرِضْوَانٌ	اور رضامندی ہے	مِّنَ اللّٰهِ	اللہ (کی طرف) سے

وَاللّٰهُ	اور اللہ	بَصِيْرٌ	خوب دیکھنے والا ہے	بِالْعِبَادِ	اپنے بندوں کو۔

جب حُبُّ الشَّهَوٰتِ والی آیت نازل ہوئی۔تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اللہ کے حضور دعا کی۔کہ مولا کریم! کہ گمراہی کے ان اسباب کے پیش نظر ہمیں کیا کرنا چاہئے۔تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ۔اے پیغمبر (علیہ السلام) ان کو فرما دیجئے۔ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ کیا میں تمہیں ان تمام مرغوبات سے بہتر چیز نہ بتاؤں۔لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے رہے۔ان کی طبیعتوں میں خوف خدا قائم رہا ہے۔اور وہ کفر،شرک نفاق اور برائی سے بچتے رہے۔فرمایا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ ان کے رب کے ہاں باغات ہیں۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔جن کے سامنے نہریں بہتی ہیں خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مومن لوگ ہمیشہ باغات میں رہیں گے۔وہاں سے نکالے جانے کا انہیں کوئی کھٹکا نہیں ہوگا۔یہ باغات دنیا کی ان مرغوب اشیاء سے کہیں بہتر ہیں۔اور پھر یہ صرف باغات ہی نہیں ہوں گے بلکہ تقوی اختیار کرنے والوں کے لیے وہاں وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ازواج زوج کی جمع ہے اور زوج ذومعنی لفظ ہے۔خاوند کے لیے اس کی بیوی اس کا زوج ہے اور بیوی کے لیے اس کا خاوند اس کا زوج ہے۔ یعنی اگر دنیا میں کسی نیک آدمی کی بیوی نہیں تھی تو اسے کوئی نیک بیوی ہی ملے گی اور بدسرشت بیوی جہنم میں ہوگی۔اسی طرح اگر کسی نیک بیوی کا خاوند بدسرشت تھا تو اسے جنت میں نیک شوہر نصیب ہوگا،اور بدکار شوہر جہنم میں ہوگا اور اگر دونوں نیک بخت اور نیکوکار تھے تو انہیں جنت میں بھی رفاقت نصیب ہوگی۔اس سلسلہ کے علاوہ بھی نیک لوگوں کو پاک باز بیویاں نصیب ہوں گی جیسا کہ قرآن اور حدیث کے بیشمار ارشادات سے یہ بات ثابت ہے۔جو ہر قسم کی جسمانی و روحانی غلاظت سے پاک ہوں گی۔اس دنیا کی بہترین عورتیں بھی ان کی طہارت کا مقابلہ نہیں کرسکیں گی۔فرمایا اس کے علاوہ

جنتیوں کو وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ جو سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اس آیت میں مذکور لفظ رِضْوَانٌ "رَضِیَ یَرْضَی (س)" ناقص واوی سے مصدر ہے، اس کا مصدر "رِضًا" بھی آتا ہے، مگر "رِضْوَانٌ" میں حروف زیادہ ہونے اور تنوین برائے تعظیم ہونے کی وجہ سے ترجمہ "عظیم خوشنودی" کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نعمت جنت کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے، اللہ نے فرمایا: (وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ) [التوبۃ: 72] "اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی سب سے بڑی ہے۔' جب لوگ دوزخ سے نکل کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور انہیں ہر نعمت حاصل ہو جائے گی، تو اللہ کریم ان سے فرمائیں گے، کیا میں تمہیں کچھ اور زیادہ نہ دوں۔ وہ لوگ حیران ہوں گے۔ اور کہیں گے یا الٰہی! ہم جنت میں پہنچ گئے، کامیاب ہو گئے۔ ہر طرح کی نعمتیں حاصل ہو گئیں۔

اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جنتی لوگوں سے پوچھے گا۔ کیا تم اب خوش ہو، وہ کہیں گے: پروردگار! بھلا اب بھی ہم خوش نہ ہوں گے جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرما دیا جو اور کسی مخلوق کو نہیں دیا؟ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اب میں تمہیں وہ نعمت دیتا ہوں جو ان سب نعمتوں سے افضل ہے۔ وہ پوچھیں گے۔ بھلا ان نعمتوں سے افضل اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا وہ نعمت میری رضامندی ہے۔ اب میں اپنی رضا مندی تمہارے نصیب کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا (بخاری، کتاب التوحید، باب کلام الرب مع اہل الجنۃ) یعنی وہ بندے جو عذاب دوزخ سے نجات کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام پابندی کے ساتھ بجا لاتے ہیں، زندگی کے ہر لمحہ حلال و حرام کی تمیز رکھتے ہیں اور پھر ساتھ ہی ساتھ اللہ سے دعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے گناہ معاف فرما دے اور دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔ اب آج کے بعد کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ گویا اللہ تعالیٰ جنتیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راضی ہو جائے گا۔ یہ انسان کی ابدی فلاح ہوگی۔ فرمایا: وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ⑮ اللہ

تعالیٰ تمام بندوں کے حالات کو نگاہ میں رکھتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ کون کیا کررہا ہے۔اور کون کس برائی میں مبتلا ہے۔لہٰذا اس کی گرفت سے کوئی شخص نہیں بچ سکتا۔وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون ایماندار ہے اور اعمال صالحہ کررہا ہے۔ایسے لوگوں کے لیے اس کے ہاں صلے کی کمی نہیں ہے وہ انہیں آخرت میں بہترین ابدی زندگی عطا کرے گا۔اس آیت کریمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ''اے حبیب! صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، دنیا کی حقیقت اور فنائیت سمجھانے کے بعد تم لوگوں سے فرمادو کہ کیا میں تمہیں عورتوں، بیٹوں، مال و اولاد، سونا چاندی، کاروبار، باغات، عمدہ سواریوں اور بہترین مکانات سے اچھی، عمدہ اور بہتر چیز بتادوں؟ سنو، وہ اللہ عَزَّوَجَلَّ کے قرب کا گھر یعنی جنت ہے جس میں دودھ، شہد، شراب کی نہریں بہہ رہی ہیں، جس میں ایسی پاکیزہ بیویاں ہوں گی جو ہر قسم کے زنانہ عوارض اور ہر ناپسند و قابل نفرت چیز سے پاک ہوں گی، اور اس جنت میں پرہیزگاروں کو ہمیشہ رہنا ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے جو سب سے اعلیٰ نعمت ہے۔

مومن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد

اَلَّذِیْنَ	وہ لوگ جو	یَقُوْلُوْنَ	کہتے ہیں	رَبَّنَآ	اے ہمارے رب!
اِنَّنَآ	بیشک ہم	اٰمَنَّا	ایمان لائے	فَاغْفِرْ لَنَا	لہٰذا تو ہمیں بخش دے
ذُنُوْبَنَا		ہمارے گناہ		وَقِنَا	اور ہمیں بچا
عَذَابَ النَّارِ			آگ کے عذاب سے		

ایمان کا اقرار (اٰمَنَّا) یہاں اللہ کے نیک بندے اپنے ایمان کو مضبوط کرتے ہیں۔وہ اللہ کی عظمت کا اقرار کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دل سے تجھ پر اور تیرے رسولوں پر یقین کرلیا ہے۔امام رازی اور دیگر مفسرین کرام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم فرماتے ہیں، بخشش کا مبنیٰ ایمان ہے۔مبنی بر حقیقت ایمان کے بغیر بخشش نہیں ہوگی۔اسی لیے اٰمَنَّا کا اعتراف پہلے ہے اور فَاغْفِرْ لَنَا کی درخواست بعد میں ہے۔جب تک ایمان مکمل نہیں ہوگا، معافی کی صورت پیدا نہیں ہوگی۔بخشش کی دعا (فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا): ایمان لانے کے بعد وہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔

انسان سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔اس دعا میں اپنے ایمان لانے کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی ہے،اس سے دعا کے لیے عمل کا وسیلہ پیش کرنا ثابت ہوتا ہے،جیسا کہ (اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ) میں ہے۔یہ دعا سکھاتی ہے کہ ہمیشہ اللہ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے رہنا چاہیے۔جہنم سے پناہ (وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ):وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں جہنم کی آگ سے بچالے۔یہ دنیا کی زندگی عارضی ہے۔اصل کامیابی جہنم سے بچ کر جنت میں جانا ہے۔یہ دعا ہمیں سکھاتی ہے کہ مومن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا اور دوزخ کی آگ سے بچنا ہے۔ہمیں بھی یہ دعا اپنی نمازوں میں کثرت سے مانگنی چاہیے۔بہرصورت دوزخ کی سزا اس قدر خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بار بار اس سے بچنے کی دعا سکھائی ہے۔ فرمایا: رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اہل تقویٰ کی صفات

اَلصّٰبِرِيْنَ	(وہ جو) صبر کرنے والے ہیں	وَالصّٰدِقِيْنَ	اور سچ بولنے والے
وَالْقٰنِتِيْنَ	اور حکم بجالانے والے ہیں	وَالْمُنْفِقِيْنَ	اور خرچ کرنے والے
وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ	اور بخشش مانگنے والے ہیں	بِالْاَسْحَارِ	سحری کے اوقات میں

اہل تقویٰ کی فہرست میں سب پہلے فرمایا، اَلصّٰبِرِيْنَ ، ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ صبر کرنے والے ہوتے ہیں۔یہ بہت بڑی صفت ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے وقت،نفسانی تقاضوں سے بچنے کے وقت یا کسی مصیبت آنے پر صبر ہی کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔صبر کی ایک اور بڑی صورت کسی تکلیف یا صدمے کے وقت صبر کرنا ہے۔مال و جائیداد ضائع ہو جائے۔کوئی عزیز یا بزرگ فوت ہو جائے۔کسی چیز کا خوف مسلط ہو جائے۔تو ایسی حالت میں صبر کا دامن تھامنا بہت بڑا اصول ہے اسی اصول کو چھوڑ کر رافضیت اور شیعیت پیدا ہوئی۔جس اصول کو حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آخر دم تک اپنائے رکھا۔اسی اصول کو اس کے نام لیواؤں نے ترک کر کے

بے صبری کا انتہائی مظاہرہ کیا۔ رونا پیٹنا، واویلا کرنا، منہ نوچنا۔ چھریاں مارنا، چھاتی پیٹنا کونسا اصول ہے۔ یہ تو بے اصولی کی بات ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صبر کے اصول کو قائم رکھا۔ حضرت عثمان نے اس پر آنچ نہ آنے دی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہنے اس کا کمال مظاہرہ کیا۔ آج ہم اس زریں اصول کو ترک کر کے کیسے فلاح پا سکتے ہیں بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر صبر کرنے والوں کی تعریف بیان کی ہے۔ اس کا عام اعلان ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ، بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اہل تقویٰ میں سے دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا، وَالصّٰدِقِيۡنَ، وہ لوگ ہیں جو ہر معاملہ میں سچائی اور راست بازی کو اختیار کرتے ہیں۔ اپنے قول، فعل، معاملے اور وعدے میں سچائی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ سورہ عنکبوت کی ابتداء میں فرمایا۔ فَلَيَعۡلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا یعنی اللہ تعالیٰ سچوں کو جانچتا رہتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے ہاں سچائی بہت بڑا عمل ہے۔ اور اس کے ہاں اس کے واسطے بہت بڑا اجر ہے۔

فرمایا متقیوں میں تیسرا گروہ وَالۡقٰنِتِيۡنَ کا ہے۔ یہ لفظ قنوت سے مشتق ہے۔ اور اس کا معنی اطاعت بجا لانا ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا دامن کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑتے ان پر خوشحالی آئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور آزمائش آئے تو صبر کرتے ہیں، مگر اپنے آپ سے باہر ہو کر اطاعت خداوندی سے باہر نہیں ہوتے انہیں ہر وقت یہ فکر لگی رہتی ہے۔ کہ کسی وقت اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ یہی لوگ قانتین ہیں۔

اہل تقویٰ کو چوتھا گروہ وَالۡمُنۡفِقِيۡنَ کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ کی راہ میں محتاجوں پر خرچ کرنے والے ہیں۔ دین اسلام میں خرچ کرنا بذات خود ایک بہت بڑا اصول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محض جمع کرنے والوں کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ جو سوسائٹی اپنے غریبوں اور محتاجوں کا خیال نہیں رکھتی وہ مٹا دینے کے قابل ہے۔ آپ نے اپنے سب سے بڑے مرید اور رشتے کے بھائی کی بیعت ان الفاظ میں لی کہ نیکی قائم کرنا اور ہمیشہ غرباء اور مساکین

کے مسائل کو حل کرنا۔آپ نے بیعت میں یہ چیز داخل کر دی تھی۔غرضیکہ منفقین کا یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ اہل ایمان دولت کو سمیٹ کر نہیں رکھتے۔بلکہ دولت کو خرچ کرنا ان کے اوصاف میں داخل ہے۔

فرمایا متقین کی پانچویں شاخ ہے وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ⑰ وہ لوگ سحری کے وقت اٹھ کر بخشش کی دعائیں مانگتے ہیں۔سحری کا وقت تنہائی اور سکون کا وقت ہوتا ہے۔اللہ کی رحمت کے نزول کا وقت ہوتا ہے تقرب الٰہی کے اس وقت میں اللہ سے اپنی خطاؤں کی معافی طلب کرتے ہیں۔یعنی اللہ کے راستہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر بھی اس کی فرمانبرداری پر جمے رہتے اور معصیت سے رکے رہتے ہیں۔زبان کے، دل کے، نیت کے معاملہ کے سچے ہیں۔پوری تسلیم وانقیاد کے ساتھ خدا کے احکام بجالاتے ہیں۔خدا کی دی ہوئی دولت کو اس کے بتلائے ہوئے مواقع میں خرچ کرتے ہیں۔اور پچھلی رات میں اٹھ کر (جو طمانیت واجابت کا وقت ہوتا ہے لیکن اٹھنا اس وقت سہل نہیں ہوتا) اپنے رب سے گناہ اور تقصیرات معاف کراتے ہیں۔یعنی اکثر رات عبادت میں گزارتے اور سحر کے وقت استغفار کرتے کہ خداوندا! عبادت میں جو تقصیر رہ گئی اپنے فضل سے معاف فرمانا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہمارا رب تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے، جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے، فرماتا ہے: "کون ہے جو مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے تو میں اسے دوں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے تو میں اسے بخشوں؟" (بخاری) اے اللہ! عَزَّ وَجَلَّ، ہمارے دلوں سے دنیا کی محبت نکال کر اپنی محبت ڈال دے، دنیا کی حرص نکال کر آخرت کی طلب داخل کر دے۔یا اللہ کریم ہمارے اندر بھی اہل تقویٰ کی صفات پیدا فرمادے آمین

وحدتِ دین نہ کہ وحدتِ ادیان/ دعوت کے کام میں استقامت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؕ⑱ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۫ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ
اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ⑲ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ
اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ
اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ⑳

کائنات کی تخلیق وتدبیر میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ	اللہ نے گواہی دی ہے	اَنَّهٗ	(کہ) بلاشبہ
لَاۤ اِلٰهَ	نہیں کوئی معبود	اِلَّا هُوَ	سوائے اس کے
وَالْمَلٰٓئِكَةُ	اور فرشتوں نے	وَاُولُوا الْعِلْمِ	اور اہلِ علم نے (بھی)
قَآئِمًا	وہ قائم ہے	بِالْقِسْطِ	انصاف کے ساتھ
لَاۤ اِلٰهَ	نہیں کوئی معبود	اِلَّا هُوَ	مگر وہی
الْعَزِیْزُ	بہت غالب ہے	الْحَكِیْمُ	خوب حکمت والا ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر دین اسلام ہے، جیسا کہ آئندہ آیت میں آرہا ہے اور اسلام کی بنیاد توحید الٰہی پر ہے۔ اس حقیقت سے وفد نجران اور تمام دنیا کو آگاہ کیا جارہا ہے۔ "شَهِدَ" کا معنی "بَيَّنَ وَ اَعْلَمَ" یعنی بیان کیا اور آگاہ کیا ہے۔(فتح القدیر) شاہد وہ ہے جو اپنے یقینی علم کے ساتھ آگاہ کرے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ اور فرشتوں نے بھی اور اہل علم نے بھی راستی اور انصاف کے ساتھ یہی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی گواہی تو اس لحاظ سے سب سے زیادہ معتبر ہے کہ وہ خود خالق کائنات ہے اور اسے ٹھیک ٹھیک علم ہے کہ اس کائنات کی تخلیق و تدبیر میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ دوسرے نمبر پر فرشتوں کی گواہی اس لحاظ سے معتبر ہے کہ وہ مدبرات امر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق کائنات کی تدبیر وانتظام وانصرام انہیں کے سپرد ہے، اگر کائنات میں دوسرا الٰہ بھی ہوتا تو انہیں یقینا اس کا علم ہونا چاہئے تھا۔ تیسرے نمبر پر ان لوگوں کی گواہی معتبر ہے جو اہل علم ہوں۔ کائنات میں غور وفکر کرنے والے ہوں اور ایسے تمام لوگوں کی گواہی بھی یہی ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ یا اس کا شریک نہیں ہے اور اگر ایسا ہوتا تو کائنات کا نظام مدتوں پیشتر تباہ و برباد ہو چکا ہوتا یا سرے سے ایسا منظم و مربوط نظام وجود میں ہی نہ آسکتا، اور جو کچھ وہ کر رہا ہے عین عدل و انصاف کے مطابق کر رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق اور ساری کائنات میں موجود بیشمار دلائل اور نشانیوں کے ساتھ اور اپنے رسولوں کے ذریعے سے پیغام بھیج کر شہادت دی اور آگاہ کیا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس حال میں کہ وہ اپنی مخلوق کے تمام معاملات واحوال میں عدل پر قائم ہے اور اس سے بڑھ کر کس کی شہادت ہو سکتی ہے اور اس کے پاک فرشتوں اور اہل علم نے بھی یہ شہادت دی ہے۔ آیت کے آخر میں پھر وہی دعویٰ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں، کوئی عبادت کے لائق نہیں، نہ جبرائیل (علیہ السلام)، نہ میکائیل (علیہ السلام)، نہ مسیح (علیہ السلام) اور نہ محمد رسول اللہ ﷺ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں۔ الٰہ کا معنی بڑا وسیع ہے۔ الٰہ وہ ہو سکتا ہے۔ جس میں الوہیت کی صفت پائی جاتی ہو۔ جو واجب الوجود ہو، جس کا علم محیط ہو، جس کی قدرت

تمام ہو، جو خالق اور مدبر ہو اور جو فاطر ہو جو خود مخلوق اور محتاج ہو، وہ الہ کیسے ہوسکتا ہے۔ الہ وہ ہے جو جو چاہے کر گزرے، اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے سوا کوئی معبود نہیں یہ کلمہ تمام ادیان اور شرائع الہی کی بنیاد ہے۔ اللہ نے اپنی بہترین مخلوق کے متعلق فرمایا کہ اس کا ہر فرد اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اس کے سوا کوئی الہ نہیں۔ وہی زبردست ہے، حکمت والا ہے اس کے سوا کوئی پرستش کے قابل نہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں عزیز کا معنی ہے کمال قدرت کا مالک۔ وہ جو چاہے کرے۔ اس کی قدرت کے سامنے کسی کو ٹھہرنے کی مجال نہیں۔ اور حکیم کے معنی کمال حکمت کا مالک۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہے۔ وہ حکیم ہے۔ وہی معبود ہے۔ اس کے بغیر کوئی عبادت کے لائق نہیں اس کے سوا کوئی نہیں جو مخلوق کی حاجت روائی کر سکے، یہ تعلیم تمام انبیاء اور تمام آسمانی کتابوں کی جڑ اور بنیاد ہے تمام اصحاب علم بھی اس کی تعلیم دیں گے جو اس تعلیم کیخلاف کریگا۔ وہ علمائے سوء یا پیران سوء میں شمار ہوگا۔ ایسا شخص اہل علم نہیں ہوگا بلکہ اہل بدعت ہوگا۔ بعض مذاہب اور فلاسفہ کا خیال تھا کہ خدا کا وجود تو ہے؛ لیکن کائنات کو پیدا کرنے کے بعد اب وہ معطل اور بیکار ہے، کائنات کا نظام قانونِ فطرت کے تحت خود بخود چل رہا ہے، اسی کی تردید مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر آن کائنات کی تدبیر بہ نفس نفیس فرما رہے ہیں، کوئی پتہ نہیں جو حکم خداوندی کے بغیر ہلے اور کوئی مخلوق نہیں جو مشیت خداوندی کے بغیر اپنی جگہ سے جنبش بھی کر سکے۔

اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا

اِنَّ الدِّيْنَ	بیشک دین	عِنْدَ اللّٰهِ	اللہ کے نزدیک
الْاِسْلَامُ	اسلام ہی ہے	وَمَا اخْتَلَفَ	اور نہیں اختلاف کیا
الَّذِيْنَ	وہ جنہیں	اُوْتُوا الْكِتٰبَ	کتاب دی گئی
اِلَّا	مگر	مِنْۢ بَعْدِ مَا	بعد اس کے کہ
جَآءَهُمُ	آگیا ان کے پاس	الْعِلْمُ	(صحیح) علم

بَغْيًا	ضد اور حسد کرتے ہوئے	بَيْنَهُمْ	آپس میں
وَمَنْ	اور جو کوئی	يَّكْفُرْ	کفر کرے
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	اللہ کی آیات کے ساتھ	فَاِنَّ اللّٰهَ	تو بیشک اللہ
سَرِيْعُ	بہت جلد	الْحِسَابِ	حساب لینے والا ہے

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، یعنی اپنے آپ کو اللہ کے احکام کے تابع کر دینا، دین سے مراد ایسا نظام زندگی یا ضابطہ حیات ہے جسے انسان اس دنیا کے لیے یا دنیا و آخرت دونوں کے لیے بہتر سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ یعنی اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور سچا دین صرف اسلام ہے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخر الزمان (علیہ السلام) تک تمام انبیاء کرام علیہم السلام اسی دین کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں اختلاف اگر کوئی ہے تو شریعتوں میں ہے، کیونکہ ان میں فروعی احکام ہوتے ہیں۔ جو مختلف ادوار میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ لہذا یہود و نصاری، مجوس یا مشرکین کا یہ دعوی کہ ان کا دین سچا ہے، بالکل غلط دعوی ہے۔ یہ تو کذب بیانی اور خلاف واقعہ ہے۔ صداقت تو صرف دین اسلام میں ہے۔ اور اپنے دعوی میں سچا وہی ہوگا، جو دین اسلام کا پیروکار اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے والا ہوگا۔ اب اگر آپ ﷺ کی شریعت کے سوا کوئی اور دین لے کر اللہ کے پاس جائے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، فرمایا: (وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ) (آل عمران: 85) "اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں جو دین مقبول ہے، وہ صرف اسلام ہے، کوئی اور دین خدا کے یہاں مقبول نہیں بعض حضرات جو کہتے ہیں کہ تمام مذاہب حق ہیں، راستے الگ الگ ہیں اور منزل سب کی ایک ہے، یہ صحیح نہیں ہے، یہ نہ صرف قرآن کا دعویٰ ہے: بلکہ عقل کا تقاضہ بھی ہے، وہ مذہب جو کامل توحید کی دعوت دیتا ہو اور بال برابر بھی شرک کی آمیزش کو گوارا نہیں کرتا ہو اور وہ مذاہب جن کے یہاں شرک ہی اصل طریقۂ حیات ہو، ان دونوں کی منزل ایک کیوں کر ہو سکتی

ہے، جیسے روشنی اور تاریکی کا مقصد ایک نہیں ہوسکتا، اسی طرح متضاد فکر ونظر کے حامل مذاہب بھی ایک نہیں ہوسکتے ،پس اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا۔ پھر ایک ہی خدا ہے جو پوری انسانیت کا خالق ہے، ایک ہی باپ کے نطفہ اور ایک ہی ماں کی کوکھ سے تمام انسان پیدا کئے گئے ہیں، ایک ہی سورج ہے جو تمام انسانوں کو حرارت پہنچاتا ہے، ایک ہی چاند ہے جو اپنی خنکی سے ہر شخص کو سرشار کرتا ہے، ایک ہی نظام تولید ہے جس سے ہر آدمی کی پیدائش ہوتی ہے، غذا اور اس کے ہضم کا نظام بھی ایک ہے، تو ضرور ہے کہ خدا نے اس پوری مخلوق کے لئے قانون اور نظام حیات بھی ایک ہی رکھا ہو؛ اس لئے دین ایک ہی حق ہوسکتا ہے نہ کہ کئی۔

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ؕ اور اہل کتاب نے علم (وحی) آجانے کے بعد جو اختلاف کیا تو اس کی وجہ محض ان کی باہمی ضد اور سرکشی تھی۔اختلاف سے مراد اہل کتاب کا باہمی اختلاف بھی ہوسکتا ہے اور دوسروں سے بھی۔مثلاً یہود کے فرقوں کا باہمی اختلاف، عیسائیوں کے فرقوں کا باہمی اختلاف اور مسلمانوں کے فرقوں کا باہمی اختلاف اور دوسرے یہ کہ یہود کا عیسائیوں اور مسلمانوں سے، عیسائیوں کا یہود اور مسلمانوں سے اختلاف۔اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے اختلاف کی اصل وجہ بیان فرمادی اور یہی وجہ قرآن کریم میں اور بھی تین مقامات پر بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ حق انہیں نظر نہیں آتا بلکہ اس کی اصل وجہ اپنی اپنی سرداریاں اور چودھراہٹیں قائم کرنا اور اپنا جھنڈا سربلند رکھنے کی فکر، اسباب مال وجاہ کا حصول ہوتا ہے اور اس معاملہ میں آپ جتنا بھی غور کریں گے فرقہ بندیوں کی بنیاد میں آپ کو ذاتی اغراض ومفادات ہی نظر آئیں گے۔مثلاً تورات اور انجیل دونوں میں رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کا ذکر موجود ہے اور ان کی نشانیاں بھی بیان کردی گئی ہیں اور اہل کتاب کو یہ بھی پوری طرح یقین ہوچکا ہے کہ کتاب میں مذکورہ نشانیوں کے مطابق وہی نبی آخر الزمان اور نبی برحق ہے۔اب اس نبی کے انکار کی وجہ محض ان کی اپنی سرداریاں ختم ہونا یا بعض دوسرے دنیوی مفادات کا ضائع ہونا تھا۔ان باتوں کے علاوہ انکار کی کوئی دوسری وجہ نہ

تھی ۔ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ⑲ اور جو اللہ کی آیات کا انکار کرے تو بیشک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلد محاسبہ ہونے والا ہے اور آیات الٰہی سے کفر کی سزا مل کر رہے گی ۔ لہٰذا اللہ ایسے لوگوں کا جلد ہی حساب چکا دیتا ہے اور اس آیت کا اطلاق مسلمانوں پر بھی بالکل اسی طرح ہوتا ہے جیسے اہل کتاب پر ہوا ہے ۔ اس آیت میں دین کی صداقت کا تذکرہ ہے اور اپنے دعوی میں سچا وہی ہوگا، جو دین اسلام کا پیروکار اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر ایمان لانے والا ہوگا ۔ اسلام کا اصلی معنی سونپ دینا ہے ۔ جب کوئی شخص اپنے اعمال و افعال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کو قبول کر لیتا ہے ۔ تو گویا وہ اسلام لے آتا ہے گویا تسلیم و رضا کا نام ہی اسلام ہے ۔ اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام اسی دین کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں ۔ حتی کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے بھی اسی دین کو دنیا کے سامنے پیش کیا ۔ یہ ایسا دین ہے ۔ جو کامل، اکمل اور عالمگیر ہے ۔ یہ ناقابل تنسیخ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تمام شرائع منسوخ کر کے صرف نبی آخر الزمان (علیہ السلام) کی شریعت کو قیامت تک کے لیے قائم و دائم رکھا ۔

داعی پوری دردمندی اور جذبہ دروں کے ساتھ دعوت دیتا رہے

فَاِنۡ	پھر اگر	حَآجُّوۡكَ	وہ آپ سے جھگڑیں	فَقُلۡ	تو کہہ دیجئے
اَسۡلَمۡتُ	میں نے جھکا دیا	وَجۡهِىَ	اپنا چہرہ	لِلّٰهِ	اللہ کے لیے
وَمَنِ اتَّبَعَنِ	اور (انہوں نے بھی) جنہوں نے میرا اتباع کیا			وَقُلۡ	اور کہہ دیجئے
لِّلَّذِيۡنَ	اُن لوگوں سے جو	اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ	دیئے گئے کتاب		
وَالۡاُمِّيّٖنَ	اور ان پڑھوں سے	ءَاَسۡلَمۡتُمۡ	کیا تم اسلام لاتے ہو		
فَاِنۡ	پھر اگر	اَسۡلَمُوۡا	وہ اسلام قبول کر لیں		
فَقَدِ اهۡتَدَوۡا	تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے	وَاِنۡ	اور اگر		
تَوَلَّوۡا	وہ منہ پھیر لیں	فَاِنَّمَا	تو صرف	عَلَيۡكَ	آپ کے ذمے

اَلْبَلٰغُ	(پیغام) پہنچا دینا ہے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
بَصِيْرٌ	خوب دیکھنے والا ہے	بِالْعِبَادِ	اپنے بندوں کو۔

فرمایا ان تمام حقائق کے واضح ہو جانے کے باوجود فَاِنْ حَآجُّوْكَ ، اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں، فَقُلْ تو آپ کہہ دیں اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ، میں نے اپنے چہرے کو اللہ کے تابع کرلیا ہے وَمَنِ اتَّبَعَنِ اور میرے پیروکاروں نے بھی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنالیا۔ یعنی (فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ): اسلام کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کا صدق ثابت ہو جانے کے باوجود بھی اگر اہل کتاب کفر و عناد کی راہ اختیار کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں نے تو اپنا ظاہر و باطن اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے اور یہی حال میرا اتباع کرنے والے مسلمانوں کا بھی ہے اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور امی لوگوں، یعنی مشرکین عرب، سب سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اسلام لے آؤ گے تو صراط مستقیم پر گامزن ہو جاؤ گے اور اگر روگردانی کرو گے تو میرا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب تو تمہیں اللہ ہی کو دینا ہوگا۔ فرمایا وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ان اہل کتاب اور ان پڑھوں سے کہہ دیجئے۔ کیا تم اسلام لاتے ہو۔ دین توحید قبول کرتے ہو، اطاعت خداوندی اختیار کرتے ہو۔ اہل کتاب سے مراد یہود و نصاری ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ متمدن تھے۔ دفتری نظام سے واقف تھے۔ حکومت کرنا جانتے تھے اور ان کے پاس تورات اور انجیل بھی تھی۔ اس لیے اہل کتاب کہلاتے تھے۔ ان کے علاوہ عرب کے باقی لوگ جو عام طور پر حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد تھے، وہ ان پڑھ تھے تعلیم و تربیت مفقود تھی، نوشت و خواند سے بے بہرہ تھے۔ تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نزول قرآن کے زمانے میں صرف چار فیصد لوگ پڑھے لکھے تھے باقی سب ان پڑھ تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے علاوہ ان امیوں کو بھی پیغام دیا کہ بتاؤ کیا تم اسلام لاتے ہو۔ فرمایا فَاِنْ اَسْلَمُوْا اگر وہ اسلام لے آئیں فَقَدِ اهْتَدَوْا پس بیشک وہ ہدایت پا گئے۔ سورہ بقرہ میں بھی اسی قسم کا بیان گزر چکا ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا اگر یہ

بھی تمہاری طرح ایمان لے آئیں تو ہدایت پا جائیں گے۔تم کو اللہ نے معیارِ حق بنا کر پیش کیا۔غرض یہ کہ اگر اہلِ کتاب اور امی صحابہ کرام حضرات ابو بکر، عمر، عثمان، علی عبد الرحمن بن عوف، ابو عبیدہ، خالد رضی اللہ عنہم وغیرہم کی طرح اسلام لے آئیں تو ہدایت پا جائیں گے۔ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا ، اور اگر وہ روگردانی کریں فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ، تو آپ کے ذمے پہنچا دینا ہے۔آپ اپنی ذمہ داری پوری کر دیں۔ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ۝۲۰ باقی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کو نگاہ میں رکھنے والا ہے وہ ان کے ایک ایک فعل سے واقف ہے کہ انہوں نے کس قسم کے گندے عقیدے بنا رکھے ہیں۔اور کس قدر ضد، عناد اور تعصب کا شکار ہیں۔اس آیت کریمہ سے یہ سبق حاصل ہوا کہ دعوت دِین کا کام ایک سرکاری ڈیوٹی کی طرح ہے کہ بے دلی اور نیم دلی کے ساتھ اسلام کی طرف دعوت دے دی اور کافی ہو گیا، مزید سعی و کاوش کی ضرورت نہیں؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ داعی پوری دردمندی اور جذبہ دروں کے ساتھ دعوت دیتا رہے اور بار بار راہِ حق کی طرف بلاتا رہے؛ لیکن مدعو اتنا سخت دل ہے کہ اس پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تو تنگ دل نہ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ اس نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہے۔ یا اللہ ہم کو اسلام کی حقیقت نصیب فرما، اور اسلام سے سچی محبت نصیب فرما، اور اسلام کا سچا اتباع نصیب فرما، یا اللہ نبی کریم ﷺ کے ذریعہ جو ہدایات ہم کو پہنچی ہیں اُن کو کامل طور پر اختیار کرنے کی توفیق عطا فرما، اور ہم کو اپنا سچا فرمانبردار بندہ بن کر زندہ رہنے اور مرنے کی سعادت نصیب فرما۔آمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

انبیاء علیہم السلام کے قاتلوں اور حق و انصاف کے دشمنوں کے متعلق حکم/ افتراء فی الدین

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ
يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ ㉑ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ㉒ أَلَمْ تَرَ إِلَى
الَّذِيْنَ أُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ إِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ
يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ㉓

بنی اسرائیل کے تین جرائم

إِنَّ	بیشک	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	يَكْفُرُوْنَ	کفر کرتے ہیں

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	اللہ کی آیات کے ساتھ	وَيَقْتُلُوْنَ	اور وہ قتل کرتے ہیں
النَّبِيّٖنَ	نبیوں کو	بِغَيْرِ حَقٍّ	ناحق
وَّيَقْتُلُوْنَ	اور وہ قتل کرتے ہیں	الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کو جو
يَأْمُرُوْنَ	حکم کرتے ہیں	بِالْقِسْطِ	انصاف کا

مِنَ النَّاسِ	لوگوں میں سے	فَبَشِّرْهُمْ	تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ		درد ناک عذاب کی (21)	

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ: بیشک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو کسی حق کے بغیر قتل کرتے ہیں۔انبیاء کا قتل تو بہر حال ناحق ہی ہے، مراد یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے طور پر کسی مجرم کے سزائے قتل کے مستحق ہونے کے لئے جو اُصول وقوانین مقرر کر رکھے تھے، اس اعتبار سے بھی ان کا قتل ناواجبی اور غیر قانونی تھا۔اس میں اہل کتاب کی مذمت ہے، جن کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے نہ صرف احکام الٰہی پر عمل کرنے سے انکار کیا بلکہ انبیاء علیہم السلام اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے جنھوں نے کبھی ان کے سامنے دعوت حق پیش کی اور یہ تکبر کی آخری حد ہے۔

کفر کی کئی قسمیں

اب کفر کی کئی ایک قسمیں ہیں: اسلامی تعلیمات میں کفر (حق کا انکار کرنا) بنیادی طور پر دو اقسام (کفر اکبر اور کفر اصغر) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔مزید تفصیل میں کفر کی اہم ترین پانچ اقسام یہ ہیں: (1) کفر انکار: دل اور زبان دونوں سے حق کو تسلیم نہ کرنا۔(2) کفر جحود: دل سے سچائی کا یقین ہونے کے باوجود تکبر یا تعصب کی وجہ سے زبان سے اقرار نہ کرنا۔(3) کفر عناد: حق بات کا علم ہونے کے باوجود محض ضد یا انا کی بنا پر اسے تسلیم نہ کرنا۔(4) کفر نفاق: ظاہری طور پر اسلام کا دعویٰ کرنا لیکن باطناً انکار پر قائم رہنا۔(5) کفر استکبار: اللہ کے احکامات کے سامنے تکبر کرنا اور انہیں حقیر جاننا۔بہر صورت کفر انکار سے بھی ہوتا ہے۔شک اور تردد سے بھی کفر لازم آتا ہے اور ایک عملی کفر ہے اسی طرح نفاق کا کفر ہے۔مگر سب سے بڑا کفر اللہ کی آیات اور اس کے احکام کو تسلیم نہ کرنے کا نام ہے۔احکام الٰہی کا منکر مکمل کافر ہو جاتا ہے۔یہ کفر والی بیماری مشرکین مکہ کے بعد اہل کتاب میں بھی سرایت کر چکی تھی۔تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بیماری کا ذکر فرمایا ہے۔وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو لوگوں کو انصاف کا

حکم دیتے ہیں۔قسط کا لفظ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور اس سے مراد عام طور پر انصاف لیا جاتا ہے۔انصاف کا قیام انسانیت کی بنیادی صفت ہے۔پہلے آیت گذر چکی ہے، قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ،خدا تعالیٰ خود بھی انصاف کرتا ہے اور دوسروں کو بھی انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا،یعنی اے بنی آدم! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے۔اور تمہارے درمیان بھی ظلم حرام ہے۔ فَلَا تَظَالَمُوۡا ،پس ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو۔اللہ تعالیٰ کے اس واضح حکم کے باوجود اہل کتاب کا شیوہ یہ تھا کہ وہ اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے تھے۔اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے جو انصاف کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے۔خود حضور ﷺ کے زمانہ میں خیبر کے یہودیوں نے آپ کے قتل کا قصد کیا۔آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا گیا۔مدینہ طیبہ میں بھی بنونضیر اور بنوقینقاع کی بستی میں آپ کے خلاف سازش کی گئی کہ آپ کو دیوار کے نیچے کھڑا کر کے اوپر سے پتھر گرا دیا جائے۔اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر آپ کو بذریعہ وحی دی اور آپ وہاں سے چلے گئے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہل کتاب کی یہ خصلت بیان فرمائی۔کہ وہ اللہ کے نبیوں اور حق و انصاف کے داعیان کو قتل کرتے ہیں۔فرمایا انبیاء علیہم السلام کے قاتلوں اور حق و انصاف کے دشمنوں کے متعلق حکم فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۲۱﴾ انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے، یہاں پر خوشخبری کا لفظ تحکم کے طور پر آیا ہے مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں پر واضح کر دیجئے کہ تمہارا انجام دنیا میں بھی برا ہوگا۔ایسے لوگ دنیا میں گھاس پھونس کی طرح کاٹ دیے جاتے ہیں۔ظالم سمجھتا ہے کہ وہ نسلاً بعد نسلاً دنیا میں قائم رہے گا۔مگر اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیتا ہے یزید کا واقعہ آپ کے سامنے ہے۔وہ خاندان سادات کا مکمل خاتمہ چاہتا تھا۔صرف ایک فرد بیمار ہو جانے کی وجہ سے بچ گیا۔ورنہ وہ بھی تلوار کی زد میں تھا۔آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک فرد سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی نسل کو کس طرح چلایا۔آج جگہ جگہ حسینی موجود ہیں۔برخلاف اس کے یزید کے پندرہ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا آگے کوئی نسل نہ چل سکی۔لفظ خوشخبری تو آرام راحت اور نعمت کی ہوتی ہے لیکن

عذاب الیم کے ساتھ جو بَشِّرْ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنی حرکتوں کو ذریعہ عذاب سمجھنے کی بجائے اچھی چیز سمجھتے تھے اور مغفرت اور نجات آخرت کی امید رکھتے تھے لہٰذا ان کو عذاب الیم کی خوشخبری دی گئی۔ صاحب روح المعانی نے ابن جریر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! ﷺ سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن کن لوگوں کو ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ شخص سب سے زیادہ سخت عذاب میں ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا یا کسی ایسے شخص کو قتل کیا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہو، پھر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ والی آیت تلاوت فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اے ابوعبیدہ بنی اسرائیل نے ایک ہی وقت علی الصباح 73 نبیوں کو قتل کیا ان کو منع کرنے کے لیے ایک سو ستر 170 افراد کھڑے ہو گئے جو بنی اسرائیل کے عبادت گزاروں میں سے تھے انہوں نے ان قاتلین کو اچھے کاموں کا حکم دیا اور بری باتوں سے روکا تو دن کے آخر حصہ میں وہ سب بھی قتل کر دیئے گئے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے تین جرائم کا بیان کیا گیا ہے: (1) اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی آیات کا انکار کرنا۔ (2) انبیاء عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو شہید کرنا۔ (3) انصاف کا حکم دینے والوں کو قتل کرنا۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے ایک مرتبہ صبح کے وقت تینتالیس نَبِیّوں عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو شہید کیا پھر جب ان میں سے ایک سو بارہ عابدوں نے اٹھ کر انہیں نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے منع کیا تو اسی روز شام کو انہیں بھی قتل کر دیا۔ (مدارک ال عمران، تحت الآیۃ: ۲۱، ص ۱۵۴) اس آیت میں نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے زمانہ کے یہودیوں کی مذمت اس لئے ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے ایسے بدترین فعل سے راضی تھے۔

اُولٰٓئِكَ	یہی	الَّذِیْنَ	وہ لوگ ہیں کہ	حَبِطَتْ	ضائع ہو گئے

اَعْمَالُهُمْ	ان کے عمل	فِی الدُّنْیَا	دنیا میں
وَالْاٰخِرَةِ	اور آخرت (میں)	وَمَا	اور نہیں
لَهُمْ	ان کے لئے	مِّنْ نّٰصِرِیْنَ	کوئی مددگار (22)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ان کے اعمال دنیاو آخرت ہر دو مقامات پر ضائع ہو گئے۔ دنیا میں کفر و شرک اور ظلم و عدوان کی بنا پر ان کی نیکی ضائع ہو گئی اور آخر میں بھی کوئی ثمرہ نہیں ملے گا۔ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ ان کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔ اللہ نے تنبیہ فرمائی کہ ایسے لوگ دنیاو آخرت میں بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جناب میں بے ادبی کفر ہے اور یہ بھی کہ کفر سے تمام اعمال برباد ہو جاتے ہیں کیونکہ یہودیوں نے اپنے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو شہید کیا تھا جو سخت ترین بے ادبی ہے اور اس پر ان کے اعمال برباد کر دیئے گئے۔

اَلَمْ تَرَ	کیا نہیں آپ دیکھا	اِلَى الَّذِيْنَ	اُن لوگوں کی طرف جو
اُوْتُوْا	دیئے گئے	نَصِيْبًا	کچھ حصہ
مِّنَ الْكِتٰبِ	کتاب سے	يُدْعَوْنَ	وہ بلائے جاتے ہیں
اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ	کتاب اللہ کی طرف	لِيَحْكُمَ	تاکہ وہ (کتاب) فیصلہ کرے
بَيْنَهُمْ	ان کے درمیان	ثُمَّ يَتَوَلّٰى	پھر پھر جاتا ہے
فَرِيْقٌ	ایک فریق	مِّنْهُمْ	ان میں سے
وَهُمْ	اس حال میں کہ وہ	مُّعْرِضُوْنَ	وہ اعراض کرنے والے ہیں (23)

اہل کتاب کو ان کی خرابیوں کی وجہ سے تنبیہ کرنے کے بعد ان کی ایک اور بری خصلت کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہ جب انہیں برائیوں سے روک کر کتاب اللہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ تو وہ خود اپنی کتاب سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور اس کے احکام ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ، کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ انہیں اللہ کی کتاب کی طرف دعوت دی جاتی ہے لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ تاکہ وہ کتاب ان کے درمیان فیصلہ کرے، مگر وہ اس دعوت کو قبول کرنے کی بجائے ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک گروہ روگردانی

کرتا ہے وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴿۲۳﴾ اور وہ اعراض کرنے والے ہوتے ہیں۔اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے دعوت الی الکتاب کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔اللہ تعالیٰ ان اہل کتاب کی حالت بیان فرما رہا ہے جن پر انعام کرتے ہوئے اللہ نے انہیں اپنی کتاب دی۔ان کا فرض تھا کہ سب سے زیادہ وہ اس پر قائم رہتے اور سب سے پہلے وہ اس کے احکام کو تسلیم کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں بتا رہا ہے کہ انہیں جب کتاب کے فیصلے (کو قبول کرنے) کی طرف بلایا جاتا ہے تو ان میں سے کچھ لوگ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔اپنے بدنوں کے ساتھ بھی منہ پھیرتے ہیں اور دلوں کے ساتھ بھی انکار کرتے ہیں۔یہ انتہائی قابل مذمت رویہ ہے۔اس میں ہمارے لئے تنبیہ ہے کہ ان جیسا کام نہ کریں، ورنہ ہم بھی اس مذمت کے مستحق ہوں گے اور ہمیں بھی ان جیسی سزا مل سکتی ہے۔بلکہ جس کو اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جائے اس کا فرض ہے کہ سنے، اطاعت کرے، اور دل سے تسلیم کرے۔

شفاعت کا غلط عقیدہ

ذٰلِكَ	یہ	بِاَنَّهُمْ	بسبب اس کے کہ بیشک	قَالُوْا	انہوں نے کہا
لَنْ	ہرگز نہیں	تَمَسَّنَا	ہمیں چھوئے گی	النَّارُ	آگ
اِلَّآ	مگر	اَيَّامًا	چند دن	مَّعْدُوْدٰتٍ	گنتی کے
وَغَرَّهُمْ			اور اُن کو دھوکے میں ڈالدیا		
فِيْ دِيْنِهِمْ		ان کے دین (کے بارے) میں		مَّا	اُن چیزوں نے جو
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ			وہ گھڑتے تھے۔(24)		

فرمایا کتاب اللہ سے اعراض کی وجہ شفاعت سے متعلق ان کا باطل عقیدہ ہے۔اور وہ یہ ہے کہ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ انہوں نے کہا کہ ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔مگر چند دن کے لیے یہودیوں میں یہ باطل عقیدہ راسخ ہو چکا تھا۔کہ وہ صرف اتنے ہی دن کے لیے دوزخ میں جائیں جتنے دن ان کے آباء و اجداد نے بچھڑے کی پوجا

کی تھی۔اس کے بعد ہمارے بڑے ہمیں چھڑالائیں گے۔بلکہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دوزخ کے کنارے پر کھڑے ہوں گے۔اور جو بھی ختنے والا اسرائیلی ہوگا اسے جہنم میں نہیں گرنے دیں گے۔اسے پکڑ کر جنت میں داخل کردیں گے۔یہ جبری شفاعت والا عقیدہ ہے کہ ہمارے نبی ہمیں زبردستی خدا تعالیٰ کی گرفت سے چھڑالیں گے۔یہ تو یہودیوں کا عقیدہ ہے۔اور نصاریٰ کا باطل عقیدہ یہ ہے کہ ہم جو چاہے کرتے پھریں۔حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ہماری طرف سے صلیب پر لٹک کر کفارہ ادا کردیا ہے۔ہمیں اب کوئی پرواہ نہیں۔یہ تو عقل کے بھی خلاف ہے کہ جرم کوئی کرے اور سزا کوئی دوسرا بھگتے۔یہ تو ممکن ہی نہیں اصل بات یہ ہے کہ جو کوئی کریگا، وہی بھرے گا۔حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دین میں تو یہ قطعی واضح مسئلہ ہے کہ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کسی ایک کا بار دوسرا نہیں اٹھائے گا۔گنہگار اپنے گناہ کی سزا خود بھگتے گا۔حضور ﷺ کا ارشاد گرامی بھی ہے لَا تَجْنِی عَلَیْہِ وَلَا یَجْنِی عَلَیْكَ جس کا گناہ ہوگا اسی کی گردن پر پڑے گا۔ایک کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا۔اہل کتاب کے باطل عقیدے اس بات کی غمازی کرتے ہیں وَغَرَّھُمْ فِیْ دِیْنِھِمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۲۴ کہ ان کے افتراء نے ان کے دین میں انہیں دھوکا دیا۔افتراء سے مراد وہ باطل عقائد ہیں، جو انہوں نے خود بخود گھڑ لیے تھے۔جیسے، شرک کا عقیدہ، جبری سفارش کا عقیدہ یا کفارے کا عقیدہ وغیرہ یہ سب افتراء میں داخل ہیں۔اسی طرح صرف چالیس روز تک دوزخ میں رہ کر نکل آنے کا عقیدہ بھی یہودیوں کا افتراء تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسی افتراء نے انہیں دھوکا میں رکھا اور وہ اپنی آخرت برباد کر بیٹھے۔افتراء کی بیماری اب مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکی ہے۔اس زمانے میں جس قدر بدعات ہیں سب افتراء میں داخل ہیں۔قبر پرستی، چڑھاوے چڑھانا، عرس منانا، مردے کا تیسرا، ساتواں اور چالیسواں کرنا سب دین میں گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔جن کی کوئی اصل نہیں۔

قانون جزاء وسزا کی وضاحت

جب	اِذَا	پھر کیا حال ہوگا	فَكَیْفَ

جَمَعْنٰهُمْ	ہم انہیں جمع کرینگے	لِيَوْمٍ	ایسے دن میں
لَّا رَيْبَ	کہ نہیں کوئی شک	فِيْهِ	اس (کے وقوع) میں
وَوُفِّيَتْ	اور پورا (بدلہ) دیا جائے گا	كُلُّ نَفْسٍ	ہر نفس کو

مَّا	جو	كَسَبَتْ	اس نے کمایا	وَهُمْ	اور وہ
لَا	نہیں	يُظْلَمُوْنَ	ظلم کئے جائیں گے۔(25)		

فرمایا فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ، ایسے لوگوں کا اس دن کیا حال ہوگا، جب ہم انہیں قیامت کے دن اکٹھا کریں گے اور اس دن کے آنے میں کوئی شک نہیں۔وہ ضرور آئے گا۔وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ اس دن ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔جو اس نے کمایا۔ہر نیکی اور ہر برائی اس دن سامنے آئے گی۔دوسرے مقام پر فرمایا فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی، وہ اسے بھی پالیگا۔خدا کے علم میں ذرہ ذرہ محفوظ ہے۔وہ مقرر دن پر سب کو پورا پورا بدلہ دیگا۔وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ، اس روز کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی۔اہل کتاب کو تنبیہ کی جارہی ہے۔کہ تمہارے باطل عقائد اور باطل اعمال کا ریکارڈ اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔اس کا بدلہ تمہیں بہر حال چکھنا ہوگا۔اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نکلنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکے گی۔اور یہ تمہارے اپنے اعمال کا ہی نتیجہ ہوگا۔تم پر ظلم نہیں ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بہت سے مقامات پر اپنے قانون جزاء وسزا کی وضاحت فرمادی ہے۔جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے خود کمایا ہو، آباؤ اجداد کی نیکی یا بندگی کسی کے کچھ بھی کام نہ آسکے گی۔ نیز اتنا ہی ملے گا جتنا اس نے عمل کیا ہے، نہ کم نہ زیادہ، کمی تو کسی صورت نہ ہوگی اور اللہ اگر چاہے تو عمل کا زیادہ بدلہ بھی دے سکتا ہے۔نیز اللہ کے حضور کرے کوئی اور بھرے کوئی والا سلسلہ بھی نہیں چل سکتا۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا بار اٹھانے کو تیار نہ ہوگا خواہ وہ اس کا کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔واضح رہے کہ ایمان کی حالت میں اخلاص کے ساتھ جو بھی نیک عمل (فرائض پنجگانہ، تلاوت

کلام الٰہی، ذکرواذکار صدقات وغیرہ) کیا جاتا ہے، وہ اللہ کے فضل سے مقبول ہوتا ہے، اور اس کا اجرو ثواب آخرت کے لیے محفوظ کرلیا جاتا ہے، لہٰذا اگر کسی شخص نے اپنی زندگی میں قرآن مجید، کلمہ، و دیگر اذکار پڑھ کر اپنے لیے جمع کر رکھا ہو، تو مرنے کے بعد ان اعمال کا اجروثواب اس کو مرنے کے بعد ملے گا۔ البتہ جو شخص کوئی ایسا نیکی کا کام جاری کرجائے جو اس کی موت کے بعد جاری رہے تو اس کا ثواب اس کی موت کے بعد بھی بطور حصہ رسدی اسے ملتا رہے گا۔ یعنی اگر وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسا نیک کام کرجائے مثلاً مسجد بنوادی، مدرسہ بنادیا یا بچے کو حافظ قرآن، عالم دین بنادیا یا کوئی رفاہ عامہ کے لیے مکان تعمیر کرگیا ہو تو جب تک یہ چیزیں باقی رہیں گی ان کا ثواب اس کو بھی ملتا رہے گا اور اس طرح اگر کوئی بندہ کسی میت کے لیے اعمال بدنیہ یا مالیہ کا ثواب پہنچائے تو یہ جائز ہے اور اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کی زندگی میں اس کو ایصال ثواب کرنا جس طرح زندگی میں اس کا ثواب اس کو پہنچ جاتا ہے ایسے ہی مرنے کے بعد بھی پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے کوئی برائی کا کام جاری کیا تو بطور حصہ رسدی اس کا گناہ بھی اس کے کھاتہ میں جمع ہوتا رہے گا۔ (مسلم)

زمین وآسمان کا مالک اور سارے جہان کا بادشاہ اللہ ہی ہے/تغیرات اور تصرفات کرنے والی ذات

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَ
تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۶
تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ
الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۲۷

احادیث سے ثابت شدہ اسم اعظم

قُلِ	آپ کہہ دیجئے	اللّٰهُمَّ	اے اللہ		
مٰلِكَ الْمُلْكِ	اے مالک بادشاہی کے	تُؤْتِي	تو (ہی) دیتا ہے		
الْمُلْكَ	بادشاہی	مَنْ	جس کو	تَشَآءُ	تو چاہے
وَتَنْزِعُ	اور چھین لیتا ہے	الْمُلْكَ	بادشاہی	مِمَّنْ	جس سے
تَشَآءُ	تو چاہے	وَتُعِزُّ	اور تو (ہی) عزت دیتا ہے		
مَنْ تَشَآءُ	جس کو چاہے	وَتُذِلُّ	اور تو (ہی) ذلت دیتا ہے		

مَنْ تَشَآءُ	جس کو چاہے	بِيَدِكَ	تیرے ہی ہاتھ میں ہے
الْخَيْرُ	سب بھلائی	اِنَّكَ	یقیناً تو
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز پر	قَدِيْرٌ	خوب قادر ہے۔(26)

اس آیت کے شان نزول کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیات نجران کے وفد کے باطل زعم کے جواب میں نازل ہوئیں۔نجران کے عیسائی خوب جانتے تھے کہ آپ وہی پیغمبر آخر الزماں ہیں۔جن کی آمد کی پیش گوئیاں اور جن کی نشانیاں ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دعائیہ آیات میں اسم اعظم بھی موجود ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ نام جس کے متعلق آتا ہے إِذَا دُعِىَ بِهِ أَجَابَ، وَإِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى «[سنن أبي داود 79/2] یعنی جب اس اسم اعظم کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے اور جب وہ نام لے کر مالک الملک سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ پورا کرتا ہے۔اسم اعظم اللہ تعالیٰ کا وہ عظیم نام یا صفاتی کلمات ہیں جن کے وسیلے سے مانگی گئی دعا رد نہیں ہوتی۔احادیث نبوی ﷺ کی روشنی میں اس کی فضیلت یہ ہے کہ جو شخص اسم اعظم کے ذریعے دعا مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ہر جائز دعا کو قبول فرماتے ہیں اور اس کی تمام مشکلات کو دور کردیتے ہیں مختلف مستند احادیث میں اسم اعظم کے حوالے سے چند مخصوص کلمات کا ذکر ملتا ہے جن کا ورد بہت فضیلت رکھتا ہے۔جامع ترین دعا (دعائے یونس): لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ یہ کلمات سیدنا یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں پڑھے تھے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان اس دعا کے ذریعے کوئی بھی چیز مانگے گا اللہ قبول فرمائیں گے۔اور احادیث میں کئی ایک آیات کے متعلق آتا ہے کہ ان میں اسم اعظم ہے ایسا ہی سورہ آل عمران کی پہلی آیت الٓمّٓ ۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۲ کے متعلق بھی بیان ہوچکا ہے۔اس لحاظ سے آج کے درس کی دعا بھی بڑی مقبول دعا ہے۔ارشاد ہوتا ہے قُلِ اللّٰهُمَّ، آپ اس طرح دعا کریں اے اللہ مٰلِكَ الْمُلْكِ تو جو سلطنت کا مالک حقیقی ہے۔کیونکہ دنیا کے ملوک تو عارضی مالک ہیں۔ان کی ملکیت تو

چندروزہ ہے۔اصلی اوردائمی مالک تو وہی خداوندقدوس ہے۔تیری یہ خاص صفت ہے کہ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ ،توسلطنت اور بادشاہی جس کو چاہے عطا کرتا ہے کیونکہ یہ صرف تیرے اختیار میں ہے۔یہ بادشاہت تواپنے خاص بندوں کے علاوہ آزمائش کے لیے بعض اوقات بڑے بڑے مجرموں اورنافرمانوں کوبھی دے دیتا ہے۔گذشتہ سورہ میں نمرود کا واقعہ گزرچکا ہے۔جس نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔اسکے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا،اَنْ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ،اللہ نے اس کو بہت بڑی سلطنت دے رکھی تھی۔جس کی وجہ سے وہ شکرگزار بندہ بننے کی بجائے مغرورہوگیا تھا۔فرعون نے بھی یہی کہا تھا، اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ ،مصر کی حکومت میری ہے۔دیکھ لو۔میرے حکم سے نہریں چل رہی ہیں۔ڈیم بنے ہوئے ہیں۔جن سے آبپاشی ہوتی ہے۔خزانے بھرپور ہیں۔طاقتورفوج موجود ہے۔میرے سوااورکون ہے۔مقصد یہ کہ بعض اوقات اللہ اپنے نافرمانوں کوبھی حکومت کی چابیاں دے دیتا ہے اوروہ محض آزمائش ہوتی ہے۔پھرجب اس کا وقت پورا ہوجاتا ہے وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ اورتوجس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے تاریخ گواہ ہے کہ ایک وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے رومیوں اورایرانیوں سے سلطنت چھین کر مسلمانوں کے حوالے کردی اور یہ سب کچھ حضرت عمررضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ہوا۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشینگوئی

جب غزوہ احزاب کے موقع پرآنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پیشینگوئی فرمائی تھی کہ روم اورایران کی سلطنتیں مسلمانوں کے قبضے میں آجائیں گی توکفارنے بڑا مذاق اڑایا کہ ان لوگوں کو اپنے دفاع کے لئے خندق کھودنی پڑرہی ہے اوران پرفاقے گزررہے ہیں مگردعوے یہ ہیں کہ یہ روم اورایران فتح کرلیں گے،اس موقع پریہ آیات نازل ہوئیں،جن میں مسلمانوں کویہ دعا تلقین فرماکرایک لطیف پیرائے میں ان کا جواب دے دیا گیا۔دنیانے دیکھا17 ـ 18ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے کچھ عرصہ بعد ہی شام،ایران اورصنعا وغیرہ زیرنگین آگئے۔مقصد یہ کہ وہ مالک الملک جس کو چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے اورجس سے چاہتا ہے،چھین لیتا ہے۔عرب توسارے کا سارا

حضور ختم المرسلین ﷺ کے زمانہ میں ہی اسلام داخل ہو چکا تھا۔ تاہم عرب، ترک اور افغان قومیں مجموعی طور پر اسلام میں داخل ہوئیں۔ بڑے عرصہ تک اسلام کی نعمت سے محروم رہے۔ مگر جب قریب آئے تو ایک دن میں چار لاکھ ترک مسلمان ہو گئے۔ افغان قوم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے یا کچھ عرصہ بعد پوری کی پوری اسلام میں داخل ہوئی۔ حضرت انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کشمیری فرماتے ہیں کہ عرب تو قومی طور پر اسلام میں داخل ہو چکے تھے، اس لیے دعا کا آغاز اس طرح ہو رہا ہے۔ کہ اے اللہ! تو جسے چاہے سلطنت عطا کرتا ہے۔ اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے۔

مسلمانوں کا دنیا میں عدل و انصاف

مسلمانوں نے دنیا میں عدل و انصاف قائم کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں غلبہ عطا کیا حتی کہ حضور ﷺ کی بعثت سے لے کر پچاس سال کے عرصہ میں آدھی دنیا پر مسلمانوں کو تسلط حاصل ہو چکا تھا۔ حالانکہ قوموں کی زندگی میں پچاس سال کے عرصہ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کی یہ رواں دواں ترقی جنگ صفین پر آ کر رک گئی جب حضرت امیر معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا۔ اور صفین کے مقام پر آپس میں لڑائی ہوئی۔ اسلام کی صداقت تو ہمیشہ قائم رہی۔ دین اپنے برہان اور حجت کے ساتھ تو ہمیشہ غالب رہا مگر پچاس سال کے قلیل عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے پولٹیکل طور پر بھی دنیا کے وسیع خطے پر غلبہ عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اسی میں تھی کہ اس ظالمانہ نظام کو ختم کیا جائے اور نبی آخر الزمان ﷺ کو مبعوث کیا جائے جو اسلام کا عادلانہ توحید اور اطاعت پر مبنی نظام قائم کریں۔ چنانچہ جب تک مسلمان ان اصولوں پر قائم رہے۔ کوئی دوسری قوم ان کے مقابلے پر نہیں آئی اور ساڑھے چھ سو سال تک مسلمان دنیا میں غالب رہے۔ پھر جب خود انہوں نے مجموعی طور پر اس نظام سے روگردانی کر لی۔ تو ان کی حالت بگڑنا شروع ہو گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری قومیں ان کے مقابلہ میں کھڑی ہو گئیں۔ اے مالک الملک! حقیقی مالک تو ہی ہے **وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ** تو جسے چاہے عزت دیتا ہے۔ تو نے ہی اہل اسلام کو عزت بخشی۔ ایمان کی دولت دی۔ نیکی کا راستہ دکھایا۔ پیغمبر (علیہ السلام) کے اتباع کی توفیق بخشی اور

پھر ظاہری اقتدار بھی عنایت کیا وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ تو جس کو چاہے ذلیل کر دیتا ہے۔ یہ بھی تیری ہی صفت ہے، کفر، شرک، نفاق، نافرمانی، بدعت سب ذلت کی چیزیں ہیں۔ جب اللہ کی طرف سے آزمائش آتی ہے تو لوگ سیدھے راستے سے بھٹک کر ذلیل وخوار ہو جاتے ہیں۔ فرمایا: بِيَدِكَ الْخَيْرُ، مولا کریم! تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے، "الْخَيْرُ" میں الف لام استغراق کا ہے اور بِيَدِكَ خبر پہلے آنے سے تخصیص پیدا ہوگئی ہے، اس لیے ترجمہ "تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے" کیا گیا ہے۔ فرمایا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۶ ۔ تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ تمام تغیرات تیرے ہی دست قدرت میں ہیں۔ الغرض! اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قوت وطاقت کا اظہار ہے، شاہ کو گدا بنا دے، گدا کو شاہ بنا دے، تمام اختیارات کا مالک وہی ہے۔ یہود اور کفار کی اسی پھبتی کا جواب اس جامع قسم کی دعا میں دیا گیا ہے کہ عزت وذلت اور اقتدار وغیرہ سب کچھ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ آج جو حاکم ہیں کل محکوم بن جائیں اور جو شہنشاہ ہیں وہ گدا بن جائیں جو کمزور ہیں وہ طاقتور بن جائیں۔

سلطنت وحکومت بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے جسے چاہے عطا فرمائے۔ کتنی بڑی بڑی سلطنتیں گزریں جن کے زمانے میں کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہ بھی کبھی فنا ہوں گی لیکن اللہ مالکُ الملک کی زبردست قوت وقدرت کا ایسا ظہور ہوا کہ آج ان کے نام ونشان مٹ گئے۔ یونان کا سکندرِ اعظم، عراق کا نمرود، ایران کا کسریٰ ونوشیرواں، ضحاک، فریدوں، جمشید، مصر کے فرعون، منگول نسل کے چنگیز اور ہلاکو خان بڑے بڑے نامور حکمران اب صرف قصے کہانیوں میں رہ گئے اور باقی ہے تو ربُّ العالمین کا نام اور حکومت باقی ہے اور اسی کو بقا ہے۔ یونہی عزت وذلت دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ دور دراز کے گاؤں، بستیوں سے، چھوٹے اور غریب خاندانوں سے اٹھا کر تختِ حکومت پر بٹھا دینا، غلاموں کو بادشاہت عطا کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے اور معاشرے کے معزز ترین بلکہ دوسروں کو عزتیں اور خلعتیں بخشنے والوں کو ذلت وگمنامی کے عمیق گڑھوں میں پھینک دینا اُسی اَحکم ُالحاکمین کی قدرت ہے۔ اس آیت میں دعا کے انداز میں مسلمانوں کو بشارت بھی دے دی

کہ تمہیں اس دنیا میں غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا اور خاتم النبیین ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ۔

رات دن اور موسموں کا تغیر و تبدل

تُوْلِجُ	تو داخل کرتا ہے	الَّیْلَ	رات کو	فِی النَّهَارِ	دن میں
وَتُوْلِجُ	اور تو داخل کرتا ہے	النَّهَارَ	دن کو	فِی الَّیْلِ	رات میں
وَتُخْرِجُ	اور تو نکالتا ہے	الْحَیَّ	زندہ کو	مِنَ الْمَیِّتِ	مُردہ سے
وَتُخْرِجُ	اور تو نکالتا ہے	الْمَیِّتَ	مُردہ کو	مِنَ الْحَیِّ	زندہ سے
وَتَرْزُقُ	اور تو رزق دیتا ہے	مَنْ		جس کو	
تَشَآءُ	چاہتا ہے	بِغَیْرِ حِسَابٍ		بے حساب۔(27)	

تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ ،تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں ،وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ،اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں۔ یعنی شب و روز کو چھوٹا بڑا کرتا ہے۔ کبھی رات بڑی ہوتی ہے اور دن چھوٹا ہوتا ہے۔ اور کبھی دن لمبا ہوتا ہے اور رات مختصر ہوتی ہے۔ موسموں کے تغیر و تبدل میں یہ مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ،رات اور دن کو پلٹیاں دینا اسی ذات کا کام ہے۔ جب تک اس کو منظور ہے لیل و نہار کا یہ نظام چلتا رہے گا۔ اس آیت میں دن اور رات کا ذکر کیا گیا ہے۔ دن اور رات کا آنا جانا تو معمول کا کام دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر قدرت کے اس نظام کی گہرائی میں جائیں تو انسان حیران رہ جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات اور ہمارا نظام شمسی ایسے قائم کیا ہے کہ زمین سورج کے گرد ایک معین فاصلہ پر چکر لگا رہی ہے۔ سورج زمین کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اسی وجہ سے زمین اپنے مدار سے دور نہیں ہوتی اس کے علاوہ زمین اپنے محور پر بھی گھوم رہی ہے جس کی وجہ سے دن اور رات اپنے مخصوص وقت پر آتے ہیں اور یہ نظام ہر قسم کی خامی سے اس قدر پاک ہے کہ صدیوں سے بغیر کسی رکاوٹ یا خرابی کے مسلسل چلا آرہا ہے، نہ کسی مستری، انجینئر اور نہ ہی کسی ماہر فلکیات کی ضرورت پڑی ہے تو ظاہر ہوا ہے کہ یقیناً کوئی ایسی طاقت ہے جس کا تمام کائنات پر

مکمل کنٹرول ہے۔جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔اس نظام کو ترتیب دینے والا کوئی مختارکل ضرور ہے اور وہ طاقت اللہ کے سوا کوئی نہیں ہوسکتی۔ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے جس طرح گٹھلی سے اتنا بڑا درخت پیدا کر دینا۔انڈہ مردہ ہے اس سے زندہ بچہ پیدا کر دینا۔ بے جان قطرہ آب سے زندہ انسان کو پیدا کر دینا اور کافر سے مومن کی تخلیق کرنا سب کچھ تیرے ہی اختیار میں ہے۔وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ اور تو چاہے تو مردہ کو زندہ سے نکال دے۔ جیسے زندہ جانور سے مردہ انڈا پیدا ہونا۔نیکوکار بلکہ پیغمبر جیسی عظیم الشان ہستی سے کافر اور ناہنجار اولاد کا پیدا ہونا ظاہر ہے اس کی قدرت کا مظاہرہ مخلوقات کی پیدائش میں اس طرح بھی ہوتا ہے،اللہ تعالیٰ نے مٹی کا ایک پتلا بنایا اور اس میں اپنی قدرت سے جان ڈال دی پھر حضرت آدم (علیہ السلام) کا وجود ظاہر ہو گیا حضرت حوا کو بغیر والدین کے اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا اور پھر اس کے بعد ان کی اولاد کا ایک نیا سلسلہ بنا دیا۔اے اللہ! یہ تغیرات اور تصرفات سب تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔تو ہی ہر چیز کا مالک ہے۔وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ تو روزی دیتا ہے جس کو چاہے بغیر حساب کے۔بعض کو آسانی کے ساتھ رزق پہنچا تا ہے کہ انہیں کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑتی اور ملتی بھی اتنی زیادہ ہے جو شمار سے باہر ہو۔حضرت سلیمان (علیہ السلام) سے فرمایا۔ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ یہ سلطنت اور ہر چیز ہماری عطا کردہ ہے جس کو چاہو دے دو اور چاہو تو روک لو۔ یہ بغیر حساب کے ہے۔آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔یہ ہماری بخشش ہے اور آپ کو اختیار بھی دے دیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ایسی رعایت فرمائی۔مگر دوسری جگہ یہ بھی فرمایا۔ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ۔ جس کی چاہے روزی تنگ کر دے۔ساری دنیا کے ملوک چاہیں تو کسی کو ایک دانہ گندم کا نہ دیں اس کی مصلحت کو اس کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔اسی لیے دعا کے انداز میں فرمایا۔ اے مولا! تو جسے چاہے روزی عطا کرتا ہے بغیر حساب کے یعنی بیحد و بے شمار۔

کفار و مشرکین سے دوستی کی ممانعت
تعلقات و سلوک کے تین درجات

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ
فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ؕ وَاِلَی
اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ۝٢٨ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ ؕ وَیَعْلَمُ مَا
فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝٢٩ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ
مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَھَا وَبَیْنَہٗٓ
اَمَدًۢا بَعِیْدًا ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ ؕ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝٣٠

غیر مسلم سے دوستی یا دلی محبت رکھنا

لَا یَتَّخِذِ	نہ بنائیں	الْمُؤْمِنُوْنَ	مومن		
الْکٰفِرِیْنَ	کافروں کو	اَوْلِیَآءَ	دوست		
مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ	سوائے مومنوں کے	وَمَنْ	اور جو کوئی		
یَّفْعَلْ	کرے گا	ذٰلِكَ	یہ	فَلَیْسَ	تو نہیں ہے

مِنَ اللّٰهِ	(اسے) اللہ سے	فِيْ شَيْءٍ	کوئی تعلق	اِلَّآ	مگر

اَنْ	اس لئے کہ	تَتَّقُوْا	تم بچنا چاہو
مِنْهُمْ	ان (کے شر) سے	تُقٰىةً	بچنا
وَيُحَذِّرُكُمُ	اور ڈراتا ہے تمہیں	اللّٰهُ	اللہ
نَفْسَهٗ	اپنی ذات سے	وَاِلَى اللّٰهِ	اور اللہ ہی کی طرف
الْمَصِيْرُ		لوٹ کر جانا ہے۔(28)	

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ مومن لوگ مومنوں کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔کیونکہ کافروں کا پروگرام قرآن پاک کے خلاف ہے۔وہ تو کفر کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ اللہ نے ان کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ان میں یہود،نصاریٰ،مشرک،منافق سب شامل ہیں۔کسی کے ساتھ دوستانہ جائز نہیں۔اگر رفاقت ہوسکتی ہے تو صرف مسلمانوں کے ساتھ جن کا مرکزی عقیدہ اور نقطہ نگاہ ایک ہے،پروگرام اور منزل مقصود ایک ہے،اس لیے اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ کافروں کی بجائے مومنوں سے دوستی کریں۔فرمایا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ جو کافروں سے دوستی کریگا وہ اللہ کے سامنے کسی چیز میں نہیں ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا دین اور مذہب ہرگز قابل اعتبار نہیں۔

اضطراری حالت کے مسائل

ہاں ایک صورت میں روا ہے اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً،کہ تم کافروں سے بچاؤ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاؤ!ایسی صورت میں تم ظاہری طور پر ان سے دوستی کا اظہار کر سکتے ہو،کیونکہ اضطراری حالت میں تو مردار بھی کھایا جاسکتا ہے۔اضطراری حالت" (حالتِ اضطرار) سے مراد انسان کی وہ انتہائی مجبوری کی کیفیت ہے جہاں جان،مال یا عزت کو شدید خطرہ لاحق ہو اور شریعت اس پر بعض بنیادی پابندیوں میں نرمی یا چھوٹ (رخصت) دیتی ہے۔ایسی حالت میں اجازت ہے ،اضطراری حالت کا مطلب یہ ہے کہ انسان بھوک میں مبتلا ہے۔اور کوئی حلال چیز میسر نہیں۔تو اس

وقت مردار، خنزیر کا گوشت یا شراب وغیرہ جو کچھ میسر ہو، اس قدر استعمال کر سکتا ہے۔ جس سے جان بچ جائے۔ پیٹ بھرنے یا لطف اندوز ہونے کی اجازت نہیں۔ یہ رخصت اتنی اہم ہے کہ اگر کوئی شخص اس حالت میں حرام کھا کر اپنی جان نہیں بچاتا اور مر جاتا ہے، تو اسے گنہگار سمجھا جاتا ہے۔ حرام کھاتے وقت دل میں یہ ارادہ ہو کہ میں مجبوری کے تحت یہ کر رہا ہوں، اسے حلال نہ سمجھا جائے، اگر ایک سے زیادہ حرام چیزیں موجود ہوں، تو نسبتاً کم حرمت والی چیز کا استعمال کیا جائے۔ اضطراری حالت میں بھی کسی دوسرے بے گناہ انسان کی جان لینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مثلاً: اگر کسی کو قتل کی دھمکی دے کر مجبور کیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کو قتل کرے، تو اسے اپنی جان کی قربانی دینی چاہیے لیکن کسی اور کی جان نہیں لینی چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی وقت کافروں کو غلبہ حاصل ہو اور ان کے شر سے بچنے کے لیے دوستی کا اظہار کر دیا جائے تو کوئی گرفت نہیں وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے کہیں اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا، ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ کیونکہ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۲۸ اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ وہ ایک ایک چیز کا حساب لے لے گا۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ حُسنِ اخلاق و نیک برتاؤ اور ظاہری خوش خُلقی سے پیش آنا درست ہے، اور اسلامی اخلاق سے متاثر کر کے غیر مسلم کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے اسی کی اجازت ہے۔ جہاں تک قلبی تعلق اور دلی دوستی کی بات ہے تو یہ کسی غیر مسلم کے لیے رکھنا جائز نہیں ہے۔

کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں: موالات یعنی دوستی۔ مدارات: یعنی ظاہری خوش خلقی۔ مواساۃ: یعنی احسان و نفع رسانی یعنی غمگساری اور نفع رسانی، یہ مسلمانوں کے لئے بھی ہے، غیر مسلموں کے لئے بھی، خود رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا ہے اور جانی دشمنوں کی حاجت روائی فرمائی ہے اور 'مدارات' یعنی ظاہری خوش اخلاقی کا ہے، یہ صورت ان غیر مسلموں کے لئے جائز بلکہ

مطلوب ہے جو مسلمانوں کے ساتھ امن وامان سے رہتے ہیں، جو لوگ مسلمانوں سے برسر جنگ ہیں جن کو 'حربی' کہا جاتا ہے، ان کے ساتھ درست نہیں، سوائے اس کے کہ اپنے آپ سے نقصان دور کرنا یا خود اس کافر کی دینی مصلحت کو پورا کرنا مقصود ہو یا وہ غیر مسلم مسلمان ہو جائے، موالات یہ تو کسی حال میں جائز نہیں قلبی دوستی جو آدمی کے فکر وعمل پر اثر انداز ہونے لگے، یہ غیر مسلموں سے جائز نہیں اکثر علمائے کرام کا یہ خیال ہے کہ حقیقی دوستی کفار کے ساتھ ہرگز جائز نہیں سوائے اس حالت کے کہ مسلمان کسی صورت کفار کے دباؤ میں آجائے تو ایسی صورت میں جان ومال بچانے کے لئے وقتی دوستی کا اظہار کیا جاسکتا ہے مگر اس میں بھی یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ سب کچھ کرنے والا تو رب العزت ہی ہے یہ تو محض ایک چھوٹی سی سہولت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں مصلحتاً دوستی کی جاسکتی ہے۔ 1 اپنے بچاؤ کے لئے۔ 2 کافر کو اسلام کی طرف لانے کے لئے۔ 3 جب کافر مہمان بن کر آئے۔ اس کے علاوہ ذاتی فائدہ حاصل کرنے کے لئے کافر سے دوستی جائز نہیں۔ اگر یہ خطرہ ہو کہ کافر دین کو نقصان پہنچائے گا یا مسلمانوں کو نقصان پہنچائے گا تو ایسی حالت میں دوستی تو دور کی بات ہے اس سے میل جول بھی بند کر دینا چاہیئے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ مزید ڈراتا ہے اور واضح کر دیتا ہے کہ جو مسلمان دوستی کے معاملہ میں دیئے گئے احکامات کی پرواہ نہ کرے گا تو اس کو اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ بالآخر رب العزت کے پاس ہی جانا ہے اور وہاں تمام اعمال کے مطابق سزا یا جزا ضرور ملے گی۔ خوب سوچ رکھنا چاہیئے کہ رب العزت کی گرفت سے کوئی شخص کسی صورت میں بچ نہیں سکتا۔ دوستی تو ویسے بھی بہت سوچ سمجھ کر کرنی چاہیئے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ میری بزرگی اور عظمت کے خیال سے آپس میں محبت کرتے ہیں۔ ان کے لئے نور کے منبر ہوں گے ان پر نبی اور شہید رشک کریں گے۔ (ترمذی)

اہل بدعت رشتہ داروں سے تعلقات کا حکم

اہلِ بدعت اور فساق کے ساتھ پانچ قسم کے معاملے ہوتے ہیں:

1۔موالات یعنی دوستی اور دلی تعلق 2۔مدارات یعنی ظاہری خوش اخلاقی 3۔مواساۃ یعنی احسان ونفع رسانی 4۔معاملات، یعنی خرید وفروخت 5۔مناکحت، باہم نکاح کرنا۔

ان معاملات میں تفصیل یہ ہے:

1۔موالات (یعنی قلبی دوستی) توکسی حالت میں جائز نہیں۔2۔ مدارات (یعنی خوش اخلاقی) تین حالتوں میں درست ہے، ایک دفع ضرر (یعنی نقصان سے بچنے) کے واسطے۔دوسرے اس کی دینی مصلحت یعنی ہدایت کی توقع کے واسطے۔تیسرے اکرامِ ضیف کے لیے۔اور اپنی مصلحت یا مالی منفعت یا جاہ کے لیے درست نہیں، خصوصاً جب کہ دینی ضرر (نقصان) کا بھی خوف ہو تو بدرجہ اولیٰ یہ اختلاط حرام ہوگا۔3۔مواساۃ (یعنی احسان ونفع رسانی) کا حکم یہ ہے کہ اہلِ حرب کفار کے ساتھ (یعنی جن کفار سے جنگ وقتال ہے ان کے ساتھ) ناجائز ہے، اور غیر اہلِ حرب کفار کے ساتھ جائز ہے ۔اور یہی حکم فساق اور اہلِ بدعت کا ہے۔(مأخوذ از بیان القرآن: ص ۱۱/ج ۳، آل عمران)

4۔معاملات (خرید وفروخت) کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں صالح مسلمانوں کے معاشرے کو نقصان نہ ہوتا ہو تو باہم خرید وفروخت بھی جائز ہے۔(مستفاد از معارف القرآن) 5۔مناکحت کا حکم یہ ہے کہ جو بدعت کفر تک نہ پہنچائے ایسے اہلِ بدعت سے گو نکاح حرام نہیں، بلکہ جائز ہے، لیکن اگر اہلِ بدعت کی اصلاح کی امید نہ ہو تو ان سے نکاح کرنے سے مکمل اجتناب کرنا چاہیے۔خلاصہ یہ ہے کہ اگر اس بات کی امید ہو کہ اچھے سلوک اور اچھے اخلاق کی وجہ سے متاثر ہو کر اہل بدعت آپ سے جڑ جائیں گے اور اپنی بدعت سے توبہ کرلیں گے تو ان سے تعلق رکھنا چاہیے اور ان کا خوب اکرام کرنا چاہیے، لیکن اگر اس بات کی بالکل کوئی امید نہ ہو اور ان سے تعلق رکھنے کی صورت میں اپنے بگڑنے کا اندیشہ ہو اور قطع تعلقی کرنے کی صورت میں ان کو اور دیگر لوگوں کو عبرت ہونے اور توبہ کرنے کی امید ہو تو اس صورت میں ان سے قطع تعلقی کرلینی چاہیے؛ تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔ایسے لوگ جو علانیہ گناہوں اور بدعات کا ارتکاب کرنے والے ہوں اور اپنے عمل سے باز نہ آتے ہوں ان سے میل جول، بات چیت ترک کردینا شریعت میں ثابت ہے، لہذا اس صورت میں ان کے ساتھ اصل ہمدردی یہی

ہے کہ انہیں راہِ راست پر لانے اور دیگر لوگوں کی عبرت کے لیے ان سے قطع تعلق کیا جائے، ایسے لوگوں کے ساتھ تعلق قائم رکھ کر ہمدردی کرنا گناہ اور غلط کاموں میں معاونت اور ان کی حوصلہ افزائی ہے۔ بہرصورت اس آیت میں کفار کو دوست بنانے سے منع کیا گیا ہے اسی سے اس بات کا حکم بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں سے اتحاد کرنا کس قدر برا ہے۔

وسعتِ علمِ الٰہی

قُلْ	کہ دیجئے	اِنْ	اگر	تُخْفُوْا	تم چھپاؤ

مَا	وہ (بات) جو	فِیْ صُدُوْرِكُمْ	تمہارے سینوں میں ہے
اَوْ تُبْدُوْهُ	یا تم اسے ظاہر کرو	یَعْلَمْهُ اللّٰهُ	اسے جانتا ہے اللہ

وَیَعْلَمُ	اور وہ جانتا ہے	مَا	جو کچھ
فِی السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں ہے	وَمَا	اور جو کچھ
فِی الْاَرْضِ	زمین میں ہے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ	ہر چیز پر	قَدِیْرٌ	خوب قادر ہے۔(29)

فرمایا قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ آپ کہ دیجئے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اَوْ تُبْدُوْهُ یا تم اس کو ظاہر کرو یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ط، اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۲۹۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں خواہ وہ کائنات کے کسی کونے میں موجود ہو۔ حتیٰ کہ وہ ہر شخص کے دل میں چھپی ہوئی بات سے بھی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ منافق کون ہے جس کے دل اور زبان میں تضاد ہے۔ وہ اپنی منافقت سے دوسرے لوگوں کو تو دھوکا دے سکتا ہے۔ مگر اللہ تو اس کی نیت تک سے واقف ہے۔ وہ اپنی بدنیتی اور بدعملی کی سزا ضرور بھگتے گا۔

کائنات کی ہر شے کا احاطہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل اور لامحدود علم کا ذکر فرمایا ہے۔ انسان اپنے سینے (دل) میں جو بھی ارادے، نیتیں، محبت، بغض، اچھائی یا برائی چھپاتا ہے یا اسے زبان سے ظاہر کردیتا ہے، اللہ ان سب سے مکمل باخبر ہے اللہ کے علم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں، نہ آسمانوں کی بلندیاں اور نہ زمین کی تہوں میں ہونے والے معاملات۔ وہ کائنات کے ہر ذرے کو جانتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا اظہار فرمایا ہے کہ وہ جو چاہے کرنے پر قادر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، تو انسانوں کے پوشیدہ اور ظاہر اعمال کا حساب لینا بھی اس کے لیے بالکل آسان ہے۔ بنیادی پیغام اور سبق یہ آیت انسان کو اخلاص کی تلقین کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ اصل نیکی اور تقویٰ دل کی پاکیزگی میں ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے پوری طرح واقف ہے، اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے دل کو حسد، کینہ، اور برے ارادوں سے پاک رکھے۔

اعمال کی مکمل حاضری

يَوْمَ	جس دن	تَجِدُ	پائے گا	كُلُّ نَفْسٍ	ہر نفس
مَّا	جو	عَمِلَتْ	اس نے عمل کیا	مِنْ خَيْرٍ	اچھائی سے
مُّحْضَرًا	(اپنے سامنے) حاضر کیا ہوا	وَّمَا	اور جو		
عَمِلَتْ	اس نے عمل کیا	مِنْ سُوْٓءٍ	برائی سے (وہ بھی)		
تَوَدُّ	تو وہ آرزو کریگا	لَوْ اَنَّ	کاش کہ ہو		
بَيْنَهَا	اس کے درمیان	وَبَيْنَهٗٓ	اور اُس (کی برائی) درمیان		
اَمَدًۢا	فاصلہ	بَعِيْدًا	دور کا	وَيُحَذِّرُكُمُ	اور تمہیں ڈراتا ہے
اللّٰهُ	اللہ	نَفْسَهٗ	اپنی ذات سے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
رَءُوْفٌ	بہت شفقت کرنے والا ہے	بِالْعِبَادِ	اپنے بندوں پر۔		

فرمایا یَوۡمَ تَجِدُ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ مِنۡ خَیۡرٍ مُّحۡضَرًا ، قیامت کا دن آنے والا ہے۔جس روز ہر شخص دنیا میں کیے گئے ہر نیک عمل کو اپنے سامنے موجود پائے گا۔قرآن پاک میں دوسرے مقام پر موجود ہے لوگوں کے اعمال ان کے سامنے رکھ دیے جائیں گے۔اور اس طرح وَّمَا عَمِلَتۡ مِنۡ سُوۡٓءٍ ، جو کوئی برائی کا کام کیا ہوگا، وہ بھی سامنے آجائے گا۔ہر شخص اپنے اعمال کو خود دیکھے گا۔برے اعمال کو دیکھ کر اس کے دل میں حسرت پیدا ہوگی کہ کاش کہ اس نے یہ عمل نہ کیا ہوتا تَوَدُّ لَوۡ اَنَّ بَیۡنَہَا وَبَیۡنَہٗۤ اَمَدًۢا بَعِیۡدًا ؕ اس دن وہ پسند کرلے گا، کاش کہ اس کی برائی اور اس کے درمیان لمبا چوڑا فاصلہ ہوتا۔یعنی اس کی بدعملی اس کے قریب نہ ہوتی۔مگر اس وقت کی آرزو کوئی فائدہ نہ دے گی، اور اسے برائی کی سزا مل کر رہے گی۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ ؕ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔اپنے اعمال کا محاسبہ اسی دنیا میں کرلو۔تاکہ قیامت کے دن حسرت و ناامیدی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ہاں اللہ تعالیٰ بلاوجہ کسی پر زیادتی بھی نہیں کرتا وَاللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۳۰﴾ وہ تو اپنے بندوں کے ساتھ شفقت رکھتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنے اندر ایمان کا نور پیدا کریں۔اپنے مالک کی طرف رجوع کریں، چھوٹے موٹے گناہوں سے توبہ کریں۔اور اپنے اندر اطاعت کا جذبہ پیدا کریں۔وہ اپنے بندوں سے اچھا سلوک کرنا چاہتا ہے۔اور اس کے لیے کوئی بڑی شرائط بھی پیش نہیں کرتا۔انسان اپنی توجہ کا مرکز اللہ تعالیٰ کو بنالے تو اس کی رحمت کے دروازے دنیا اور آخرت دونوں جگہ کھل جاتے ہیں۔

انتباہ اور تیاری کا درس

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دن کوئی بھی نیکی یا برائی ضائع نہیں ہوگی۔چھوٹے سے چھوٹا نیکی کا کام اور بڑے سے بڑا گناہ، سب ایک میزان میں موجود ہوں گے۔نیکیوں کو دیکھ کر مومن کو بے حد خوشی اور اطمینان حاصل ہوگا۔جب انسان اپنے گناہوں کو اپنے سامنے دیکھے گا تو اس کی ہولناکی سے وہ کانپ اٹھے گا۔یہ آیت ہمیں دنیاوی زندگی میں غفلت چھوڑنے اور نیکیوں میں سبقت لے جانے کی ترغیب دیتی

ہے۔ یہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ آج کا کیا ہوا عمل کل ہمارے سامنے حاضر ہوگا۔ یا اللہ ہمارے دلوں میں کفر وشرک اور فسق وفجور کی نفرت پیدا فرما تاکہ ہم ہر چھوٹے بڑے ظاہری اور باطنی گناہ اور بری باتوں سے علیحدہ رہنے کی توفیق عطا فرما۔ یا اللہ آپ کے دشمن ہمارے دشمن ہوں اور آپ کے دوست ہمارے دوست ہوں، یا اللہ اہل اسلام کو آپس میں اتحاد واتفاق اور دوستی عطا فرما، آمین یا رب العلمین

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت، شرط ایمان/ اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مراد

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معیار

قُلْ	کہ دیجئے	اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم
تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	اللہ سے محبت کرتے	فَاتَّبِعُوْنِيْ	تو میرا اتباع کرو
يُحْبِبْكُمُ	تم سے محبت کریگا	اللّٰهُ	اللہ
وَيَغْفِرْ لَكُمْ	اور تمہیں بخش دے گا۔	ذُنُوْبَكُمْ	گناہ تمہارے
وَاللّٰهُ	اور اللہ	غَفُوْرٌ	بہت بخشنے والا
رَّحِيْمٌ	نہایت رحم کرنے والا ہے۔		

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“ (صحیح بخاری) ارشاد ہوتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ، اے پیغمبر (علیہ السلام)! آپ کہہ دیجئے، اور اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو اور اس کے دعویدار ہو، تو اس کا ایک ہی معیار ہے، فَاتَّبِعُوْنِيْ میرا اتباع اختیار کرلو۔ گویا پہلی بات تو رسالت کے متعلق آ گئی کہ اللہ کی محبت نبی کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں۔ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اللہ تم سے محبت کریگا۔ اور اتباع رسول کی تکمیل اس وقت ہوگی۔ جب اس کو زندگی کے ہر شعبہ میں اختیار کیا جائیگا۔ صرف نماز پڑھنے سے اتباع کا حق ادا نہیں ہوگا۔ بلکہ تجارت، معاملات، اخلاق، لین دین، عبادات، سیاسیات، جہاد، جنگ، صلح، شادی، غمی غرضیکہ معاشرہ میں پیش آنے والے ہر معاملہ میں اتباع رسول کو لازم پکڑنا ہوگا۔ اب تو وقت یہاں تک آپہنچا ہے۔ کہ عبادات بھی اپنی خواہش کے مطابق ہونے لگی ہیں۔ رسول کے طریقے کی کوئی پروا نہیں کی جاتی، چہ جائیکہ دیگر معاملات میں سنت رسول کی پیروی کی جائے۔ فرمایا کہ اتباع رسول کا نتیجہ یہ ہوگا کہ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے اور پھر اللہ کی محبوبیت کا تقاضا یہ ہے۔ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط وہ تمہاری غلطیاں، لغزشیں اور گناہ معاف فرمادے گا۔ گناہ کی معافی کا قانون اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان کر دیا ہے۔ کہ خالی گناہ تو استغفار سے ہی معاف ہو جائے گا۔ سچے دل سے توبہ کرلی تو اللہ نے معاف فرما دیا۔ اگر فرائض میں کوتاہی ہوئی ہے۔ تو پہلے ان کو ادا کرو۔ پھر اللہ سے معافی مانگو، اللہ معاف کر دے گا۔ نماز رہ گئی ہے، روزہ قضا ہوگیا۔ پہلے انہیں ادا کرلو۔ اور اگر حقوق العباد میں کوتاہی کی ہے کسی کا حق غصب کیا ہے۔ تکلیف پہنچائی ہے تو پہلے اس کا حق ادا کرو یا اس سے معافی مانگ کر جان چھڑالو۔ اگر اس دنیا میں حقوق العباد ادا نہیں کر سکے، تو پھر قیامت کے دن اس کے بدلے میں اپنی نیکیاں نماز، روزہ، خیرات وغیرہ حقدار کو دینا ہوں گی اور اگر نیکیاں ختم ہوگئیں، تو حقدار کے گناہ حق دہندہ کے سر پر ڈالے جائیں گے۔ جس کا نتیجہ جہنم کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لہذا حقوق العباد کا فیصلہ اسی دنیا میں کر جاؤ۔ اور

اللہ سے معافی مانگو لو وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ ،اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ اپنے نبی کو بھیجا، کتاب نازل فرمائی، اور ہدایات کا سامان پیدا کیا۔ تاکہ انسان گناہ سے بچ جائیں۔ اور پھر جہنم سے بچ کر جنت میں داخل ہو جائیں۔ نبی کریم ﷺ سے محبت ایمان کی بنیاد اور تکمیل دین کی لازمی شرط ہے اس کا حتمی معیار یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات، آپ کی تعلیمات اور آپ کی سنت کو دنیا کی ہر چیز (اپنی جان، مال اور اہل وعیال) سے بڑھ کر محبوب رکھا جائے۔

اطاعتِ الٰہی سے مراد

قُلْ	کہ دیجئے	اَطِیْعُوا	تم اطاعت کرو	اللّٰہَ	اللہ کی
وَالرَّسُوْلَ	اور رسول کی	فَاِنْ	پھر اگر	تَوَلَّوْا	وہ پھر جائیں
فَاِنَّ	تو بیشک	اللّٰہَ	اللہ	لَا یُحِبُّ	نہیں دوست رکھتا
الْکٰفِرِیْنَ			کافروں کو (32)		

اس کے بعد فرمایا قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی تابعداری کرو، کیونکہ وہ خالق، مالک اور معبود برحق ہے اس کی اطاعت فرض مطلق ہے۔ اللہ کی اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نازل کردہ کتاب (قرآنِ مجید) کے احکامات کو من وعن تسلیم کیا جائے۔ اس کے بتائے ہوئے عقائد، عبادات، اخلاقی اصولوں اور حلال وحرام کی حدود پر عمل پیرا ہونا اللہ کی اطاعت ہے۔ وَالرَّسُوْلَ ج اور اس کے ساتھ رسول کی تابعداری کرو۔ کہ وہ خدا کی اطاعت تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ جب تک رسول کی اطاعت نہیں ہوگی۔ خدا کی اطاعت ممکن نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ "اَلرَّسُوْلَ" یعنی محمد ﷺ کی اطاعت کا مستقل حیثیت سے حکم دیا گیا ہے اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد "اَلرَّسُوْلَ" کی اطاعت سنت کی پیروی ہی سے ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی کی بنا پر کہہ دیتے ہیں کہ حدیث وہی حجت ہوگی جو قرآن کے مطابق ہو، حالانکہ قرآن نے متعدد مواقع پر حدیث کو مستقل دلیل اور شریعت کے ماخذ کی حیثیت دی ہے، لہٰذا قانون کا ماخذ قرآن وحدیث دونوں قرار

پائیں گے۔حدیث میں قرآن سے زائد حکم تو ہوسکتے ہیں مگر کوئی صحیح حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے،اگرکوئی شخص یہ سمجھتا ہےتو یہ اس کی عقل وفہم کا قصور ہے،یا اس کی نیت کا فتور۔

فرمایا: فَاِنْ تَوَلَّوْا ، اگرتم روگردانی کروگے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ تو اللہ تعالیٰ کفر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔جس طرح اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا فرض ہے اسی طرح نبی پر ایمان لانا بھی فرض ہے۔ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہوگا۔نبی پر ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے۔ کہ اس پر محض ایمان لایا جائے اوراعلیٰ درجہ ایمان کا یہ ہے۔کہ اس کے ساتھ محبت ہو۔اورمحبت کا تقاضا ہے کہ اتباع ہو۔اگر دعوائے محبت کے ساتھ اتباع نہیں تو دعویٰ جھوٹا ہے۔قرآنِ مجید میں اس حکم کے بعد اکثر یہ تنبیہ بھی آئی ہے کہ" پھراگر وہ منہ پھیریں تو بے شک اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ اوراس کے رسول ﷺ کے احکامات سے روگردانی اورانکار کفر اور گمراہی کی علامت ہے،جو انسان کو اللہ کی رحمت سے محروم کردیتی ہے۔

اطاعتِ رسول ﷺ سے مراد

رسول کی اطاعت سے مراد آپ ﷺ کی سنت،احادیث اورعملی نمونہ کی پیروی کرنا ہے۔ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا حکم ماننا درحقیقت اللہ ہی کا حکم ماننا ہے۔رسول کی حیثیت سے آپ ﷺ کی اطاعت الگ نہیں بلکہ اللہ کی اطاعت کے عین مطابق ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو سب سے جامع حکم صادر فرمایا ہے۔وہ ہے اس کی اطاعت اوراس کے رسول کی اطاعت۔اس میں ایمان اورتوحید بھی شامل ہے اور اس کی شاخیں یعنی ظاہری اورباطنی اقوال وافعال بھی بلکہ اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت میں اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے پرہیز بھی شامل ہے۔کیونکہ گناہ سے پرہیز اللہ کے حکم کی تعمیل ہے،یعنی اس کی اطاعت میں شامل ہے۔لہٰذا اللہ اوراس کے رسول کی فرماں برداری کرنے والے ہی کامیاب ہیں۔یعنی اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت وفرماں برداری ایک اکائی ہے،جن میں سے ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا،نہ رسول کی نافرمانی اوران

کے احکام کا انکار کر کے اللہ کی اطاعت کی جا سکتی ہے اور نہ اللہ کی نافرمانی کر کے رسول کی اطاعت، کیوں کہ اصل مقصود اللہ کی اطاعت ہے، رسول بھی منشائے ربانی اور حکم خداوندی ہی کا ترجمان ہوتا ہے، اس لئے اس کی اطاعت بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے اور اس کی نافرمانی بھی اللہ ہی کی نافرمانی۔ پھر تنبیہ کی گئی ہے کہ جو لوگ اس بات سے انکار کریں گے اللہ ہرگز ان کو پسند نہیں کرے گا اور نہ ہی ان سے محبت کرے گا۔ لہٰذا وہ دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ضرور ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ قرآن کی طرح حدیث نبوی بھی حجت ہے اور جو شخص قرآن مجید کو تسلیم کرتا ہو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ حدیث کے دلیل و حجت ہونے کا انکار کر جائے، پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی کا حکم فرمایا گیا ہے اور دوسری آیت میں اطاعت کا، ''اتباع'' افعال کی نقل کرنے کا نام ہے اور ''اطاعت'' جس بات کا حکم دیا جائے اس کی تعمیل کا، گویا پہلی آیت میں آپ ﷺ کے افعال یعنی فعلی احادیث کا حجت ہونا بیان کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں آپ ﷺ کے ارشادات یعنی قولی احادیث کا حجت ہونا۔ جس نے رسول کی اتباع نہ کی وہ اللہ سے محبت رکھنے والا نہیں۔ کیونکہ اللہ کی محبت کا تقاضا رسول ﷺ کی اتباع ہے۔ جب اتباع موجود نہیں، تو یہ محبت نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس صورت میں اگر وہ رسول سے محبت رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ جھوٹا ہے اور اگر محبت موجود بھی ہو تو اس کی شرط (اتباع) کے بغیر ایسی محبت بے کار ہے۔ جو شخص جس قدر حبیب خدا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی راہ چلتا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے۔ اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا اور کھرا ہے۔ اور جتنا اس دعوے میں سچا ہوگا، اتنا ہی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا۔

انسان کی برتری اور فوقیت کا بنیادی راز

اِنَّ	بیشک	اللّٰهَ	اللہ نے	اصْطَفٰٓى	چن لیا
اٰدَمَ	آدم کو	وَنُوْحًا	اور نوح کو	وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ	اور آلِ ابراہیم کو

وَاٰلَ عِمۡرٰنَ	اور آلِ عمران کو	عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ	جہانوں پر۔(33)

ارشاد باری تعالیٰ ہے اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۳۳ بیشک اللہ تعالیٰ نے پسند کیا منتخب کیا آدم (علیہ السلام) کو۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق تو بیشمار تھی ارض وسما، چاند، سورج، ستارے، شجر، حجر، فرشتے، جن سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ مگر اس کے علم محیط، حکمتِ بالغہ اور قدرت تامہ کے ساتھ جو مقام حضرت آدم (علیہ السلام) اور آپ کے توسط سے نسل انسانی کو حاصل ہونے والا تھا، وہ کسی اور مخلوق کے حصہ میں نہ تھا۔ انسان کی برتری اور فوقیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو منتخب کیا۔ اور نظام خلافت آپ کے سپرد فرمایا۔ یہ کام ملائکہ کے سپرد بھی نہیں کیا بلکہ نظرِ انتخاب حضرت آدم (علیہ السلام) پر پڑی۔ اللہ نے ان کو یہ فضیلت اور شرف عطا فرمایا۔ اور سب سے بڑی فضیلت اصطفیٰ بالنبوت ہے۔ (اصطفیٰ بالنبوت سے مراد "اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت اور رسالت کے لیے خالصتاً چنا جانا یا منتخب کیا جانا" ہے) یعنی آپ کو نبوت جیسے اعلیٰ منصب کے لیے منتخب فرمایا۔ انسانیت کے لیے سب سے بلند مقام نبوت ہی ہوسکتا ہے۔ جو کہ اللہ نے آدم (علیہ السلام) اور ان کی اولاد کو عطا فرمایا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ کہ سب سے پہلے نبی آدم (علیہ السلام) ہیں۔ اور سب سے آخر محمد رسول اللہ ﷺ ہیں ایک روایت کے مطابق کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار میں سے تین سو پندرہ رسول ہیں۔ باقی سب نبی ہیں۔

اس آیت میں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ رب العزت بہترین فیصلہ کرنے والا ہے اور وہ ہر بات کو بخوبی سننے والا اور حقیقت حال کو اچھی طرح جاننے والا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے بہترین بندوں میں سے ان بندوں کا انتخاب کیا کہ جو لوگوں کے حق میں بہترین بن سکتے تھے۔ لہٰذا سب سے پہلے دنیا تخلیق کی اور پھر حضرت آدم (علیہ السلام) کو تخلیق کیا جو کہ روحانی اور جسمانی خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ ان کو علم و حکمت عطا کیا جس کی وجہ سے ان کو سربلندی عطا کی اور فرشتوں سے ان کو سجدہ کروایا اور پھر حضرت آدم (علیہ السلام) کو نبوت کے لئے منتخب کرلیا۔ ان کے عرصہ دراز کے بعد نبوت حضرت شیث (علیہ السلام) اور حضرت نوح (علیہ السلام) کو ملی پھر

عرصہ دراز کے بعد نبوت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ملی ان کے بعد جس قدر نبی آئے وہ سب انہی کے دو بیٹوں حضرت اسحاق (علیہ السلام) اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی نسل سے ہی ہوئے۔کیونکہ حضرت مریم (علیہ السلام) کے باپ عمران حضرت ابراہیم کی نسل سے تھے اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) حضرت عمران کے نواسے تھے۔لہٰذا یہ ثابت ہوگیا کہ کوئی پیغمبر بھی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خاندان سے باہر نہیں ہے۔ان سب کا انتخاب اس عظیم اللہ جل شانہ کا ہے جو ہر بشر کے نفس کی خوبیوں سے پوری طرح باخبر ہے۔اس لئے اس کا انتخاب کسی صورت بھی غلط نہیں ہوسکتا۔

سَمِيعٌ عَلِيمٌ کا معنی ومفہوم

ذُرِّيَّةً	اولادیں	بَعْضُهَا	بعض ان کے	مِنْ بَعْضٍ	بعض کی		
وَاللّٰهُ	اور اللہ	سَمِيعٌ	خوب سننے والا	عَلِيمٌ	خوب جاننے والا ہے۔(34)		

فرمایا۔ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ؕ تمام انسان ایک دوسرے کی اولادیں۔جیسے نوح (علیہ السلام) حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد سے ہیں۔نیز حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ، حضرت نوح کی اولاد میں سے ہیں۔اور دونوں عمران حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں۔حضرت مریم، عمران کی بیٹی ہے۔اور عیسیٰ (علیہ السلام) مریم کے بیٹے ہیں۔چونکہ وہاں پر باپ نہیں ہے۔لہذا سلسلہ نسب ماں کی طرف سے چلتا ہے۔دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو، يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ، کہہ کر پکارا۔امام بخاری فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن بھی آپ کو اسی نام سے مخاطب کیا جائے گا جب کہ باقی مخلوق کی نسبت باپ کی طرف کی جائے گی۔جس قدر انبیاء و رسل ابراہیم (علیہ السلام) کے بعد آئے ان ہی کے دو صاحبزادوں اسحاق و اسماعیل کی نسل سے آئے۔چونکہ عموماً نسب کا سلسلہ باپ کی طرف سے چلتا ہے اور حضرت مسیح (علیہ السلام) بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لحاظ سے وہم ہوسکتا تھا کہ ان کو نسل ابراہیمی سے مستثنیٰ کرنا پڑے گا۔اس لئے حق تعالیٰ نے "آل عمران" اور ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ؕ فرما

کر متنبہ کر دیا کہ حضرت مسیح جب صرف ماں سے پیدا ہوئے تو ان کا سلسلہ نسب بھی ماں ہی کی طرف سے لیا جائے گا نہ کہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کی والدہ مریم صدیقہ کے باپ عمران کا سلسلہ آخر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر منتہی ہوتا ہے تو آل عمران، آل ابراہیم کی ایک شاخ ہوئی اور کوئی پیغمبر خاندان ابراہیمی سے باہر نہ ہوا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ " (اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے) اللہ تعالیٰ کی کامل قدرت، لامحدود علم اور ہمہ گیر نگرانی کو ظاہر کرتی ہے السَّمِيْعُ (خوب سننے والا): اس سے مراد یہ ہے کہ کائنات میں ہونے والی ہر آواز، چاہے وہ کتنی ہی پست یا پوشیدہ کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اسے براہِ راست سنتا ہے انسان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہوں، دل میں چھپے ہوئے خیالات ہوں یا کائنات کے کسی بھی کونے میں ہونے والی کوئی سرگوشی، اللہ سب کی یکساں سماعت رکھتا ہے. الْعَلِيْمُ (سب کچھ جاننے والا): اللہ تعالیٰ کا علم ہر حد سے بالاتر اور مکمل ہے وہ انسان کے کھلے (ظاہری اعمال)، چھپے (پوشیدہ ارادوں) اور سینوں کے رازوں سے مکمل طور پر باخبر ہے اسے ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں اور قطعی علم ہے۔

بچہ کی پیدائش کے بعد کے امور/ اسلام میں یتیموں کے حقوق اور ان کی اہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى ؕ

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ

اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

مُحَرَّرًا کا معنی اور اس کی مختصر تشریح

اِذْ	جب	قَالَتِ	کہا	امْرَاَتُ عِمْرٰنَ	عمران کی بیوی نے
رَبِّ	اے میرے رب!	اِنِّیْ	بیشک میں نے	نَذَرْتُ	نذرمانی ہے

لَكَ	تیرے لیے	مَا	اس (بچے) کی جو
فِیْ بَطْنِیْ	میرے پیٹ میں ہے	مُحَرَّرًا	آزاد کیا ہوا
فَتَقَبَّلْ	چنانچہ تو قبول کر	مِنِّیْ	مجھ سے (یہ)
اِنَّكَ اَنْتَ	یقیناً تو ہی ہے	السَّمِیْعُ	خوب سننے والا

الْعَلِيمُ	خوب جاننے والا۔

ارشاد ہوتا ہے: اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ ، جب عمران کی بیوی نے کہا رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا ۔ اے مولا کریم! میں نے تیرے لیے یہ نذر مانی ہے کہ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے، وہ میں نے محض تیری عبادت کے لیے آزاد کر دیا۔ مُحَرَّرًا کے بنیادی لغوی معنی 'آزاد کیا ہوا یا خالص کیا ہوا کے ہیں اردو اور عربی میں اس کا استعمال سیاق وسباق کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، کسی شے کو دنیاوی معاملات سے الگ کر کے خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبادت یا خدمتِ دین کے لیے وقف کر دینا، اس آیت میں یہ لفظ حضرت مریم (علیہا السلام) کی والدہ کی نذر (منت) کے حوالے سے آیا ہے، جب انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے ہونے والے بچے کو وقف کرنے کی دعا کی تھی۔ اس آیت میں "مُحَرَّرًا" کا مطلب ایک ایسا بچہ (یا انسان) ہے جسے دنیاوی اور خاندانی ذمہ داریوں سے بالکل آزاد کر دیا جائے، تاکہ وہ ہمہ وقت بیت المقدس کی خدمت اور خالصتاً اللہ کی عبادت میں مگن رہے، یعنی ہونے والے بچے کو خالص اللہ کی عبادت کے لیے مختص کر دیا جائیگا۔ کسی دنیوی کام میں نہیں لگایا جائیگا۔ اس بات کا تذکرہ بھی پہلے ہو چکا ہے۔ کہ تاریخ میں دو ایسے اشخاص کا تذکرہ آتا ہے۔ جن کے نام عمران ہیں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے والد کا نام بھی عمران ہے۔ اور حضرت مریم کے والد بھی عمران ہیں۔ دونوں نیک اور صالح آدمی تھے، مگر نبی نہیں تھے۔ اس مقام پر جس عمران کا تذکرہ ہے۔ وہ مریم کے والد ہیں۔ تفاسیر میں عمران کی بیوی کا نام "حَنَّة" مذکور ہے اور یہ کہ دمشق کے بیرونی حصے میں ان کی قبر ہے، مگر ان دونوں باتوں کی کوئی پختہ دلیل نہیں۔ امام ابن کثیر اور دوسرے مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے چڑیا کو دیکھا کہ اپنے بچے کو دانہ کھلا رہی ہے یہ دیکھ کر ان کے دل میں بھی اولاد کی خواہش پیدا ہوئی۔ تو اللہ تعالیٰ سے عجز و انکساری کے ساتھ دعا کی۔ جو اللہ نے قبول فرمائی۔ جب وہ اس کبرسنی میں حاملہ ہو گئیں تو انہوں نے شکرانے کے طور پر یہ منت مانی کہ وہ پیدا ہونے والے بچے کو اللہ کی عبادت کے لیے وقف کر دیں گی۔ ان کی دلی خواہش یہ تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ بیٹا عطا کرے، تو وہ اسے اللہ کی راہ میں آزاد

کر دیں گی۔ یہ نذر ماننے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اے اللہ! مجھ سے یہ نذرانہ قبول کر لے۔میں پیدا ہونے والے بیٹے کو تیری عبادت اور بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۵ ۔ بیشک تو سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔مقصد یہ تھا کہ میں اس مکمل یقین کے ساتھ دعا کر رہی ہوں کہ تو میری التجا کو سن رہا ہے۔اور میری اس نذر اور اس میں پائے جانے والے خلوص کو جانتا بھی ہے۔حضرت مریم کی والدہ نے جو منت مانی تھی وہ اس توقع سے مانی تھی کہ ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔کیونکہ اس عہد میں لڑکے تو اللہ کی عبادت کے لیے وقف کئے جاتے تھے۔مگر لڑکیوں کو وقف کرنے کا رواج نہ تھا۔مگر ہوا یہ کہ لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوئی تو انہیں اس بات پر افسوس ہونا ایک فطری امر تھا۔اس آیت میں محرر کا لفظ آیا ہے۔جس کا لغوی معنی آزاد کردہ ہے یعنی ایسا بچہ جسے والدین نے تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہو تا کہ وہ یکسو ہو کر اللہ کی عبادت کر سکے۔

نومولود کے لیے شرعی تقاضے

فَلَمَّا	پھر جب	وَضَعَتْهَا	اس نے اس کو جنم دیا	قَالَتْ	(تو) کہا
رَبِّ	اے میرے رب	اِنِّيْ	بیشک میں نے (تو)	وَضَعْتُهَآ	جنم دی
اُنْثٰى	لڑکی	وَاللّٰهُ	اور اللہ	اَعْلَمُ	خوب جانتا تھا
بِمَا	اُس کو جو	وَضَعَتْ	اس نے جنا تھا	وَلَيْسَ	اور نہیں تھا

الذَّكَرُ	وہ لڑکا	كَالْاُنْثٰى	مانند (اُس) لڑکی کے
وَاِنِّيْ	اور بیشک میں نے	سَمَّيْتُهَا	اس کا نام رکھا ہے
مَرْيَمَ	مریم	وَاِنِّيْٓ	اور بیشک میں
اُعِيْذُهَا بِكَ	اسے تیری پناہ میں دیتی ہوں	وَذُرِّيَّتَهَا	اور اس کی اولاد کو (بھی)

مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ	شیطان مردود سے۔(36)

فرمایا: فَلَمَّا وَضَعَتْهَا جب عمران کی بیوی نے جنا، تو وہ لڑکی تھی قَالَتْ ، کہنے لگی رَبِّ اِنِّيْ

وَضَعْتُهَآ أُنْثٰى ۚ اے پروردگار! میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۚ اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ اس نے جنا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں نے تو نذر مانی تھی کہ لڑکا ہوتا۔ تو اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی مگر لڑکی کو ایسے کام کے لیے مقرر کرنا مناسب نہیں۔ یہود میں دستور تھا کہ وہ اس طرح کے منت مانے ہوئے وقف شدہ بچوں کو بیت المقدس یا ہیکل سلیمانی میں چھوڑ جاتے اور انہیں ہیکل سلیمانی یا عبادت خانہ کے منتظمین جنہیں وہ اپنی زبان میں کاہن کہتے تھے، کے سپرد کر آتے تھے۔ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ اور لڑکا لڑکی کی طرح تو نہیں ہے۔ لڑکی وہ مشقت کا کام نہیں کر سکتی جو لڑکا کر سکتا ہے۔ بہرحال لڑکی جننے کے بعد انہوں نے کہا۔ وَاِنِّیْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔ مریم کا معنی بعض کے نزدیک عابدہ یعنی عبادت گزار ہے اور بعض کے نزدیک خادمہ ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ عمران حضرت مریم کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ اور ان کی بیوی ہی نومولود کی کفیل اور سرپرست تھی۔ لہذا بچی کا نام انہوں نے خود رکھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ ماں کو بھی بچے کا نام رکھنے کی اجازت ہے خصوصاً اس وقت جب کہ باپ موجود نہ ہو۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے دن ہی اس کا نام رکھ دیا جائے۔ تاہم ساتویں دن بال اتارنا، عقیقہ کرنا اور نام رکھنا بھی درست ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی کی ولادت ہوئی۔ اسی دن اس کو اٹھا کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضور ﷺ نے نومولود کو گڑھتی دی (گھٹی (یا گڑھتی) ایک روایتی اسلامی طریقہ ہے۔ اس کا مطلب ہے بچے کو پیدائش کے فوراً بعد پہلی غذا دینا۔ یہ غذا ماں کے دودھ سے پہلے دی جاتی ہے۔) اور عبداللہ نام بھی رکھا، خود حضور ﷺ کے ہاں ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے رات کو بچہ پیدا ہوا۔ صبح آپ ﷺ نے فرمایا کہ رات میرے ہاں لڑکا تولد ہوا ہے۔ اور اس کا نام میں نے اپنے جدامجد کے نام پر رکھا ہے۔ گویا بچے کا نام اس کے باپ نے رکھا۔ مگر حضرت مریم کا نام ان کی والدہ نے رکھا۔ کیونکہ باپ موجود نہیں تھا۔ بعض مفسرین نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ کہ باپ کی عدم موجودگی میں تو ماں سرپرست بن سکتی ہے۔ مگر اس کی موجودگی میں

نہیں بن سکتی۔نام رکھنے کے ساتھ ہی فرمایا۔ وَاِنِّیۡۤ اُعِیۡذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ﴿۳۶﴾ ،اے اللہ! میں اس بچی کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔تا کہ شیطان کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرے۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی پیدائش کے وقت شیطان اسے چھوتا ہے تو وہ چلا کر رونے لگتا ہے۔صرف مریم اور اس کے بیٹے (حضرت عیسیٰ) کو شیطان نے نہیں چھوا۔(بخاری، کتاب التفسیر، زیر آیت مذکورہ)اس حدیث سے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ دونوں کی فضیلت ثابت ہوئی۔اس آیت سے یہ مسائل معلوم ہوئے کہ بچے کی پیدائش پر اسے نہلانے کے بعد دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی جائے۔2۔کسی نیک فرد خواہ مرد ہو یا عورت کے منہ کی چبائی ہوئی کوئی چیز کھلائی جائے،تا کہ پہلے چیز جو اس بچے کے منہ میں جائے وہ کسی نیک فرد کا لعاب ہو۔3۔اچھا نام رکھا جائے۔4۔ساتویں دن بچے کے بال صاف کیے جائیں،استطاعت ہونے پر بچے کی طرف سے دو بکرے اور بچی کی طرف سے ایک بکرا عقیقہ کے طور پر ذبح کیا جائے اور بچے کے بالوں کے وزن کے برابر چاندی کی قیمت صدقہ کی جائے۔

معجزہ اور کرامت میں بنیادی فرق

فَتَقَبَّلَهَا	پھر قبول کیا اُسے	رَبُّهَا	اس کے رب نے
بِقَبُوۡلٍ	قبول کرنا	حَسَنٍ	اچھا
وَّاَنۡۢبَتَهَا	اور اس کی پرورش کی	نَبَاتًا حَسَنًا	پرورش اچھی
وَّكَفَّلَهَا	اور سپرد کیا اس کو	زَكَرِیَّا	زکریا (کے)

كُلَّمَا	جب بھی	دَخَلَ	داخل ہوتے	عَلَیۡهَا	اس پر
زَكَرِیَّا	زکریا	الۡمِحۡرَابَ	حجرے میں	وَجَدَ	(تو) پاتے
عِنۡدَهَا	اس کے پاس	رِزۡقًا	کھانے کی چیزیں	قَالَ	اُنہوں نے کہا

یٰمَرۡیَمُ	اے مریم	اَنّٰى	کہاں سے (آئی ہیں)

لَكِ	تیرے پاس	هٰذَا	یہ
قَالَتْ	اس نے کہا	هُوَ مِنْ عِنْدِ اللهِ	یہ اللہ کے پاس سے (آئی ہیں)
اِنَّ اللهَ	بیشک اللہ	يَرْزُقُ	رزق دیتا ہے
مَنْ يَّشَآءُ	جسے چاہے	بِغَيْرِ حِسَابٍ	بے حساب

فرمایا: فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ پس قبول کیا اس کو اس کے رب نے اچھی طرح قبول کرنا، یعنی لڑکے کی بجائے لڑکی پیدا ہوئی، تو اسے ہی عبادت کے لیے قبول فرمایا، وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا اور بڑھایا اس بچی کو اچھی طرح بڑھانا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی نشونما فرمائی۔ کہ حضرت مریم عام معمول سے بہت جلدی بڑی ہوگئی اور آپ کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ اس کی قراءت دو طرح سے آتی ہے یعنی كَفَّلَهَا کا معنی ہے کفیل بن گیا یا ضامن بن گیا، گویا زکریا (علیہ السلام) حضرت مریم کے کفیل بن گئے، بہر حال دونوں طرح مقصد ایک ہی ہے۔ بچی کا باپ موجود نہیں۔ ماں اس کو لے کر ہیکل مقدس میں آگئی۔ تو وہاں پر موجود ہر شخص نے خواہش ظاہر کی کہ اس بچی کو اپنی کفالت میں لے۔ حضرت سیّدنا ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہ سے روایت ہے کہ سَیِّدُ الْمُبَلِّغِیْن، رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ''مسلمانوں کے گھروں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے گھروں میں سے بدترین گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے۔'' پھر آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ایسے ہوں گے۔'' پھر شہادت اور درمیان کی انگلی کو جمع فرما دیا۔ حضرت سیّدنا ابو ہریرہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بارگاہِ رسالت میں دل کی سختی کی شکایت کی تو آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ''اگر تم اپنے دل کو نرم کرنا چاہتے ہو تو مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور یتیموں کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرو۔ بہر صورت اللہ تعالیٰ کو حضرت زکریا (علیہ السلام) کی کفالت منظور تھی۔ آپ نیک اور صالح آدمی تھے اور بیت المقدس

کے امام بھی تھے۔ادھر آپ حضرت مریم کے رشتہ دار بھی تھے۔یعنی ان کے خالو لگتے تھے۔آپ کے گھر میں حنہ کی بہن ایشاع بنت فاقوس تھی۔لہٰذا انہیں کفالت کا زیادہ حق تھا،فرمایا کُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ جب زکریا (علیہ السلام) حضرت مریم کے کمرے داخل ہوئے وَجَدَ عِنۡدَهَا رِزۡقًا ۚ تو اس کے پاس روزی پاتے۔حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس تو اس قدر وسائل نہ تھے۔مگر وہ دیکھتے کہ حضرت مریم کے پاس بے موسم پھل موجود ہیں۔ سردیوں کے پھل موسم گرما میں اور گرمیوں کے پھل موسم سرما میں حضرت مریم کے پاس مہیا ہوتے۔یہ حضرت مریم کی کرامت تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ اور قدرت تامہ سے انہیں روزی پہنچاتا تھا۔جو خرق عادت فعل انبیاء (علیہم السلام) کے ہاتھ پر ظاہر ہو،وہ معجزہ ہوتا ہے اور جو اولیاء کے ہاتھ پر ظاہر ہو وہ کرامت ہوتی ہے۔اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامت برحق ہے۔اس سے انکار کی مجال نہیں۔عقائد کی کتابوں میں نبی کے معجزے اور ولی کی کرامت کو عقیدے میں شامل کیا گیا ہے۔البتہ کسی ولی اللہ کے ساتھ جھوٹ موٹ کرامت منسوب کرنا غلط ہے۔اللہ تعالیٰ نے شیخ عبد القادر جیلانی کے ہاتھ پر بہت سی کرامات ظاہر فرمائیں۔ان کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں منقول ہے۔مگر کشتی کا بارہ سال والا قصہ جھوٹا اور من گھڑت ہے۔بعض دیگر بزرگانِ دین کی طرف بھی لوگوں نے بہت سی جھوٹی باتیں منسوب کر دی ہیں،جو درست نہیں۔بہر حال جب حضرت زکریا (علیہ السلام) نے حضرت مریم کے پاس پھل دیکھے تو فرمایا،قَالَ يٰمَرۡيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ اے مریم یہ کہاں سے آگئے قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ تو انہوں نے جواب دیا۔کہ یہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔یہ اس کی خاص عنایت تھی۔تاکہ حضرت مریم جلد از جلد سن بلوغت کو پہنچیں۔اور آگے نبوت کا سلسلہ جاری ہو۔مسند ابی یعلی کے حوالے سے امام ابن کثیر نے بیان کیا ہے۔کہ ایک موقع پر حضور ﷺ کئی روز سے فاقے سے تھے۔آپ اپنی بیٹی فاطمہ کے گھر تشریف لائے اور کھانے کے لیے کچھ طلب کیا۔جواب ملا،ابا جی! آج تو گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔چنانچہ حضور ﷺ واپس تشریف لے آئے۔ اتفاق سے تھوڑی ہی دیر بعد کسی پڑوسن نے دو چھوٹی چھوٹی روٹیاں اور گوشت کا ایک ٹکڑا حضرت

فاطمہ کو ہدیۃً بھیجا۔ وہ کھانا آپ نے بچوں کو کھلانے کی بجائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے رکھ لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغام بھیجا۔ آپ تشریف لائے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کپڑے کے نیچے رکھا ہوا کھانا نکال کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تھوڑی دیر پہلے تو گھر میں کوئی کھانا نہ تھا۔ اب کہاں سے آگیا۔ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وہی الفاظ کہے جو حضرت مریم نے کہے تھے هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ کہ یہ اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کھانے میں اس قدر برکت ڈال دی کہ وہ مختصر سا کھانا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود تناول فرمایا۔ حضرات حسنین اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے کھایا۔ آپ کی تمام ازواج مطہرات نے کھایا۔ پھر بھی بچ گیا تو پڑوسیوں میں تقسیم کیا گیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ فاطمہ! تمہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کا شبیہ بنایا ہے۔ انہوں نے بھی یہی کہا۔ کہ کھانا اللہ نے بھیجا ہے اور تو نے بھی یہی بات کی ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۷ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا کرتا ہے یہ اس کی خاص مہربانی ہے۔

اولاد کا حصول انسان کے اپنے بس میں نہیں

حضرت زکریا علیہ السلام کا حیرت واستعجاب

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ
سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝۳۸ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝۳۹ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ
قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝۴۰ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا
تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ
الْاِبْكَارِ ۝۴۱

نیک اولاد کے لیے قرآنی دعائیں

هُنَالِكَ	وہیں	دَعَا	دعا کی	زَكَرِيَّا	زکریا نے		
رَبَّهٗ	اپنے رب سے	قَالَ	کہا	رَبِّ	اے میرے رب		
هَبْ لِيْ	عطا کر مجھے	مِنْ لَّدُنْكَ	اپنے پاس سے (بغیر ظاہری اسباب کے)				
ذُرِّيَّةً	اولاد	طَيِّبَةً	پاکیزہ	اِنَّكَ	بیشک تو		

دُعاکا۔	الدُّعَآءِ	خوب سننے والا ہے	سَمِيْعُ

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۔: حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو چکے تھے اور ابھی تک بے اولاد تھے، بیوی بانجھ تھی، بظاہر انھیں اولاد کی کوئی امید نہ تھی، لیکن یہ دیکھ کر کہ کس طرح مریم [کو خرق عادت کے طور پر بے موسم کا رزق پہنچ رہا ہے، ان کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ بے موسم کا رزق پہنچانے والا مایوسی کے عالم میں اولاد بھی عطا فرما سکتا ہے، چنانچہ اسی جگہ اور اسی وقت اللہ تعالیٰ کے حضور نیک اولاد کی دعا کی۔ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ عرض کیا، اے پروردگا! مجھے اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد عطا کر۔ اور ساتھ یہ بھی کہا۔ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ بیشک تو دعا کو سننے والا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان فرمائی۔ کہ تو ہر چھوٹے بڑے کی دعا کو سنتا ہے۔ لہٰذا میری دعا کو بھی شرف قبولیت بخش اور اولاد عطا کر۔ جو پاکیزہ ہو جس کے اخلاق اعمال، عادات اور خصائل پاکیزہ ہوں۔ دوسرے مقام پر فرمایا، رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ، یعنی اے میرے رب! مجھے نیک اولاد عطا فرما۔ کیونکہ رشد و ہدایت کے مشن کو نیک اور پاکیزہ اولاد ہی آگے چلا سکتی ہے۔ بری اولاد تو الٹا وبال جان بن جاتی ہے۔ سورہ فرقان میں اللہ تعالیٰ نے متقی لوگوں کی دعا کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ یوں دعا مانگتے ہیں رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا اے ہمارے رب! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیز گاروں کا پیشوا بنا۔ جو نیک اولاد اچھے اخلاق کی حامل ہو۔ نیک کام کرتی ہو۔ وہ بلاشبہ والدین کی آنکھوں ٹھنڈک ہوتی ہے۔ اور جو اولاد ناہنجار ہو، کھیل تماشے میں مشغول رہے اور بری عادات کا شکار ہو۔ وہ والدین کے لیے ذہنی کوفت کا سبب بنے گی۔ اسی لیے زکریا (علیہ السلام) نے پاکیزہ اولاد کی دعا کی۔

اولاد کے لیے وظیفہ

حضرت زکریا علیہ الصلاۃ والسلام کی دعا قرآنِ کریم میں موجود ہے، اولاد کے واسطے میاں بیوی دونوں ہر فرض نماز کے بعد گیارہ مرتبہ یہ دعا پڑھ لیا کریں: "رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ

خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ ۔ بہرحال اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس جگہ رحمت الٰہی کا نزول ہوا ہو وہاں دعا مانگنی چاہیے جیسے جس مقام پر حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو غیب سے رزق ملتا تھا وہیں حضرت زکریا علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا مانگی۔ حضرت زکریا علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے پاکیزہ اولاد کی دعا مانگی۔ معلوم ہوا کہ صرف اولاد کی دعا نہیں کرنی چاہیے کہ اولاد تو زبردست آزمائش بھی بن سکتی ہے۔ لہٰذا پاکیزہ کردار وعمل والی اولاد کی دعا کرنی چاہیے تاکہ اس سے دنیا و آخرت کا سکھ ملے۔ دعا ایک ایسا مقدس اور آسان ذریعہ ہے جو اللہ نے بندے کو عطا کیا ہے کہ اپنی ہر بڑی، چھوٹی خواہش اور اپنی ہر پریشانی ومصیبت کو اللہ کے حضور پیش کر سکے اور یوں دنیا و دین کی نعمتیں، سکون قلب اور رضا الٰہی حاصل کر سکے۔ دعا مانگنا عبادت ہے اور اللہ کو بے حد پسند بھی ہے۔ شرط یہ ہے کہ دل سے دعا مانگی جائے۔ حدیث میں آتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان رکھتا ہے میں اس کے مطابق ہوتا ہوں اور جب وہ مجھے پکارتا ہے۔ تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں یعنی خواہشات اور تمناؤں کو پورا کرنے کا بہترین وسیلہ دعا ہے۔ جیسے حضرت زکریا (علیہ السلام) نے دل سے دعا کی اور وہ پوری ہوگئی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد دینا اور اولاد سے محروم رکھنا اللہ ہی کی قدرت میں ہے، کوئی انسان خواہ وہ مقام نبوت پر فائز ہو، دوسرے کو صاحب اولاد بنانا کیا معنی، اپنے آپ کے لئے بھی اولاد کی قدرت نہیں رکھتا، یہ بھی معلوم ہوا کہ بیوی بچوں کی خواہش رکھنا زہد وتقویٰ کے خلاف نہیں، اور حضرت زکریا علیہ السلام نے صالح اولاد کی دعاء فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ مومن کو اپنی اولاد کی آخرت اور دین داری کی طرف متوجہ رہنا چاہئے اور کبھی اس سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔

حضرت یحییٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے چار اوصاف

فَنَادَتْهُ	چنانچہ آواز دی اُسے	الْمَلٰٓئِكَةُ	فرشتوں نے
وَهُوَ	اور وہ	قَآئِمٌ	کھڑے ہوئے

يُّصَلِّيْ	نماز پڑھ رہے تھے	فِي الْمِحْرَابِ	حجرے میں
اَنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ	يُبَشِّرُكَ	تمہیں خوشخبری دیتا ہے
بِيَحْيٰى	یحییٰ کی	مُصَدِّقًا	وہ تصدیق کرنیوالا ہوگا
بِكَلِمَةٍ	ایک کلمے (عیسیٰ) کی	مِّنَ اللّٰهِ	جو اللہ کی طرف سے ہے
وَسَيِّدًا	اور سردار ہوگا	وَّحَصُوْرًا	اور نفس کو قابو میں رکھنے والا
وَّنَبِيًّا	اور نبی ہوگا	مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ	صالحین میں سے (39)

فرمایا: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ پس زکریا (علیہ السلام) کو فرشتوں نے آواز دی۔کس وقت؟ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ۔جب کہ وہ کمرے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یہاں پر محراب سے مراد مسجد کا محراب نہیں بلکہ کمرہ مراد ہے۔حضور ﷺ کے زمانہ تک بھی مساجد میں موجودہ محراب نہیں ہوا کرتے تھے، جہاں امام کھڑا ہوتا ہے بلکہ یہ طریقہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں رائج ہوا۔ بہرحال فرشتوں نے آپ کو آواز دے کر کہا کہ تمہاری دعا قبول ہوگئی ہے۔ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى اللہ تعالیٰ تجھے یحییٰ بیٹے کی بشارت دیتا ہے۔سورہ مریم میں یہ بیان اس طرح ہے۔يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى اے زکریا ہم تمہیں یحییٰ بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام بھی ہم نے خود یحییٰ تجویز کیا ہے لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا اور یہ ایسا نام ہے۔جو اس سے پہلے کسی اور کا نام نہیں ہے۔ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا جو اللہ کے ایک کلمے (عیسیٰ کی تصدیق کرنے والا اور سردار وہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے کلمہ یعنی حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کی تصدیق کرے گا۔حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کو كَلِمَةُ الله اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کلمہ ''کُن'' فرما کر بغیر باپ کے پیدا کیا۔حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام پر سب سے پہلے ایمان لانے اور ان کی تصدیق کرنے والے حضرت یحییٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام ہیں ۔وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۳۹ اور اپنے آپ پر بہت ضبط رکھنے والا اور نبی ہوگا نیک لوگوں میں سے۔وَ حَصُوْرًا (پاک دامن اور ضبط نفس والے): تمام مفسرین (جیسے حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ) اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں حَصُوْرًا سے مراد وہ شخص ہے

جو گناہوں، شہوات اور خواہشاتِ نفسانی سے مکمل طور پر پاک اور محفوظ ہو۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں فطری طور پر کوئی کمی تھی، بلکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ وہ گناہوں اور نفس کی برائیوں سے اس قدر دور رہتے تھے کہ گویا انہیں ان سے روک دیا گیا تھا۔جمہور علماء کے نزدیک اس سے مراد ”عصمت اور طہارت“ ہے، یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام دنیاوی لذتوں، گناہوں اور عورتوں کی رغبت سے اتنے بے نیاز اور دور تھے کہ ان کے قریب بھی نہ پھٹکے، بلکہ ان کی پوری زندگی عبادت اور اللہ کی اطاعت میں گزری۔ وَّ نَبِيًّا (نبی): یہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا اور عظیم ترین اعزاز ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے نبوت کے بلند ترین منصب پر فائز فرمایا۔ وہ نہ صرف ایک نیک انسان تھے، بلکہ وحی کے حامل اور شریعتِ الٰہی کے مبلغ بھی تھے۔ "مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ" (نیک لوگوں میں سے): اس جملے میں ان کی تواضع، کمالِ بندگی اور اللہ کے مقبول بندوں میں شامل ہونے کی گواہی دی گئی ہے۔تمام انبیاء وصالحین میں انہیں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی چار نمایاں خوبیاں بیان فرما رہا ہے: آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔آپ اپنی قوم کے سردار اور رہنما ہوں گے۔آپ گناہوں اور خواہشات سے دور رہنے والے اور اعلیٰ درجے کے پاک دامن (حَصُوْرًا) ہوں گے۔آپ اللہ کے برگزیدہ نبی اور صالحین میں سے ہوں گے۔

اسباب کا فقدان

قَالَ	اس نے کہا (یعنی زکریا نے کہا)	رَبِّ	اے میرے رب
اَنّٰى	کہاں (سے)	يَكُوْنُ	ہوگا
لِىْ	میرے لیے	غُلٰمٌ	لڑکا
وَّقَدْ بَلَغَنِىَ	جبکہ تحقیق مجھے پہنچ گیا	الْكِبَرُ	بڑھاپا
وَامْرَاَتِىْ	اور میری بیوی	عَاقِرٌ	بانجھ ہے
قَالَ	اس نے کہا (یعنی فرشتے نے کہا)	كَذٰلِكَ	اسی طرح

جو وہ چاہتا ہے۔	مَا يَشَآءُ	کرتا ہے	يَفْعَلُ	اللہ	اللّٰهُ

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ کہااے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، جب کہ مجھے تو بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟ دعا کی فوری قبولیت اور بظاہر ناممکن کام کی بشارت پر انھیں تعجب ہوا۔عجیب بات یہ ہے کہ خود ہی دعا کررہے ہیں اور پھر خود ہی انھیں اتنا تعجب ہو رہا ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ حضرت زکریا عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کو جب بیٹے کی بشارت دی گئی تو آپ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام نے تعجب کے طور پر عرض کیا: اے میرے رب! عَزَّ وَجَلَّ، میرے ہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا حالانکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہے؟ اللہ عَزَّ وَجَلَّ یوں ہی جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ سوال تعجب یا شک یا انکار کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ یہ نہایت حسین و بلیغ انداز سے طلب تصدیق ہے۔ان کے سامنے اس بشارت کے ظاہر ہونے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بیان کر کے حضرت زکریا نے چاہا کہ یہ تصریح کرالیں کہ ان رکاوٹوں کے باوجود یہ بشارت ظاہر ہونے کی شکل کیا ہوگی۔ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۔یہ بات یوں ہی ہوگی۔یعنی اللہ کا ارادہ یوں ہی ہے کہ یحییٰ کی ولادت بوڑھے باپ اور بانجھ ماں کے ہاں ہو۔اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی ہے۔اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔اللہ چاہے تو پتھر کے اندر سے پانی چشمے جاری ہوسکتے ہیں اور صحرا کے سینے سے حباب اٹھ سکتے ہیں۔(حباب کے لغوی معنی پانی کا بلبلا ہیں۔یہ وہ قطرہ ہوتا ہے جس میں ہوا بھرنے سے یہ پھول کر پانی کی سطح پر ابھر آتا ہے اور الٹے پیالے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔اس کی عمر بہت مختصر اور ناپائیدار ہوتی ہے۔اس سے مراد اللہ کی وہ بے پناہ طاقت ہے جو ناممکن حالات میں بھی زندگی یا پانی کے آثار پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔بہر حال حباب مشکل اور نامساعد حالات میں امید کی کرن یا اچانک کسی معجزے کے ظہور پذیر ہونے کے لیے بطور استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔) قرآن میں اس قسم کا سوال و جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت میں بھی منقول ہے،اس کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی ہے۔اس وقت حضرت زکریا عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کی عمر ایک سو بیس سال کی ہو چکی تھی اور آپ

عَلَيهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی زوجہ کی عمر اٹھانوے سال تھی۔ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ سوال سے مقصود یہ تھا کہ بیٹا کس طرح عطا ہوگا؟ آیا میری جوانی واپس لوٹائی جائے گی اور زوجہ کا بانجھ ہونا دور کیا جائے گا یا ہم دونوں اپنے حال پر رہیں گے؟ فرمایا گیا کہ بڑھاپے میں فرزند عطا کرنا اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں لہٰذا اس بڑھاپے کی حالت میں فرزند ملے گا۔

نشانی کی حکمت/ اہم روحانی پیغام

قَالَ	(زکریا نے) کہا	رَبِّ	اے میرے رب	اجْعَلْ	مقرر فرما دے
لِّيْٓ	میرے لیے	اٰيَةً	کوئی نشانی	قَالَ	(اللہ نے) فرمایا
اٰيَتُكَ	تیری نشانی	اَلَّا	(یہ ہے) کہ نہیں	تُكَلِّمَ	تو بات کر سکے گا
النَّاسَ	لوگوں سے	ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ	تین دن	اِلَّا	مگر
رَمْزًا	اشارے سے	وَاذْكُرْ	اور تو یاد کر	رَّبَّكَ	اپنے رب کو
كَثِيْرًا	بہت زیادہ	وَّسَبِّحْ	اور تسبیح کر		
بِالْعَشِيِّ	شام	وَالْاِبْكَارِ	اور صبح۔(41)		

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً کہا اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی بنا دے؟ حضرت زکریا علیہ السلام کا تعجب اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نشانی کی درخواست کردی، قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہیں کرے گا مگر کچھ اشارے سے۔ یعنی اس کی علامت یہ ہوگی کہ آپ ذکر و تسبیح پر تو قادر رہیں گے؛ لیکن تین دنوں لوگوں سے بات چیت کرنے کی قدرت باقی نہیں رہے گی، بائبل کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی سرزنش تھی، (لوقا:۱:۲۰-۲۲) لیکن قرآن کے لب و لہجہ سے ظاہر ہے کہ یہ بہ طور سرزنش اور عذاب کے نہ تھا؛ بلکہ محض ایک علامت اور نشانی کے طور پر یہ کیفیت طاری ہوئی تھی، قرآن مجید نے اسی طرح

جا بجا اُس غبار کو دھونے کی کوشش کی ہے، جو یہودیوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی پاک زندگی پر ڈال دیا تھا، اشارہ سے گفتگو' سے یہ فقہی مسئلہ بھی نکل آیا کہ اشارہ بھی کلام کے قائم مقام ہے، بعض صورتوں میں اشارہ مطلقاً بولنے کے حکم میں ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں بہ وقت ضرورت، البتہ حنفیہ کے نزدیک حدود یعنی شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں میں صرف اشارہ سے اقرار کرنا معتبر نہیں۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کرو۔ اس سے مراد ہر وقت، ہر حال میں اور کثرت کے ساتھ اللہ کی یاد، اس کا شکر ادا کرنا اور اس کی نعمتوں کا اعتراف کرنا ہے۔ ذکرِ الٰہی دل کو سکون اور اطمینان بخشتا ہے۔ وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾ اور شام اور صبح تسبیح کر۔ بِالْعَشِيِّ دن کے آخری حصے (شام) کو کہتے ہیں اور الْاِبْكَارِ صبح کے ابتدائی وقت کو کہا جاتا ہے۔ ان دو اوقات کا انتخاب اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ دن اور رات کے ملنے کے اوقات ہیں، جن میں انسان قدرتی طور پر سکون اور یکسوئی محسوس کرتا ہے۔ نماز اور عبادت کی اہمیت: اکثر مفسرین نے تسبیح سے مراد نمازیں (جیسے نمازِ فجر اور نمازِ عصر) بھی لی ہیں، کیونکہ نماز اللہ کی پاکی اور اس کی عظمت بیان کرنے کا سب سے کامل ذریعہ ہے۔ یہ آیت ہمیں بھی درس دیتی ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو معمول بنائیں تاکہ زندگی میں روحانی پاکیزگی اور سکون برقرار رہے۔ اور اس آیت سے ہمیں یہ درس بھی ملتا ہے کہ جب انسان کو کوئی عظیم خوشخبری یا معجزہ ملتا ہے، تو اسے زبان سے بول کر ضائع کرنے کے بجائے اللہ کے ذکر، شکر، اور تسبیح میں مشغول رہنا چاہیے۔ یا اللہ ہم کو بھی اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیں، اور شیطان کے ہر شر سے ہماری اور ہماری آنے والی نسلوں کی حفاظت فرمائیں، یا اللہ کریم ہم کو مقبولین اولیاء وصلحاء کی محبت اور اُن سے تعلق نصیب فرما، اور اپنے نیک بندوں سے تعلقات کے برکات وثمرات ہم کو دنیا آخرت میں میں نصیب فرما، یَا وَهَّابُ، هَبْ لِي مِنْ نِعْمَةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ۔ آمین یارب العٰلمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خواتین عالم میں پانچ خواتین کی خصوصی فضیلت/
کیاانبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے پاس علم غیب تھا؟

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ
اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ
يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

نیکی کے چار مراتب

وَاِذْ	اور (یاد کر) جب	قَالَتِ	کہا	الْمَلٰٓئِكَةُ	فرشتوں نے
يٰمَرْيَمُ	اے مریم!	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ نے	اصْطَفٰىكِ	تجھے چن لیا ہے
وَطَهَّرَكِ	اور تجھے کیا ہے	وَاصْطَفٰىكِ	اور تجھے برگزیدہ کیا ہے		
عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ	(دنیا) جہان کی عورتوں پر۔(42)				

ارشاد ہوتا ہے وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اور جب فرشتوں نے کہا، اے مریم! یہ ظاہر ہے کہ حضرت مریم نبی نہیں ہیں۔ بلکہ غیر نبی ہیں۔ تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فرشتوں کا غیر انبیاء

علیہم السلام سے کلام جائز ہے۔حضرات انبیاء علیہم السلام کے پاس تو فرشتے ہمیشہ وحی لاتے رہے ہیں اوران سے کلام کرتے ہیں۔مگرغیر نبی سے فرشتوں کے کلام کی کیا حیثیت ہے اس سلسلے میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا غیر نبی سے کلام ممنوع نہیں ہے۔البتہ وحی صرف نبیوں پر ہی نازل ہوتی ہے۔یہ اللہ کی طرف سے احکام اور شریعت ہوتی ہے۔جسے آگے لوگوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے اس لیے وحی صرف انبیاء علیہم السلام تک محدود ہوتی ہے۔البتہ فرشتوں کا عام لوگوں کے ساتھ کلام روا ہے۔اللہ تعالیٰ نے نبوت کا منصب عورتوں کو عطا نہیں فرمایا البتہ نبی کے بعد صدیقیت کا درجہ بعض عورتوں کو عطا فرمایا ہے۔چنانچہ قرآن پاک میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی والدہ حضرت مریم کے متعلق صراحتا موجود ہے۔ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ۔ان کی ماں صدیقہ تھیں۔اللہ تعالیٰ نے نیکی کے چار مراتب بیان فرمائے ہیں۔سب سے پہلے نبی، پھر صدیق، پھر شہید اور پھر صالحین نبی کے بعد صدیق کا درجہ ہے۔اور حضرت مریم کے لیے یہ اعزاز قرآن پاک سے ثابت ہے۔یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان مناقب کا تذکرہ فرمایا۔جو فرشتوں نے حضرت مریم سے بیان کیے۔فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ ،بیشک اللہ تعالیٰ نے تجھ کو پسند فرمایا ہ،یا منتخب فرمایا ہے یا برگزیدہ بنایا ہے۔آپ کی پہلی برگزیدگی تو یہ تھی کہ آپ کی والدہ کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔آپ کو عبادت الٰہی اور بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کیا گیا۔چنانچہ بیت المقدس میں ہی آپ کی رہائش کا بندوبست ہوا۔اور وہیں آپ بچپن میں مصروف عبادت رہیں۔پھر فرمایا وَطَهَّرَكِ اور آپ کو پاکیزہ بنایا۔پاک اور صاف بنایا۔اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی طہارت عطا فرمائی۔حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں۔کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلے دن سے ہی منتخب کرلیا تھا۔آپ کو نیکی اور ایمان کے ساتھ پاک بنایا۔کیونکہ انسان کو ایمان اور نیکی کے ساتھ طہارت حاصل ہوتی ہے، پھر اچھے اخلاق وعادات اور اچھے اعمال طہارت کا ذریعہ ہیں۔برخلاف اس کے برے اعمال، برے اخلاق، کفر اور شرک نجاست اور گندگی کا سبب ہیں۔تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو ان تمام بری خصلتوں سے پاک فرمایا۔اس پر ہمہ تن عبادت میں

مصروفیت مزید باطنی طہارت کی دلیل ہے۔ہماری شریعت میں بھی ہر مومن مسلمان مرد اور عورت کے لیے طہارت ضروری ہے۔ یہ طہارت عقیدے اور اعمال یعنی ظاہر و باطن ہر طرح سے ہونی چاہئے۔فرمایا وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ فرشتوں نے حضرت مریم کو یہ بھی خوشخبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جہاں بھر کی عورتوں پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے۔ پہلے اصْطَفٰى سے مراد بچپن کی فضیلت تھی۔اب اس دوسرے اصْطَفٰى سے مراد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بلا واسطہ باپ والدہ بننے کا شرف ہے دوسری عورتوں پر کہ بغیر لمس بشر کے آپ کے بطن سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جیسے جلیل القدر اور صاحب کتاب پیغمبر پیدا ہوئے۔ یہ امتیاز دنیا میں کسی اور عورت کو حاصل نہیں۔یعنی حضرت مریم علیہا السلام کے عہد میں وہ اللہ کی طرف سے سب سے منتخب خاتون تھیں بہ حیثیت مجموعی خواتین عالم میں پانچ خواتین کی خصوصی فضیلت احادیث میں منقول ہے، دو کا تعلق پہلی اُمتوں سے ہے، ایک حضرت مریم علیہا السلام، دوسری فرعون کی بیوی حضرت آسیہ، اور تین کا تعلق اس اُمت سے ہے، حضرت فاطمہ، حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن۔ان پانچوں میں سب سے افضل کون ہیں؟ اس سلسلہ میں اہل علم کا اختلاف ہے؛ لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ پانچوں خواتین تمام عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں۔

قنوت کا معنی و مفہوم

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ	اے مریم! تو فرمانبرداری کر	لِرَبِّكِ	اپنے رب کی
وَاسْجُدِىْ	اور تو سجدہ کر	وَارْكَعِىْ	اور رکوع کر
مَعَ	ساتھ	الرّٰكِعِيْنَ	رکوع کرنے والوں کو۔(43)

فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے فرمایا يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اے مریم! اپنے رب کی فرماں بردار بن اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔قنوت" کا اصل مفہوم کسی کی مکمل اطاعت اور عاجزی کو اختیار کرنا ہے۔دوام اور استقامت: اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اپنے رب کی اطاعت پر ہمیشہ ثابت قدم اور قائم رہو۔اور سجدہ کا

ذکر پہلے ہے اور رکوع کا بعد میں ہے اس کی توجیہہ مفسرین کرام خصوصا امام بیضاوی یوں فرماتے ہیں کہ جن دو چیزوں کو حرف و کے ساتھ اکٹھا بیان کر دیا جاتا ہے ان میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھی جاتی ہے۔اس لیے سجدے اور رکوع کے آگے پیچھے آجانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔تاہم نماز پڑھتے وقت پہلے رکوع ہی کیا جائے گا۔اور اسی طریقے پر عمل کیا جائے گا۔جو حضور ﷺ کا طریقہ ہے۔امام بیضاوی یہ بھی فرماتے ہیں کہ وَاسۡجُدِیۡ سے مراد مکمل نماز پڑھنا ہے۔چونکہ سجدہ نماز کا ایک اہم رکن ہے۔اس لیے صرف اس کا ذکر کر کے مراد نماز لیا گیا ہے۔بعض اوقات صرف تسبیح کہہ کر مراد پوری نماز لی جاتی ہے۔بہر حال امام صاحب فرماتے ہیں۔کہ سجدہ سے مراد یہاں پر نماز ہے۔اور رکوع سے مراد خشوع وخضوع ہے۔گویا عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ آپ کے مطابق پورے جملے کا مفہوم یہ ہوگا۔کہ نماز نہایت خشوع وخضوع اور عاجزی کے ساتھ ادا کرو۔

قرعہ اندازی کی شرعی حیثیت

ذٰلِكَ	یہ	مِنۡ اَنۡۢبَآءِ	کچھ خبریں ہیں
الۡغَيۡبِ	غیب کی	نُوۡحِيۡهِ	ہم وحی کرتے ہیں انہیں
اِلَيۡكَ	آپ کی طرف	وَمَا كُنۡتَ	اور نہیں تھے آپ
لَدَيۡهِمۡ	ان کے پاس	اِذۡ	جب
يُلۡقُوۡنَ	وہ ڈال رہے تھے	اَقۡلَامَهُمۡ	اپنے قلم (کہ)
اَيُّهُمۡ	اُن میں سے کون	يَكۡفُلُ	کفالت کرے
مَرۡيَمَ	مریم کی	وَمَا	اور نہیں
كُنۡتَ	تھے آپ	لَدَيۡهِمۡ	ان کے پاس
اِذۡ	جب (کہ)	يَخۡتَصِمُوۡنَ	وہ جھگڑ رہے تھے۔(44)

حضرت مریم کے تذکرہ کے بعد اب حضور خاتم المرسلین کی نبوت کی صداقت کا بیان ہے۔تاہم درمیان میں حضور ﷺ کے تذکرہ کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ آپ ﷺ کی نبوت سے متعلق بعض

شکوک وشبہات میں مبتلا تھے۔جن کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔فرمایا: ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ یہ واقعہ جو ہم نے بیان کیا ہے،غیب کی خبروں میں سے ہے نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ ؕ جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔یعنی آپ کو اس واقعہ کا نہ علم تھا۔اور نہ آپ جانتے تھے۔اور آپ غیب دان بھی نہیں ہیں۔کیونکہ علم غیب خاصہ خداوندی ہے۔اس کے علاوہ کوئی غیب نہیں جانتا۔یعنی ایسے واقعات صدیوں پہلے گزر چکے ہیں۔انہیں بالکل ٹھیک طور پر اپنے مخالفوں کو بتلا دینا آپ ﷺ کا معجزہ اور آپ کی نبوت پر واضح دلیل ہے۔کیونکہ آپ نے نہ تو تورات پڑھی تھی نہ انجیل اور نہ ہی کوئی تاریخی کتاب۔عمر کا اکثر حصہ مکہ مکرمہ میں گزرا جہاں کوئی ذی علم تھا ہی نہیں کہ آپ ﷺ اس سے سن کر دوسروں کو بتلا سکتے،نہ آپ ﷺ کا کوئی استاد تھا،نہ کسی کے سامنے آپ ﷺ نے زانوئے تلمذ تہ کئے تھے۔پھر ایسے واقعات کو علمائے اہل کتاب کے سامنے صحیح صحیح بیان کر دینا آپ کے منجانب اللہ سچا رسول ہونے پر بڑی قوی دلیل ہے۔پھر بھی جو لوگ آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں تو اس کی وجہ محض بغض وعناد اور دوسرے مفادات ہیں اور کچھ نہیں۔

اور جب حضرت مریم کا یہ واقعہ پیش آیا وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ آپ ﷺ ان کے پاس بھی نہیں تھے۔جو اس واقعہ کو ذاتی طور پر مانتے ہوں۔اور یہ اس وقت کی بات ہے۔اِذۡ يُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ جب کہ وہ لوگ اپنی قلمیں ڈال رہے تھے۔یعنی اس بات میں قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ اَيُّهُمۡ يَكۡفُلُ مَرۡيَمَ حضرت مریم کی کفالت کون کرے۔یہ اس وقت ہوا جب ان کی والدہ نے بتایا کہ انہوں نے نذر مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ بچہ عطا کرے گا،تو وہ اسے بیت المقدس کی خدمت اور اللہ کی عبادت کے لیے وقف کر دیں گی۔چونکہ عمران فوت ہو چکے ہیں۔اس لیے بیت المقدس کے سارے زعما نے حضرت مریم کی کفالت اپنے ذمے لینے کی خواہش ظاہر کی۔وہ سمجھتے تھے کہ یہ بڑی بابرکت بچی ہے۔جسے اس کی ماں نے خدمت دین کے لیے وقف کر رکھا ہے،جب ان لوگوں کے درمیان کفالت کے مسئلہ پر جھگڑا پیدا ہوا۔تو انہوں نے اس کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کرنے پر اتفاق کر لیا۔قرعہ اندازی کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔کہ ہر خواہش مند نے اپنی اپنی وہ قلمیں نہر میں

ڈال دیں جن سے وہ تورات لکھا کرتے تھے۔حضرت مریم کے خالو حضرت زکریا (علیہ السلام) بھی قرعہ ڈالنے والوں میں شامل تھے۔چنانچہ جب قلمیں پانی کے بہاؤ کی طرف ڈالی گئیں،تو سب کے قلم بہاؤ کی طرف بہہ نکلے۔سوائے حضرت زکریا (علیہ السلام) کے قلم کے،جو بہاؤ کی الٹی طرف چل پڑا۔چنانچہ قرعہ کا فیصلہ آپ کے حق میں ہوگیا۔اور اس طرح حضرت مریم ان کی کفالت میں چلی گئیں۔ہماری شریعت میں بھی قرعہ اندازی ایسے حقوق کے سلسلے میں جائز ہے۔جو دو فریقوں کی اپنی رائے کے سپرد ہوں۔شریعت نے جو خود حقوق متعین کر دیے ہیں۔ان میں قرعہ اندازی درست نہ ہوگی۔مثلاً کوئی جائیداد بعض آدمیوں کے درمیان مشترک ہے۔وہ اس بات پر قرعہ اندازی نہیں کر سکتے۔کہ جس کے نام کا قرعہ ہوگا۔وہ ساری جائیداد لے لے گا۔یہ تو قمار یا سود کی قسم ہے۔اس طرح ایک دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے۔ہاں ایسے معاملات میں قرعہ اندازی اس طور پر جائز ہے کہ کوئی جائیداد برابر برابر تقسیم کے بعد شمالی جنوبی یا شرقی غربی حصے کا معاملہ ہو کہ دونوں حصوں میں سے کون سا حصہ ایک حصہ دار لے گا۔اور کونسا دوسرا حصہ دار وصول کرے گا۔اس میں راہنما اصول یہ ہے کہ قرعہ اندازی اور اس طرح کے امور میں جائز ہے جن میں بغیر قرعہ اندازی کے بھی معاملہ کا فیصلہ ہو سکے۔جیسے کوئی معتبر آدمی یا حاکم وقت متنازعہ حصص کو تقسیم کر دے۔

قرعہ اندازی کی بعض مثالیں حضور ﷺ کے زمانہ پاک میں بھی ملتی ہیں فتح خیبر کے بعد یہودی اناج جمع کرتے تھے۔تو حضرت عبداللہ بن رواحہ اس کو دو برابر ڈھیروں میں تقسیم کر کے ان کو اختیار دیتے تھے کہ جونسا چاہو اٹھا لو،خود حضور ﷺ سفر پر جاتے وقت اپنی ازواج مطہرات میں قرعہ ڈال لیتے تھے۔کہ کسے ساتھ لے جائیں۔اگرچہ حضور ﷺ کو عام اجازت تھی کہ جس زوجہ مطہرہ کو چاہیں اپنی رفاقت میں ساتھ لے جائیں۔مگر آپ ﷺ ان کی تالیف قلوب کے لیے قرعہ ڈال لیتے تھے۔چنانچہ بعض اوقات آپ کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہوتی تھیں،بعض دفعہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا رفیقہ سفر ہوتیں اور بعض اوقات کوئی دوسری بیوی۔تو بہرحال ایسے جائز امور میں قرعہ اندازی روا ہے جن میں اس کے بغیر بھی فیصلہ ہو سکے۔امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر نسب

میں کوئی تنازعہ پیش آجائے تو قرعہ اندازی نہیں ہوسکتی۔مثلاً نومولود کے متعلق فیصلہ مطلوب ہو کہ یہ کس کا بچہ ہے تو اس کا فیصلہ قرعہ اندازی سے نہیں ہوسکتا۔حضرت یونس (علیہ السلام) بھی جب کشتی میں سفر کر رہے تھے۔تو وہاں بھی قرعہ ڈالا گیا۔اگرچہ انہوں نے خود ہی اقرار کیا کہ غلطی واقعی مجھ ہی سے ہوئی ہے۔اس کے باوجود قرعہ ڈالا گیا۔تو پھسلنے والوں میں وہی ثابت ہوئے۔خلاصہ یہ ہوا کہ اگر قرعہ اندازی بغیر کسی اضافی شرط کے،غیر مشروط انعامات،یا مساوی حقوق والے لوگوں میں حق یا باری کا تعین کرنے (جیسے سفر پر جانے یا ملازمت کی الاٹمنٹ) کے لیے کی جائے،تو یہ جائز اور سنت سے ثابت ہے۔اگر قرعہ اندازی میں شرکت کے لیے لازمی رقم جمع کروانی پڑے،اور ناکام رہنے والوں کی جمع شدہ رقم ضبط ہو جائے یا دوسروں کو چلی جائے تو یہ صریحاً جوا (قمار) ہے،جو حرام ہے:
ایسے انعامی بانڈز یا کمیٹیاں جن میں قرعہ اندازی کے ذریعے نام نکلنے پر اضافی رقم یا فائدہ دیا جائے، کی شرعی حیثیت مختلف فقہی مکاتب فکر میں اکثر علمائے کرام اسے سود یا قمار کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور علم غیب

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب،سرورِ کونین سیدنا و مولانا حضرت محمد ﷺ کو تمام جہانوں سے بڑھ کر علم عطا فرمایا،تمام کائنات مل کر بھی رسول اللہ ﷺ کے علم کا تصور نہیں کر سکتی،اسی طرح ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے اتنا وسیع علم عطا فرمایا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ تمام مخلوقات مل کر اس مقام تک نہیں پہنچ سکتیں،اور پھر رسول اللہ ﷺ کو تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر فضیلت بخشی لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے "علم" (اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت) میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں ہے،جو کسی کا عطا کیا ہوا نہیں ہے،جو اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ ہمیشہ سے اور ہمیشہ ہمیشہ تک ہر چیز کے بارے میں حاصل ہے،اس علم کے حصول میں کسی بھی قسم کا واسطہ نہیں ہے،جس کی خبر اللہ تعالیٰ کو کسی نے نہیں دی۔ شریعت کے عرف میں "علمِ غیب" سے یہی مراد ہوتا ہے اور اُس پر غیب کا اطلاق بندوں کی نسبت سے ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی علم جو بلا واسطہ کسی کے بتائے بغیر ہمیشہ سے ہمیشہ تک کے لیے حاصل ہے،اس میں کوئی بھی شریک نہیں ہوسکتا۔اس حوالے سے علمائے کرام کا

متفقہ مؤقف ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو غیب کا جو بھی علم حاصل ہوتا ہے، وہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ اللہ کی عطا، وحی اور غیبی خبروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ہی عالم الغیب ہے اور وہی اپنے رسولوں کو بعض غیبی امور پر مطلع فرماتا ہے۔ اس آیت سے پانچ مسئلے واضح طور پر ثابت ہوئے، پہلا یہ کہ رسول اللہ ﷺ غیب نہیں جانتے تھے، ورنہ انھیں غیب کی یہ خبریں وحی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہے اور جتنا چاہے علم عطا کرتا ہے اور پھر انبیاء (علیہم السلام) کو زیادہ علم عطا کرتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے امت تک پہنچانا ہوتا ہے۔ آخر میں حضور نبی کریم ﷺ کو سب نبیوں سے زیادہ علم عطا کیا۔ مگر یہ علم غیب نہیں بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو بذریعہ وحی معلوم ہوئیں۔ دوسرا یہ کہ رسول اللہ ﷺ ہر جگہ حاضر وناظر نہیں ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھا۔ تیسرا یہ کہ اولیاء اور دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی غیب دان نہیں، ورنہ بیت المقدس کے خدام اور وقت کے پیغمبر زکریا علیہ السلام کو قرعہ ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ چوتھا یہ کہ جب چیز ایک ہو اور اس کے حق دار کئی ہوں تو اس وقت قرعہ کے ذریعے سے فیصلہ شریعت کا فیصلہ ہے۔ امام بخاری نے "کِتَاب الشَّهَادَاتِ" میں باب باندھا ہے: "بَابُ الْقُرْعَةِ فِي الْمُشْكِلَاتِ" "مشکل معاملات میں قرعہ اندازی کا بیان" اور اس میں کئی احادیث لائے ہیں۔ بعض لوگوں نے قرعہ کو جوا قرار دیا ہے، یہ ان کی غلطی ہے۔ ہاں، اگر اس مقصد کے لیے قرعہ ڈالا جائے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں، تو یہ قرعہ نہیں بلکہ فال نکالنا ہے جو حرام ہے۔ پانچواں یہ کہ رسول اللہ ﷺ جو اس واقعہ کے وقت نہ موجود تھے، نہ اسے جانتے تھے، آپ کا وحی الٰہی سے اس واقعہ کو بیان کرنا آپ کے رسول برحق ہونے کی دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفات/ کن بچوں نے دودھ پینے کی حالت میں بات کی ہے؟

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ ۖ اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی
ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْہًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ﴿۴۵﴾ وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی
الْمَھْدِ وَکَھْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ
بَشَرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ
فَیَکُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَیُعَلِّمُہُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَالتَّوْرٰىۃَ وَالْاِنْجِیْلَ ﴿۴۸﴾

حضرت مسیح علیہ السلام سے مراد

اِذْ قَالَتِ	جب کہا	الْمَلٰٓئِکَۃُ	فرشتوں نے	یٰمَرْیَمُ	اے مریم!
اِنَّ اللّٰہَ	بیشک اللہ	یُبَشِّرُکِ	آپ کو خوشخبری دیتا ہے	بِکَلِمَۃٍ	ایک کلمے کی
مِّنْہُ	اپنی طرف سے	اسْمُہُ	اس کا نام ہوگا	الْمَسِیْحُ	مسیح

عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ	عیسیٰ ابن مریم	وَجِیْہًا	بڑے مرتبے والا
فِی الدُّنْیَا	دنیا میں	وَالْاٰخِرَۃِ	اور آخرت (میں)

وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ	اور (اللہ کے) مقربین سے (ہوگا) (45)

حضرت مریم کی پرورش اللہ تعالیٰ نے خاص طریقہ سے فرمائی اور وہ جلدی جلدی بڑی ہونے لگیں۔ پھر جب وہ سن بلوغت کو پہنچ گئیں تو فرشتوں نے آکر آپ کو بشارت دی۔ ارشاد ہوتا ہے اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ، جب فرشتوں نے آکر مریم سے کہا یٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ ، اے مریم! بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں بشارت دیتا ہے بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ بشارت اس خبر کو کہا جاتا ہے۔ جس میں خوشی ہو۔ خبر سن کر سرور حاصل ہو۔ چوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کسی باپ کے واسطہ کے بغیر محض حکم الٰہی سے پیدا ہوئے تھے، اس لئے آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا اور اس کا ترجمہ 'فرمان' سے کیا گیا ہے، یعنی یوں تو ہر شخص فرمانِ الٰہی سے پیدا ہوتا ہے؛ لیکن ان میں والدین کا واسطہ بھی ہوتا ہے، مگر حضرت عیسیٰ براہ راست اور بلا واسطہ فرمانِ الٰہی سے پیدا ہوئے۔ اور حضرت مسیح سے مراد عیسیٰ بن مریم ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی نے جو اپنے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے، عیسیٰ بن مریم (مریم کے بیٹے عیسیٰ) کی صراحت اس دعویٰ کی کھلی ہوئی تردید ہے کیوں کہ مرزا ملعون کی والدہ کا نام چراغ بی بی تھا نہ کہ مریم۔ فرمایا اے مریم! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے کلمے کی خوشخبری دیتا ہے۔ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ لفظ مسیح عبرانی اور سریانی زبان کے اشتقاق سے آیا ہے اور اس کا معنی مبارک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیدائش کے بعد پہلے ہی دن آپ کی زبان سے کہلوا دیا تھا۔ کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے وَّ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ (سورۃ مریم) میں جہاں بھی ہوں، مجھے برکت والا بنایا ہے۔ لہذا آپ کا لقب مسیح قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ آپ کا لقب یسوع بھی ہے جو یشوع سے آیا ہے اور اس کا معنی سردار یا سید ہے۔ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ دنیا اور آخرت میں بہت مرتبے والا اور مقرب لوگوں سے ہوگا۔ وجیہ کا مطلب ہے باعزت، عالی مرتبہ اور صاحبِ وجاہت۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا میں یہ بلند مقام نبوت، کتاب (انجیل) کے نزول، اور معجزات (جیسے پیدائشی کلام اور

مردوں کو زندہ کرنا) کی صورت میں عطا ہوا۔ وَالْاٰخِرَةِ (اور آخرت میں) آخرت میں ان کی وجاہت و بلندی کا یہ عالم ہو گا کہ وہ اللہ کے دربار میں' شافع (سفارش کرنے والے) کا درجہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت کو اپنے مقرب بندوں کے حق میں قبول فرمائے گا۔ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ اور مقربین میں سے ہوں گے اس سے مراد وہ انتہائی بلند روحانی اور قربِ الٰہی کا درجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے خاص فرشتوں اور انبیاء کی صف میں عطا فرمایا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت انہیں اپنے سب سے قریب اور مکرم مقام پر فائز فرمائے گا۔

ماں کی گود میں کلام کرنے والے بچے

وَيُكَلِّمُ	اور وہ کلام کریگا	النَّاسَ	لوگوں سے
فِي الْمَهْدِ	گھوارے میں	وَ كَهْلًا	اور پختہ عمر میں
وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ		اور صالحین میں سے (ہوگا)۔(46)	

ارشاد ہوتا ہے وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ آپ لوگوں سے کلام کریں گے گھوارے میں (یا گود میں) اور ادھیڑ عمر میں۔ یہ بشارت تھی جو فرشتوں نے حضرت مریم کو دی۔ اور پھر جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش ہوئی۔ تو یہ بشارت حرف بحرف پوری ہوئی۔ سورہ مریم میں موجود ہے۔ کہ پیدائش کے پہلے ہی دن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے باتیں کیں۔ جب حضرت مریم نومولود بچے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اٹھا کر قوم کے پاس آئیں تو قوم نے سخت غصے کا اظہار کیا۔ اور کہا، اے ہارون کی بہن! تیرے والدین تو ایسے نہیں تھے، تو یہ بچہ کہاں سے لے آئی۔ تو حضرت مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا، گھوارے یا گود میں پڑا بچہ ہمارے ساتھ کیسے بات کرے گا۔ اس وقت عیسیٰ (علیہ السلام) نے بول کر کہا، اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ، میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے کتاب عطا کی گئی ہے اور نبی بنایا گیا ہوں۔ ان الفاظ سے فی الحقیقت مریم کی پوری تسکین کر دی گئی۔ گزشتہ بشارات سے ممکن تھا یہ خیال کرتیں کہ وجاہت تو جب کبھی حاصل ہو گی مگر یہاں تو ولادت کے بعد ہی طعن و تشنیع کا ہدف بننا پڑے گا۔ اسوقت براءت کی کیا صورت ہو گی۔ اس

کا جواب دیدیا کہ گھبراؤ نہیں، تم کو زبان ہلانے کی ضرورت نہ پڑے گی، بلکہ تم کہہ دینا کہ میں نے آج روزہ رکھ چھوڑا ہے کلام نہیں کر سکتی۔ بچہ خود جواب دہی کرے گا۔ جب حضرت مریم علیہا السلام کو لوگوں نے تہمت لگائی تو دودھ پیتے ہونے کے باوجود اللہ کے حکم سے آپ نے گفتگو فرمائی، بچپن میں اور بھی متعدد بچوں نے گفتگو کی ہے، احادیث میں ان کا ذکر آیا ہے، ان میں سے حضرت عیسیٰ کا ذکر تو خود قرآن میں ہے، علامہ قرطبی نے سات بچوں کا تذکرہ کیا ہے، حضرت عیسیٰ، حضرت یحییٰ، حضرت یوسف علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پاک بازی کی گواہی دینے والا بچہ، جریج راہب کی پاک بازی کی گواہی دینے والا بچہ، جس کا ذکر بخاری میں بھی آیا ہے، (بخاری، کتاب احادیث الأنبیاء، حدیث نمبر: ۳۴۳۶) ایک بچہ جو اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا، ایک ظالم صاحب اثر شخص کا گذر ہوا، اس نے کہا: اے اللہ! میرے بچے کو اسی طرح بنا دے، بچہ بول اٹھا: اے اللہ! مجھے اس طرح نہ بنانا مسلم میں یہ روایت آئی ہے، اور اصحابِ اخدود کے واقعہ میں مسلم ہی نے روایت نقل کی ہے کہ جب ایک خاتون کو آگ میں ڈالا جانے لگا، تو بچہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ گھبرائے نہیں کہ وہ حق پر ہے، (مسلم باب قصۃ أصحاب الأخدود الخ، حدیث نمبر: ۷۵۱۱) اس کے علاوہ بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے دختر فرعون کی مشاطہ کی بیٹی کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ماں کے ہاتھ سے کنگھی گر پڑی، اس نے کہا: بسم اللہ، شیر خوار بیٹی نے کہا: اس اللہ کے نام سے جو میرا بھی رب ہے، تیرا بھی اور تیرے باپ کا بھی، بالآخر فرعون نے ماں بیٹی دونوں ہی کو نذرِ آتش کر دیا۔ (تفسیر قرطبی)

عمر کہولت چالیس کے بعد شروع ہوتی ہے، (قرطبی) حضرت مسیح تیس سال کی عمر میں ہی آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے، اب عمر کہولت میں گفتگو کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ آپ دوبارہ زمین پر نازل کئے جائیں، اس کی صراحت احادیث میں آئی ہے؛ گویا اس آیت میں حضرت مسیح کے نزول کی طرف واضح اشارہ کیا گیا ہے، مرزا ملعون غلام احمد قادیانی کا یہ کہنا کہ حضرت مسیح کا نزول نہ ہوگا، کیوں کہ آپ کی وفات ہو چکی اور اپنے آپ کو حضرت مسیح کا مثیل قرار دینا اس آیت کی رو سے قطعاً غلط ہے۔

حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی تین شانیں یہاں بیان ہوئیں۔ (1)...... بات کرنے کی

عمر سے پہلے ہی کلام کریں گے چنانچہ سورۂ مریم آیت 29 تا 33 میں آپ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کا کلام مذکور ہے۔(2)...... پکی عمر میں لوگوں سے کلام فرمائیں گے اور وہ یوں کہ آسمان سے اترنے کے بعد آپ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام لوگوں سے کلام فرمائیں گے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام آسمان سے زمین کی طرف اتریں گے جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا ہے اور دجال کو قتل کریں گے۔لہٰذا جیسے آپ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کا بچپن میں کلام کرنا معجزہ ہے، ایسے ہی پکی عمر میں اس طرح کلام کرنا معجزہ ہے۔(3)...... اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں سے ہیں۔

حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کی صفات: مجموعی طور پر سورۂ آلِ عمران کی آیت نمبر 45 اور 46 میں حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کی بہت سی صفات بیان ہوئیں: (1)...... کَلِمَةُ الله ہونا۔ (2)...... مسیح ہونا۔(3)...... حضرت مریم رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنْهَا کا بیٹا ہونا۔(4)...... بغیر باپ کے پیدا ہونا۔(5)...... دنیا میں عزت والا ہونا کہ قرآن کے ذریعے سارے عالَم میں ان کے نام کی دھوم مچا دی گئی۔آخرت میں خصوصی عزت والا ہونا بہت سے طریقوں سے ہوگا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قیامت میں انہی کے ذریعہ مخلوق کو حضورِ اقدس صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ تک رہنمائی ملے گی۔(6)...... بارگاہِ الٰہی عَزَّ وَجَلَّ میں بہت زیادہ قرب و منزلت رکھنے والا ہونا وغیرہ۔

حضرت مریم علیہا السلام کا حیرت و استعجاب

قَالَتْ	اس (مریم) نے کہا	رَبِّ	اے میرے رب
اَنّٰى	کس طرح	يَكُوْنُ لِيْ	ہوگا میرے لئے
وَلَدٌ	بیٹا	وَّلَمْ	حالانکہ نہیں
يَمْسَسْنِيْ	چھوا مجھے (ہاتھ لگایا)	بَشَرٌ	کسی بشر نے
قَالَ	(فرشتے نے) کہا	كَذٰلِكِ اللهُ	اسی طرح اللہ

يَخْلُقُ	پیدا کرتا ہے	مَا يَشَآءُ	جو وہ چاہتا ہے	اِذَا	جب
قَضٰۤى	وہ ارادہ کرتا ہے	اَمْرًا	کسی کام کا	فَاِنَّمَا	تو صرف

یَقُوۡلُ	وہ کہتا ہے	لَهٗ	اس کو	کُنۡ	ہو جا
فَیَکُوۡنُ			تو وہ ہو جاتا ہے۔(47)		

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ ؕ جب حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے فرشتے نے یہ خوشخبری پیش کی، تب انہوں نے بشری تقاضے اور فطری قانون کے تحت یہ سوال کیا۔تعجب کا اظہار اس کے ناممکن ہونے پر نہیں بلکہ کس طرح ہونے پر کیا، کیونکہ ظاہری اسباب موجود نہیں۔کہنے لگیں، مجھے تو آج تک کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا، پھر میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا!؟ حضرت مریم چونکہ ابھی کنواری تھیں۔اور نہایت ہی عفیفہ اور پاکدامن تھیں۔اس لیے یہ خوشخبری سن کر تعجب اور حیرت سے بولیں کہ مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔میرے بیٹا کس طرح پیدا ہوگا۔مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور دستور یہ ہے کہ بچہ عورت و مرد کے ملاپ سے ہوتا ہے تو مجھے بچہ کس طرح عطا ہوگا، نکاح سے یا یوں ہی بغیر مرد کے؟ اس پر فرشتے نے کہا کہ تعجب کی کوئی بات نہیں قَالَ کَذٰلِكِ اللّٰهُ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ فرمایا: "اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اسی طرح ظاہری اسباب کے بغیر جو چاہتا ہے پیدا کر لیتا ہے۔اس کے لیے یہ کام کوئی مشکل نہیں۔اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَهٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۴۷﴾ وہ تو جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اس کام کے مکمل ہو جانے کے لیے صرف اس کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے۔اس آیت مبارکہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ واضح ہوتی ہے کہ وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے اور کائنات کی ہر شے اس کے ایک حکم کی پابند ہے۔

توراۃ و انجیل کا معنی و مفہوم

وَیُعَلِّمُهُ	اور وہ سکھائے گا اس کو	الۡکِتٰبَ	کتاب
وَالۡحِکۡمَةَ	اور حکمت یعنی دانائی	وَالتَّوۡرٰىةَ	اور توریت
وَالۡاِنۡجِیۡلَ		اور انجیل۔(48)	

فرمایا جس مسیح (علیہ السلام) کی بشارت دی جا رہی ہے۔ اس کی ایک صفت یہ بھی ہوگی۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، اور اللہ تعالیٰ اسے یعنی عیسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اور حکمت سکھائے گا۔ عام مفسرین کرام کتاب سے مراد لکھنا لیتے ہیں اور حکمت سے دانائی۔ مگر بہت سے دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جب مسیح (علیہ السلام) دنیا میں دوبارہ نازل ہوں گے۔ تو وہ کتاب وسنت کے مطابق فیصلے کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو قرآن وسنت کا علم بھی بلاواسطہ دیں گے۔ آپ کسی استاذ سے تفسیر پڑھیں گے اور نہ سنت سیکھیں گے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چیزیں خود سکھائیگا۔ وَالتَّوْرٰىةَ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو تورات کا علم بھی دیا۔ تورات کا معنی قانون ہے اور یہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوئی تھی۔ فرعون کی غلامی سے نجات پانے کے بعد آپ کی امت نے درخواست کی کہ ہم غلامی کے قانون سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب ہمارا اپنا قانون ہونا چاہیئے، تو اس فرمائش کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے تورات نازل فرمائی۔ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾، اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو انجیل کا علم بھی دیا گیا۔ انجیل کا لفظی معنی بشارت ہے۔ اور یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر نازل فرمائی اور آپ کو اس بات کا پابند بنایا کہ تم جہاں بھی جاؤ لوگوں کو خوشخبری سناؤ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ (سورہ صف) یعنی میں تم کو خوشخبری سنانے والا ہوں کہ میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔ سریانی زبان میں یہ نام فارقلیط ہے جو کہ اب عیسائیوں نے انجیل سے حذف کر دیا ہے۔ ان دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی ہے یعنی ستودہ جہاں تعریف والا نبی وہ آنیوالا ہے اور اس کی شریعت ابد تک رائج رہیگی۔ اس کے بعد کوئی نیا قانون اور شریعت نہیں آئیگی۔ اس لیے اس کا نام ہی انجیل رکھا۔ اس میں اخلاق، حکمت اور نصیحت کی باتیں ہیں۔

آپ کو تیس سال کی عمر میں نبوت عطا ہوئی تھی۔ اس کے بعد تین سال مسلسل سیاحت کرتے رہے اور دین کی تبلیغ واشاعت میں مصروف رہے اور غالباً اسی وجہ سے آپ کو مسیح کہا جانے لگا تھا

آپ نے یہود کی بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کی ان تھک کوشش کی۔انہیں تورات کے احکام یاد دلائے اوران کی از سرِ نو تعلیم دی۔ان کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کی۔انجیل کے احکام سنائے اور سکھلائے۔مگر اس بگڑی قوم کی حالت سدھر نہ سکی۔وہ الٹا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے دشمن بن گئے،اور حضرت زکریا پر حضرت مریم سے زنا کا الزام لگا دیا اور بالآخر حضرت زکریا کو اسی وجہ سے قتل کر دیا۔حضرت زکریا کے بعد حضرت یحییٰ (علیہ السلام) نے حضرت عیسیٰ کی تصدیق کی تو انہیں بھی حکومت کی وساطت سے مروا ڈالا۔ان دونوں انبیاء علیہما السلام کے قتل کے بعد یہود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے درپے آزار ہوئے اور ان کے دشمن بن گئے۔بالآخر تینتیس سال کی عمر میں علمائے یہود نے ان پر مقدمہ چلایا اور حکومت کی وساطت سے انہیں سولی پر لٹکانے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ جسد مع روح آسمان پر اٹھالیا۔

یا اللہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے متعلق نصاریٰ اور یہود جس افراط وتفریط میں گرفتار ہو کر گمراہ ہوئے ہمیں اسلام کی بدولت آپ نے اس گمراہی سے بچایا اور صراطِ مستقیم پر رکھا۔یا اللہ ہم کو اسلام کی صراطِ مستقیم پر استقامت عطا فرمائیے اور اسی پر جینا اور اسی پر مرنا نصیب فرمائیے،! آمین یارب العٰلمین

معجزات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام/

اسلام میں تصویر کا حکم/معجزات کا انکار

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ
مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ
وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۴۹ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ
رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۵۰

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار معجزات

<table>
<tr><td>وَرَسُوْلًا</td><td colspan="2">اور (بنائے گا اُسے) رسول</td><td colspan="2">اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ</td><td colspan="2">بنی اسرائیل کی طرف</td></tr>
<tr><td>اَنِّيْٓ</td><td colspan="2">وہ کہے گا) بیشک میں</td><td colspan="2">قَدْ جِئْتُكُمْ</td><td colspan="2">یقیناً لایا ہوں تمہارے پاس</td></tr>
<tr><td>بِاٰيَةٍ</td><td colspan="2">نشانی</td><td colspan="2">مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ</td><td colspan="2">تمہارے رب کی طرف سے</td></tr>
<tr><td>اَنِّيْٓ</td><td>(وہ یہ کہ) بیشک میں</td><td>اَخْلُقُ</td><td>بناتا ہوں</td><td>لَكُمْ</td><td>تمہارے لیے</td><td></td></tr>
</table>

مِّنَ الطِّيْنِ	گارے سے	كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ	پرندے کی شکل کی مانند		
فَاَنْفُخُ	پھر میں پھونک مارتا ہوں	فِيْهِ	اس میں		
فَيَكُوْنُ	تو وہ ہو جاتا ہے	طَيْرًا	(واقعی) پرندہ		
بِاِذْنِ اللّٰهِ	اللہ کے حکم سے	وَاُبْرِئُ	اور میں اچھا کر دیتا ہوں		
الْاَكْمَهَ	مادرزاد اندھے کو	وَالْاَبْرَصَ	اور برص والے کو		
وَاُحْيِ	اور زندہ کرتا ہوں	الْمَوْتٰى	مردوں کو	بِاِذْنِ اللّٰهِ	اللہ کے حکم سے
وَاُنَبِّئُكُمْ	اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں	بِمَا	اُس چیز کی جو		
تَاْكُلُوْنَ	تم کھاتے ہو	وَمَا	اور اُس چیز کو جو		
تَدَّخِرُوْنَ	تم ذخیرہ کرتے ہو	فِيْ بُيُوْتِكُمْ	اپنے گھروں میں		
اِنَّ	بلاشبہ	فِيْ ذٰلِكَ	اس میں	لَاٰيَةً	یقیناً بہت بڑی نشانی ہے
لَّكُمْ	تمہارے لیے	اِنْ	اگر	كُنْتُمْ	ہوتم
مُّؤْمِنِيْنَ	ایمان والے۔(49)				

رشاد ہوتا ہے وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اللہ تعالیٰ اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔نبوت اور رسالت اللہ تعالیٰ کے اعلیٰ ترین مناصب ہیں جسے عطا ہو جائیں۔ یہ منصب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حصے میں بھی رکھ دیا کہ وہ رسول ہوں گے۔مگر بنی اسرائیل کی طرف۔آپ کی نبوت و رسالت تمام اقوام عالم کے لیے نہیں بلکہ صرف قوم بنی اسرائیل کے لیے ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت صرف قوم بنی اسرائیل کی طرف تھی، آپ عالمگیر نبی نہیں تھے؛ جیسا کہ آج کل عیسائی حضرات دعویٰ کرتے ہیں، چنانچہ خود بائبل میں بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی صراحت موجود ہے کہ آپ بنی اسرائیل کے گھرانہ کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کی طرف نہیں بھیجے گئے۔(دیکھئے: متی :۱۶: ۲۴) البتہ حضور خاتم النبیین ﷺ کی نبوت اور رسالت تمام اقوام عالم کے لیے ہے۔قرآن پاک میں موجود ہے۔وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ

بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ہم نے آپ کو تمام بنی نوع انسان کیلئے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے خود حضور ﷺ کی زبان سے کہلوایا قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ آپ کہہ دیں کہ اے دنیا جہان کے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ غرضیکہ آپ (علیہ السلام) کی نبوت عامہ ہے اور تمام بنی نوع انسان کے علاوہ جن وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔ فرمایا: اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں، نبی ﷺ کی طرح حضور ﷺ سے قبل آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بھی تمام اقوام کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے معجزات لوگوں کے سامنے پیش کیے۔

سب سے پہلے معجزے کے متعلق فرمایا: اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ تمہارے سامنے مٹی سے ایک پرندے کی شکل بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں۔ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ پس وہ اللہ کے حکم سے اڑنے لگتا ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا یہ خاص معجزہ تھا۔ آپ مٹی کا پرندہ بناتے اس میں پھونک مارتے تو وہ پھر سے اڑ جاتا۔ اب ہماری شریعت میں کسی جاندار کی تصویر یا مجسمہ بنانا جائز نہیں ہے۔ قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ بِاِذْنِ اللّٰهِ (اللہ کے حکم سے) کا لفظ استعمال کیا ہے؛ تاکہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام کچھ خدائی اختیارات رکھتے تھے اور اپنی مرضی سے پرندوں میں روح پھونکتے تھے، مریضوں کو صحت مند اور مردوں کو زندہ کرتے تھے، یا غیب کی بات جانتے تھے اَنِّىْٓ اَخْلُقُ : یہاں "خَلَقَ" کا لفظ ظاہری شکل وصورت بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تصویر بنانے والوں سے فرمائے گا: (اَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ) "تم نے جو خلق کیا اسے زندہ کرو۔" (بخاری) ایک اور حدیث حضور ﷺ نے فرمایا لَعَنَ الْمُصَوِّرَ تصویر کشی کرنے والے پر خدا کی لعنت ہے۔ وہ اس کی رحمت سے دور ہیں۔ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا، جس گھر میں تصویر اور کتا ہو، وہاں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

بہرحال عیسیٰ (علیہ السلام) نے تصویر سازی معجزہ کے طور پر کی۔اس حدیث میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو جاندار (انسان یا جانور) کی تصویریں بناتے ہیں، کیونکہ یہ عمل اللہ کی تخلیق کی نقل اور شرک کا ذریعہ بن سکتا ہے۔اسلام میں کسی بھی جان دار کی کسی بھی قسم کی تصویر بلا ضرورتِ شدیدہ بنانے کی اجازت نہیں ہے، اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کئی احادیث میں اس سے منع فرمایا ہے۔اور ایک مسلمان اور سچے امتی کے لیے یہ وجہ کافی ہے۔علمائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ ہاتھ سے جان دار کی تصویر بنانا ممنوع ہے،لیکن موجودہ دور کے ڈیجیٹل کیمرے، ویڈیوز اور شناختی دستاویزات کی تصویروں کے جواز کے حوالے سے مختلف آرا اسے ضرورت کے تحت جائز قرار دیتے ہیں جبکہ دیگر اسے اب بھی ممنوع سمجھتے ہیں۔

فرمایا میرا دوسرا معجزہ یہ ہے وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ میں مادرزاد اندھوں اور برص یا کوڑھ کے مریضوں کو اچھا کرتا ہوں برص پھلبہری یا جذام پر بولا جاتا ہے۔یہ لاعلاج بیماریاں ہیں۔یونانیوں کے زمانے سے لے کر آج تک حکما نے ان بیماریوں پر قابو پانے کی بڑی کوشش کی ہے مگر پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکتے۔جذام ایسی خطرناک بیماری ہے کہ اس کے مریض کے ہاتھ پاؤں کی انگلیاں اور ناک وغیرہ گل جاتے ہیں اور پھلبہری کے داغ بھی جب پیدا ہوجائیں تو رفع نہیں ہوتے۔حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بطور معجزہ ان مہلک بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔اس زمانے میں طبابت کا بڑا چرچا تھا۔بقراط اور جالینوس جیسے بڑے بڑے حکیم اسی زمانہ کے قریب گزرے ہیں۔ایک سے ایک بڑا طبیب تھا۔مگر مذکورہ بیماریاں لاعلاج تھیں۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کے علاج کا دعویٰ کیا۔آج کے ترقی یافتہ دور میں میڈیکل سائنس نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔خاص طور پر سرجری میں بڑی مہارت حاصل کی ہے۔مگر پھر بھی لاتعداد کیس ایسے ہیں کہ بیماری کی سمجھ ہی نہیں آتی، علاج تو بعد کی بات ہے۔بہرحال یہ بھی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ تھا کہ لاعلاج بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔دراصل معجزہ کا مطلب ہی عاجز کر دینے والی نشانی ہے۔یعنی ایسی چیز جس کا عام لوگ جواب پیش کرنے سے عاجز آجائیں۔

آپ نے تیسرے معجزے کا اعلان کیا۔ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں، اللہ کے حکم سے۔ مفسرین کرام نے چار ایسے مردوں کا ذکر کیا ہے جنہیں عیسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ کے حکم سے زندہ کیا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے احیائے موتی کا معجزہ بھی مسیح (علیہ السلام) کو عطا فرمایا۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے اس معجزے کا بھی تذکرہ کیا وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ میں تم کو بتلاتا ہوں جو کچھ تم گھر سے کھا کر آتے ہو۔ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اور جو کچھ تم گھر میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ کسی مجلس میں لوگ بیٹھے ہوتے تو عیسیٰ (علیہ السلام) بتادیتے کہ فلاں شخص اپنے گھر سے یہ چیز کھا کر آیا اور فلاں چیز اس کے گھر میں باقی رکھی ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ نے معجزہ عطا کیا تھا، اس کے علاوہ باقی چیزوں کی آپ خبر نہیں دیتے تھے۔ فرمایا اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۹﴾ اس میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں اگر تم یقین رکھتے ہو، یقین دہانی کے لیے اس قسم کے الفاظ قران پاک میں متعدد بار آئے ہیں کسی نبی کے ہاتھ پر کوئی خارق عادت فعل سرزد ہو تو معجزہ کہلاتا ہے۔ اور کسی ولی کے ہاتھ پر ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔ تاہم یہ سب کچھ باذن اللہ یعنی اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ کسی انسان، نبی، ولی کا اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ سب معجزے تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو ان کی نبوت کے ثبوت کے طور پر عطا فرمائے تھے اور آپ نے ان کا عملی مظاہرہ فرمایا۔ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جن معجزات کو بیان فرمایا گیا ہے مجموعی طور پر ان کی تعداد دس بنتی ہے۔ جن میں سے چار معجزات کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہوا۔

مختلف انبیاء علیہم السلام کے نمایاں معجزات

اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو اس کے زمانے کے مناسب حال معجزات عطا فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو اور جادوگروں کا زور تھا، سو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ معجزات دے کر بھیجا جن سے تمام جادوگر دنگ رہ گئے اور ان کی عقل چکرا گئی، بالآخر وہ جادوگر از خود مسلمان ہوئے اور اسلام کی راہ میں سولی چڑھنے تک کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طب اور علوم طبعیہ (سائنس) کا چرچا تھا، سو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ معجزات عطا فرمائے

جن کے سامنے تمام اطباء اور سائنسدان اپنے عاجز اور درماندہ ہونے کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں فصاحت و بلاغت اور شعر و ادب کا ڈنکا بجتا تھا، سو اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ کتاب نازل فرمائی جس نے تمام فصحاء و بلغاء کی گردنیں خم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تین طرح کا چیلنج دیا، پہلے پورے قرآن کی مثل لانے کا (بنی اسرائیل: 88) پھر دس سورتیں اس جیسی لانے کا (ہود: 13) پھر اس جیسی کوئی ایک سورت لانے کا (یونس: 38) مگر وہ بار بار چیلنج سننے کے باوجود اس جیسی دس سورتیں تو کجا، اس جیسی ایک سورت بھی پیش نہ کر سکے۔ کیوں؟ اس لیے کہ پروردگار کا کلام مخلوق کے کلام سے مماثلت نہیں رکھتا۔ (ابن کثیر، رازی)

موجودہ زمانے کے بعض منکرین معجزات نے ایسی آیات کی عجیب و غریب تاویلیں کی ہیں۔ انہوں نے اس آیت میں مذکورہ پرندوں سے مراد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواری لیے ہیں، جنہیں آپ نے تیزی سے جانے کا حکم دیا تھا۔ انہوں نے مادر زاد اندھوں سے جاہل لوگ مراد لیے ہیں۔ اسی طرح وہ کوڑھی سے گندے اور غلیظ لوگ مراد لیتے ہیں۔ پرویز جیسے منکرین نے کمال الٹے معنی لیے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک میں معجزات کا صریح تذکرہ موجود ہے مثلاً پتھروں سے پانی نکلنا، اور اونٹنی کا چٹان سے پیدا ہونا، عصا، ید بیضا وغیرہ۔ اس کے علاوہ حضرت داود اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کے کئی ایک معجزات کا ذکر صریح الفاظ میں موجود ہے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے جلائی جانے والی آگ کا معجزہ بڑا واضح ہے۔ یہ تمام معجزات اہل ایمان کے ایمان کا حصہ ہیں اور ان سے انکار کی مجال نہیں۔ مگر کتنے ہی دہریے، نیچری، قادیانی، لاہوری، سرسید احمد خاں اور پرویز وغیرہم گمراہ لوگ ہیں۔ جو صریح معجزات کی بیہودہ تاویلیں کرتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ہی یقین نہیں کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ ان منکرین نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بغیر باپ کے پیدائش کا بھی انکار کر دیا ہے۔ یہ کفر کی باتیں ہیں۔ مومن کی شان یہ ہے۔ آمَنَّا وَصَدَّقْنَا کہے۔ اگر کوئی چیز انسانی شعور میں نہ بھی آئے، تو اس پر ایمان لانا چاہئے۔ انکار نہیں کرنا چاہئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

ہم ہر چیز کو عقل سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔اعلی دماغ والے لوگ معجزات کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں مگر عام لوگوں کے سامنے ایسی چیزوں کا اظہار مناسب نہیں ہے۔

حلت وحرمت اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ

وَمُصَدِّقًا	اور تصدیق کرنے والا ہوں	لِّمَا	واسطے اس کے جو
بَيْنَ يَدَيَّ	مجھ سے پہلے (نازل شدہ) ہے	مِنَ التَّوْرٰىةِ	تورات
وَلِاُحِلَّ	اور تاکہ میں حلال کر دوں	لَكُمْ	تمہارے لیے
بَعْضَ الَّذِيْ	وہ چیزیں جو	حُرِّمَ	حرام کر دی گئی تھیں
عَلَيْكُمْ	تم پر	وَجِئْتُكُمْ	اور لایا ہوں میں تمہارے پاس
بِاٰيَةٍ	نشانی	مِّنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے رب کی طرف سے
فَاتَّقُوا اللّٰهَ	چنانچہ تم اللہ سے ڈرو	وَاَطِيْعُوْنِ	اور میری اطاعت کرو۔(50)

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ فرمایا وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ میں اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ہر نبی اپنے سے پہلی کتاب کی تصدیق کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ جس نبی سے چاہیں کسی پہلے نازل شدہ حکم کو منسوخ کرا دیں۔ اللہ تعالیٰ جس نبی سے چاہیں کسی پہلے نازل شدہ حکم کو منسوخ کرا دیں۔اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح (علیہ السلام) سے کہلوایا کہ میں تورات کا مصدق ہوں، اس کا منحرف نہیں ہوں۔فرمایا مجھے یہ فرض بھی سونپا گیا ہے وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ تاکہ میں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں۔مثال کے طور پر بنی اسرائیل پر مچھلی، چربی اور بعض دوسری چیزیں حرام تھیں۔ان اشیا کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعے حلال قرار دیا۔یہ بات قابل وضاحت ہے کہ حلت وحرمت کی نسبت جب نبی کی طرف ہوتی ہے۔تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ نبی حلت وحرمت کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔وگرنہ کسی چیز کی حلت وحرمت اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ میں سے ہے۔نبی اپنی مرضی سے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار نہیں دیتا۔بلکہ اس کا مطلب

یہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس اس بات کا قطعی علم آگیا ہے کہ فلاں چیز حلال ہے یا حرام ہے۔ عیسائیوں نے اسی مقام پر غلطی کی۔ جب یہ منصب انہوں نے اپنے پادریوں کو سونپ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے شرک قرار دیا۔ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہی تو ہے کہ حلال وحرام کے اختیارات اپنے پیر پادری یا مولویوں کے سپرد کر دیے جائیں۔ تو نبی کا حلال وحرام ٹھہرانا دراصل اللہ کے احکام کا اعلان ہوتا ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا: وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح نشانیاں لے کر آیا ہوں۔ اس لیے میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔ ’آیت‘ سے مراد یا تو معجزات ہیں یا اللہ تعالیٰ کے احکام، یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈر جاؤ وَاَطِيْعُوْنِ ۞ اور میری بات مانو، کیونکہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اور اسی کا حکم تم کو سناتا ہوں۔

اعتقاد (یقین ونظریہ) اور عمل (کردار واطاعت)
ایک دوسرے کے لازم وملزوم

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰى
مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ
اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۵۴﴾

عَبدِیَّت بندہ ہونے کا اقرار

اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ	رَبِّیْ	میرا رب ہے
وَرَبُّكُمْ	اور تمہارا رب ہے	فَاعْبُدُوْهُ	لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو
هٰذَا	یہ ہے	صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ	سیدھا راستہ۔(51)

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ بیشک اللہ تعالیٰ میرا پروردگار ہے اور تمہارا پروردگار ہے۔حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کا یہ فرمانا اپنی عَبدِیَّت یعنی بندہ ہونے کا اقرار اور اپنی ربوبیت یعنی رب ہونے کا انکار ہے اس میں عیسائیوں کا رد ہے۔گویا فرمایا کہ میں اتنی قدرتوں اور

علم کے باوجود بھی خدا نہیں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس بیان کے ذریعے سمجھانا یہ چاہتے ہیں۔کہ دیکھو بھائی! ہم سب مخلوق ہیں۔میرا اور تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے ہماری سب کی منزل بھی ایک ہی ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت پر ایمان لانا۔اور یاد رکھو! جب تک کسی شخص کا اعتقاد برحق نہ ہو، اس کی قوت عقلی اور علمی کامل نہیں ہوسکتی۔(اعتقاد (یقین و نظریہ) اور عمل (کردار و اطاعت) ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔اعتقاد کسی بھی نظریے کی جڑ ہے، اور عمل اس کا پھل ہے۔درست عقیدہ انسان کو نیک اعمال کی تحریک دیتا ہے، جبکہ نیک عمل عقیدے کو پختہ کرتے ہیں۔) لہذا اس قوت کو کامل بنانے کے لیے اعتقاد کی سچائی اور اس کی پختگی ضروری ہے۔اور پھر اعتقاد برحق کی آخری منزل اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر کامل ایمان لانا ہے اگر عقیدے میں شرک شامل ہوگیا، تو عقیدہ فاسد ہو جائیگا اور انسان کو مطلوبہ کمال کبھی حاصل نہیں ہوسکے گا۔اس آیت کریمہ میں دوسری بات فَاعْبُدُوْهُ ط ہے۔اور یہ چیز قوت عملیہ کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرے اس کے اوامر ونواہی پر عمل کرے۔اس طرح اس کی قوت عملی بھی کمال کو پہنچ جائے گی۔پھر جب قوت علمی اور قوت عملی دونوں اپنے معیار کو پہنچ جائیں گی تو فرمایا هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ یہی وہ سیدھا راستہ ہے جس کی طلب ہر مسلمان ہر نماز میں کرتا ہے اور کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ یہی وہ راستہ ہے جس کی تعلیم تمام انبیاء کرام علیہم السلام دیتے آئے ہیں مفسرین کے مطابق، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے توحید، اخلاص اور دین حق کی پیروی کو" سیدھا راستہ" قرار دیا ہے جو بندے کو اللہ کی رضا اور اس کی قربت تک پہنچاتا ہے۔اس سے قبل شیطان نے انسانوں کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی تھی، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کے لیے یہ راستہ متعین فرمایا۔یعنی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کو بتایا کہ میرا رب بھی وہی ہے جو تمہارا رب ہے۔میرا اور اس کا تعلق باپ بیٹے کا نہیں، بلکہ بندے اور معبود کا ہے میں اس کا بندہ ہوں اور وہ وحدہ لاشریک لہ ہے۔میں خدائے واحد کی عبادت کرتا ہوں تو تم بھی اسی کی عبادت کرو، اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلو، اس کی نعمتوں کا

شکرادا کرواوراس کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکو، یہی سیدھا راستہ ہے اس کے علاوہ سوائے تباہی اور گناہ کے اور کچھ نہیں لہذا نبی کی پیروی دنیاو آخرت میں نجات دلاتی ہے کیونکہ ان کی تعلیمات اللہ کی بھیجی ہوئی بہترین تعلیمات ہوتی ہیں۔

الْحَوَارِيُّوْنَ سے مراد اور اس کی تشریح

فَلَمَّآ	پھر جب	اَحَسَّ	محسوس کیا	عِيْسٰى	عیسیٰ نے
مِنْهُمُ	ان میں	الْكُفْرَ	کفر	قَالَ	(تو) کہا
مَنْ	کون ہے	اَنْصَارِيْٓ	میری مدد کرنے والا	اِلَى اللّٰهِ	اللہ کے لئے
قَالَ	کہا	الْحَوَارِيُّوْنَ	حواریوں نے		
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ	ہم ہیں اللہ (کے دین) کے مددگار	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے		
بِاللّٰهِ	اللہ پر	وَاشْهَدْ	اور تو گواہ رہ		
بِاَنَّا	(اس بات) کہ بیشک ہم	مُسْلِمُوْنَ	فرماں بردار ہیں۔(52)		

فرمایا: فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان لوگوں کی طرف سے کفر محسوس کیا۔ یہ لوگ آپ کے سخت مخالف تھے۔آپ کو طرح طرح سے تکالیف پہنچاتے تھے۔جب ان کی عداوت حد سے بڑھ گئی تو آپ نے فرمایا: قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ کون ہے جو میری مدد کرے اللہ کی راہ میں بعض فرماتے ہیں۔کہ چونکہ یہودیوں نے عیسیٰ کی بات نہ مانی ،اس لیے آپ نے غیر بنی اسرائیل کے لوگوں سے خطاب کیا کہ مطلقاً میری مدد کرنے والا کون ہے۔اس موقع پر، قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ حواریوں نے کہا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ ہم اللہ کے مددگار ہیں۔(علماء لغت اور مفسرین کے مطابق " الحواری " کے بنیادی اور اہم معنیٰ " مددگار " اور " خالص دوست " کے ہیں۔اس کے علاوہ دیگر وجوہاتِ تسمیہ بھی بیان کی گئی ہیں، الحواری یہ لفظ " حور " سے ماخوذ ہے جس کا مطلب کسی چیز کو اس حد تک نکھارنا اور صاف کرنا کہ وہ چمک اٹھے۔چونکہ ان کے دل اور نیتیں بہت صاف اور پاک تھیں، اس لیے انہیں حواری کہا گیا۔الْحَوَارِيُّوْنَ سے مراد

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے وہ ۱۲ انتہائی قریبی، مخلص، اور چنیدہ ساتھی ہیں جنہوں نے ان کی دعوتِ حق پر لبیک کہا، ان کی مدد کی اور ان کے بعد بھی دین حق کو پھیلایا۔ یہ عام پیروکاروں کی بجائے عیسیٰ (علیہ السلام) کے خاص مددگار تھے حواری وہ مخلص لوگ ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لائے۔ یہ لوگ بھی چونکہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ مخلص تھے، اس لیے ان کو حواری کہا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) انہیں مختلف مقامات پر تبلیغ کے لیے بھیجتے اور یہ اللہ کا پیغام حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے منشا کے مطابق لوگوں تک پہنچاتے۔ اللہ کی مدد کرنا یہ ہے کہ اس کے دین و آئین اور پیغمبروں کی مدد کی جائے جس طرح انصار مدینہ نے اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور دین حق کی مدد کر کے دکھلائی۔ بہر حال حواری مخلص دوست پر بولا جاتا ہے۔ الغرض! حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں، یعنی ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ جو اللہ کے دین کی مدد کرتا ہے، اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ کو اپنی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو غنی ہے اور وہ خود ہر ایک کا مددگار ہے۔ اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے دین، اس کی کتاب، اس کے نبی، اس کی شریعت اور عقیدہ حق کی مدد ہے، اللہ کے دین کی اشاعت کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دینا ہی اللہ کی مدد ہے۔ حواریوں نے اپنے اس دعوی کی تائید میں کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں، یہ بھی کہا، اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لائے وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ آپ بھی گواہ بن جائیں کہ ہم خدا تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ اس طرح حواریوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے ایمان کا گواہ بنالیا۔ اس آیت سے حضرات انبیاء (علیہم السلام) کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ حالات کے بگاڑ اور قوم کی ہٹ دھرمی سے مایوس اور دل شکستہ نہیں ہوتے۔ بلکہ خدا کی راہ میں وہ اپنی جدو جہد جاری رکھتے ہیں اگر زور و اثر رکھنے والے لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ اپنے غریب، وفادار اور کمزور و بے اثر ساتھیوں ہی کو لے کر اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں۔ حالات کی تاریکی ان کے اندر روشنی اور قوم کی بے مہری ان کے اندر مزید قوت اور عزم پیدا کرتی ہے۔

کتاب وسنت کے ساتھ اپنا تعلق محکم کرنا

رَبَّنَآ	اے ہمارے رب	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے
بِمَآ	اس چیز کے ساتھ جو	اَنْزَلْتَ	تونے نازل کی
وَاتَّبَعْنَا	اور ہم نے اتباع کیا	الرَّسُوْلَ	رسول کا
فَاكْتُبْنَا	چنانچہ تو ہمیں لکھ لے	مَعَ الشّٰهِدِيْنَ	گواہی دینے والوں کے ساتھ۔(53)

حضرت عیسی (علیہ السلام) کے حواریوں نے اللہ رب العزت کے حضور دعا کی: رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم ایمان لائے ہیں۔اس چیز کے ساتھ جو تونے نازل کی ہے یعنی کتاب۔وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ اور ہم نے رسول (عیسی علیہ السلام) کی پیروی کی ہے۔ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٣﴾ لہذا ہمیں بھی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔گویا کتاب وسنت کے ساتھ اپنا تعلق محکم کرنے کے بعد اللہ کے ہاں اپنے ایمان کی رجسٹری کرارہے ہیں۔تاکہ قیامت کے دن اپنے ایمان کا پورا پورا بدلہ پاسکیں۔یہ ہے وہ نقشہ جو قرآن پاک نے حواریوں کا کھینچا ہے۔البتہ انجیل میں ان حواریوں کا بالکل برعکس نقشہ پیش کیا گیا ہے۔اس سے تو حواریوں کا ایمان بھی ثابت نہیں ہوتا۔یہ حواریوں کا قصور نہیں، بلکہ ان یہودیوں کی تحریف کا نتیجہ ہے، جن کے ہاتھ میں تورات اور انجیل رہی۔یہ دونوں کتابیں تحریفات سے پر ہیں۔خود عیسائی پادریوں کا بیان ہے کہ انجیل میں تین ہزار غلطیاں موجود ہیں۔تحریف شدہ تورات میں انبیاء علیہم السلام سے بڑی غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں، حتی کہ کفروشرک اور بے حیائی تک ان سے منسوب ہے اس طرح انہوں نے خدا کتابوں میں ردوبدل کردیا ہے۔خود ان کی اپنی ذہنیت بگڑ چکی ہے مفسد اور سازشی ذہن رکھتے ہیں اور ہمیشہ بنی نوع انسان کی برائی کی تدبیریں سوچنے والے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ تمام لوگ ان کے دام فریب میں پھنس جائیں اور پھر وہ انہیں جس طرح چاہیں گمراہ کرتے رہیں۔یہ کم بخت ایسی ایسی سکیمیں اور منصوبے تیار کرتے ہیں۔جن کے نتائج سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال بعد سامنے آئیں۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ خدا پر صدق دل سے

ایمان لایا جائے، اس کے جملہ احکام کی بے چون و چرا پیروی کی جائے، جو کچھ اس نے اتارا ہے اس کو مانا جائے، اس کے بھیجے ہوئے رسول کی پیروی کی جائے اور قول، عمل، زندگی اور موت سے اس حق کی شہادت دی جائے جس کا خدا نے امین بنایا ہے۔ یہی وہ شہادت ہے جو اگر جان دے کر دی جائے تو اصل شہادت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ حوارین نے سیدنا مسیح کو جس چیز پر خاص طور پر گواہ ٹھہرایا ہے، وہ اپنا مسلم ہونا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حوارین کے ذہن میں صرف اسلام اور مسلم کا تصور تھا، نصاریٰ اور نصرانیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔

مخفی تدابیر کا استعمال آدمی کی کمزوری کی دلیل

وَمَكَرُوْا		اور انہوں نے تدبیر کی		وَمَكَرَ اللّٰهُ		اور اللہ نے (بھی) تدبیر کی
وَاللّٰهُ	اور اللہ	خَيْرُ	بہتر ہے	الْمٰكِرِيْنَ		سب تدبیر کرنیوالوں سے۔ (54)

وَمَكَرُوْا اور انہوں نے خفیہ تدبیر کی۔ ’مکر‘ کے معنی ہیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی مخفی تدبیر کرنا۔ اس میں مذمت کا پہلو یہاں سے پیدا ہوا کہ مخفی تدابیر کا استعمال آدمی کی کمزوری کی دلیل ہے۔ خفیہ تدبیر بعض حالات میں کسی مکر کرنے والے کے مکر کے توڑ یا اس کی سزا کے طور پر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔۔ بعض اوقات لفظ مکر سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ اردو اور پنجابی میں مکر سے مراد فریب اور دھوکا ہے۔ جب کہ عربی زبان میں یہ لفظ خفیہ تدبیر کے لیے بولا جاتا ہے۔ بہر حال یہودیوں نے خفیہ تدبیر کی، کہ کسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرا دیا جائے۔ اور ادھر اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسی منشاء کے متعلق فرمایا۔ وَمَكَرَ اللّٰهُ ط اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی، یہاں جس مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس سے مراد یہی مکر ہے جو حق کے دشمنوں کی سازشوں کے توڑ یا ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے۔ یہ تدبیریں ایسی تیر بہدف ہوتی ہے کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے خلق کو بیشمار برکتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ اور اپنے بندے کو یہودیوں کے ناپاک ہاتھوں سے محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس طرح آسمانوں پر اٹھالیا اس کا ذکر آگے آئیگا۔ فرمایا۔ وَاللّٰهُ

خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ﴿۵۴﴾ اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ یہ مشہور مقولہ ہے۔کہ جو اپنے بھائی کے لیے کنواں کھودتا ہے چاہ کندہ را چاہ در پیش (جسے عموماً چاہ کن را چاہ در پیش بھی لکھا جاتا ہے) ایک مشہور فارسی کہاوت ہے جو اردو میں بھی بکثرت استعمال ہوتی ہے۔اس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ: ”کنواں کھودنے والے کے آگے ہی کنواں آجاتا ہے۔“ یعنی جو شخص دوسروں کے لیے نقصان کی تدبیر کرتا ہے یا برائی کا جال بچھاتا ہے، بالآخر وہ خود بھی اسی نقصان یا مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔ وہ خود اسی میں گرتا ہے۔یعنی جو کسی کے لیے بری تدبیر کرتا ہے، وہ خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ چناچہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر کامیاب ہوئی۔ اللہ نے انہیں وہاں سے صحیح سلامت نکال لیا۔اور یہودی اپنی سازش میں کامیاب نہ ہو سکے۔اے اللہ! اہل اسلام کو ایمان واسلام کی برکت سے دشمنانِ دین پر غلبہ نصیب فرمادے، اور دشمنانِ دین کی قوتوں کو پاش پاش فرمادے، یااللہ ہم نے اپنی بداعمالیوں کی بدولت خود بھی اپنے آپ کو رسوا کیا، اور اسلام کو بھی بدنام کیا، یااللہ ہم کو اپنی طرف رجوع ہونے کی توفیق نصیب فرمادے اور ظاہراً باطناً ہم کو اسلام کا اتباع کامل نصیب فرما، اور اسلام کی برکت سے اہلِ اسلام کو غالب اور دشمنانِ دین کو مغلوب فرما، آمین یارب العٰلمین وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور قادیانیوں کی غلط تاویل

رفع ونزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ

مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

"مُتَوَفِّيْكَ" کا معنی اور اس کی تشریح

اِذْ	(یاد کرو) جب	قَالَ اللّٰهُ	کہا اللہ نے	يٰعِيْسٰى	اے عیسیٰ!
اِنِّىْ	بلاشبہ میں		مُتَوَفِّيْكَ	تجھے پورا پورا لینے والا ہوں	
وَرَافِعُكَ	اور تجھے اٹھانے والا ہوں		اِلَىَّ	اپنی طرف	
وَمُطَهِّرُكَ	اور تجھے پاک کرنے والا ہوں		مِنَ الَّذِيْنَ	اُن لوگوں سے جنہوں نے	

كَفَرُوْا	کفر کیا	وَجَاعِلُ	اور کرنے والا ہوں	الَّذِيْنَ	اُن کو جنہوں نے
اتَّبَعُوْكَ	تیرا اتباع کیا	فَوْقَ	اوپر (غالب)		
الَّذِيْنَ	اُن کے جنہوں نے	كَفَرُوْٓا	کفر کیا		
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ	روزِ قیامت تک	ثُمَّ	پھر		
اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ	میری ہی طرف تمہیں لوٹ کر آنا ہے	فَاَحْكُمُ	پھر میں فیصلہ کروں گا		
بَيْنَكُمْ	تمہارے درمیان	فِيْمَا	اُن (باتوں) میں کہ		
كُنْتُمْ	تھے تم	فِيْهِ	ان میں	تَخْتَلِفُوْنَ	اختلاف کرتے۔(55)

فرمایا: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ! بیشک میں تجھے قبض کرنے والا ہوں، اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ وَفٰى يَفِيْ" کا معنی پورا ہونا یا پورا کرنا ہے۔ "اِسْتَوْفٰى" اور "تَوَفّٰى" کا معنی پورا لے لینا ہے۔ "اِسْتَوْفَيْتُ مِنْهُ وَ تَوَفَّيْتُ" کا معنی ہے "میں نے اس سے پورا حق لے لیا۔" اس بنا پر "مُتَوَفِّيْكَ" کا معنی ہے "میں تمہیں پورا لینے والا ہوں" اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ عیسیٰ کو روح و بدن دونوں کے ساتھ اٹھا لیا جاتا۔ بعض نے اس کا معنی "(وقت پر) فوت کرنے والا ہوں" کیا ہے اور میں نے ترجمہ کیا ہے "قبض کرنے والا ہوں۔" اس میں دونوں معنی آجاتے ہیں۔ لغت عرب میں "تَوَفِّيْ" کے معنی "اِسْتِيْفَاءْ" اور قبض کے آئے ہیں اور یہ نیند کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے اور موت کی صورت میں بھی اور یہ "تَوَفِّي الرُّوْحِ مَعَ الْبَدَنِ جَمِيْعًا" (روح اور بدن دونوں کو لے لینے) کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت میں (مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ) سے عیسیٰ کا مع جسم آسمان کی طرف اٹھایا جانا مراد ہے۔ جیسا کہ فرمایا: (وَرَافِعُكَ اِلَيَّ) "اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ مُتوفیک، وفات دینے ہی کے معنی میں ہے اور مقصد یہ ہے کہ سولی پر پھانسی کے ذریعہ تمہاری موت نہیں ہوگی، جیسا کہ تمہارے دشمن چاہتے ہیں؛ بلکہ مستقبل میں طبعی موت کے ذریعہ آپ کی

وفات ہوگی، اِس وقت میں آپ کو آسمان کی طرف اُٹھا رہا ہوں، آپ دوبارہ زمین پر اُتارے جائیں گے، پھر کچھ سال دنیا میں آپ رہیں گے، اُس وقت آپ پر طبعی موت طاری ہوگی، غرض ہر دو تفسیر کے مطابق اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن آپ کو پھانسی دینے سے عاجز رہے، آپ ﷺ آسمان پر اٹھالئے گئے، قربِ قیامت میں آپ کا نزول ہوگا، اس وقت آپ پوری دنیا میں اسلام کو غالب فرمائیں گے، (تفسیر قرطبی: ۴/۱۰۰)

قادیانی حضرات دھوکہ دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر موت واقع ہو چکی ہے اور ''وَرَافِعُكَ اِلَیَّ'' سے مراد یہ ہے کہ میں آپ کا درجہ بلند کروں گا؛ حالاں کہ یہ ایسا معنی ہے جو عربی زبان کے قواعد سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ُرفع' کا لفظ جب بغیر کسی حرف کے واسطہ کے کسی سے متعلق ہو، تو جسمانی اور مادی طور پر کسی چیز کو اُٹھانا مراد ہوتا ہے، نہ کہ درجہ ومقام کی بلندی، جیسے خود قرآن نے کہا: ''وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ'' (البقرۃ: ۱۲۷) 'جب ابراہیم بیت اللہ کی دیواریں اوپر اٹھا رہے تھے' جہاں درجہ ومقام کی بلندی کا معنی مراد ہوتا ہے، وہاں اس کے اظہار کے لئے رابطہ کے طور پر کوئی حرف لایا جاتا ہے، جیسے: ''وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ''، (الم نشرح: ۳) 'ہم نے آپ کے لئے آپ کے ذکر کو بلند کیا، اس لئے یہ محض مغالطہ اور فریب ہے، جو متواتر اور صریح حدیثوں، نیز اجماع اُمت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَمُطَهِّرُكَ، اے عیسیٰ! میں تجھ کو پاک کرنے والا ہوں۔ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا۔ یعنی کافروں کے ناپاک ہاتھ تجھ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اور جو لوگ تیری پیروی کریں گے انہیں تاقیامت ان کافروں پر غالب رکھوں گا۔ یعنی میں تیرا اتباع کرنے والے لوگوں کو تیرے ساتھ کفر کرنے والے لوگوں پر غالب بنانے والا ہوں۔ اور یہ سلسلہ قیامت کے قریب تک اسی طرح رہے گا ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ پھر قیامت کے بعد تم سب کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہوگا فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾۔ پھر میں تمہارے درمیان

ان چیزوں میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے پانچ وعدے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے پانچ وعدے کئے ہیں اور انہیں تسلی دی ہے کہ میں ان لوگوں سے تمہیں ضرور نجات دلاؤں گا۔ یہودیوں کا تو یہ اصول بن چکا تھا کہ نبیوں کو قتل کر دیتے تھے، حضرت یحیٰی (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ بھی انہوں نے ایسا کرنا چاہا حاکم وقت کو ان کے خلاف کر دیا یہ کہہ کر کہ وہ تورات کو بدل دینا چاہتے ہیں چناچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ مسیح کو گرفتار کر کے سولی پر چڑھا دیا جائے۔ تب رب العزت نے ان سے وعدہ کیا اور انہیں دشمنوں کے ظلم وستم سے بچا لیا۔ اللہ رب العزت نے ان سے پانچ وعدے کئے۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ۔ 1 ان کی موت یہودیوں کے ہاتھوں نہیں ہوگی۔ بلکہ اللہ ان کو صحیح سلامت آسمان پر اٹھا لے گا اور پھر قیامت کے قریب وہ دنیا میں دوبارہ آئیں گے اور اپنی ہی موت سے فوت ہو جائیں گے۔ 2 ان کو فوری طور پر عالم بالا میں اٹھا لینے کا فرمایا گیا تھا جو پورا کر دیا گیا۔ 3 ان کو دشمنوں کی تہمتوں سے پاک کرنے کا تھا۔ تو وہ اس طرح پورا ہوا جب محمد ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ وہ واقعی اللہ کی قدرت اور مرضی کے مطابق بغیر باپ کے پیدا کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) بغیر ماں اور باپ کے اللہ کی قدرت سے پیدا کئے گئے۔ 4 آپ کے ماننے والوں کو نہ ماننے والوں پر ہمیشہ غالب رکھیں گے اور وہ اس طرح پورا ہوا کہ آج تک ہمیشہ نصاریٰ اور مسلمانوں کو یہودیوں کے مقابلہ میں مستحکم حکومتیں ملیں اور انشاء اللہ ملتی رہیں گی۔ اسرائیلی حکومت تو محض امریکہ اور یورپ کی مشترکہ چھاؤنی ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ 5 پانچواں اور آخری وعدہ قیامت کے روز فیصلہ کر دینے کا تھا جو بالکل اٹل فیصلہ ہے قیامت ضرور آئے گی لوگ حساب کتاب کے لئے اللہ کے حضور ضرور پیش کئے جائیں گے، نیک و بد کو پورا پورا بدلہ ضرور دیا جائے گا۔ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا اور کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا اور حقیقت یہ ہے کہ کفار و مشرکین نے تو ہمیشہ ہی نبیوں اور

رسولوں کی مخالفت کی اور رب العزت نے یا تو ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے نتیجہ میں ان کو عذاب دے کر بالکل فنا کر دیا یا پھر پیغمبر کو ہجرت کروا کر کسی دوسری جگہ منتقل کر کے قوت وشوکت دے دی۔عذاب کے لحاظ سے عاد، ثمود اور قوم لوط وغیرہ کی مثال دی جا سکتی ہے اور ہجرت کے لحاظ سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی مثال دی جا سکتی ہے کہ انہوں نے بھی عراق سے ہجرت کر کے شام میں پناہ لی اور اسی طرح حضرت موسیٰ نے مصر سے شام کی طرف ہجرت کی اور آخر میں محمد ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور پھر ایک مستحکم طاقت بن کر دنیا پر چھا گئے۔اسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بھی ایک طرح سے ہجرت ہی تھی کہ وہ بعد میں دوبارہ دنیا میں آ کر یہودیوں پر مکمل فتح حاصل کریں گے۔قرآن مجید میں صاف صاف کئی جگہوں پر آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا جیسا کہ آیت کے الفاظ یہ ہیں۔"وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ "نہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا لیکن تدبیر حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا۔(کہ اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوش ہو گئے) اس کی تفصیلات آئندہ سورہ نساء میں بھی آئیں گی۔

دنیاوی عذاب اور اخروی عذاب

فَاَمَّا الَّذِيْنَ	پس لیکن وہ لوگ جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا
فَاُعَذِّبُهُمْ	تو میں انہیں عذاب دوں گا	عَذَابًا	عذاب
شَدِيْدًا	سخت	فِي الدُّنْيَا	دنیا میں
وَالْاٰخِرَةِ	اور آخرت (میں)	وَمَا	اور نہیں ہوگا
لَهُمْ	ان کے لئے	مِّنْ نّٰصِرِيْنَ	کوئی مددگار۔(56)

فرمایا فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔پس بہر حال وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ پس ان کو دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا۔ایسے لوگ دنیا میں بھی طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہو کر ذلیل وخوار ہوں گے اور آخرت کا عذاب تو قطعی ہے وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٥٦ اور ان کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا۔جو مشکل وقت میں ان کو عذاب

الٰہی سے بچا سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کافروں، حق کا انکار کرنے والوں اور انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں کے لیے ایک واضح اور دوٹوک اعلانِ عذاب ہے۔ مفسرین کے مطابق اس عذاب کی دو صورتیں ہیں، دنیا میں کفر اور اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کو مختلف قسم کی سزاؤں، ذلت و رسوائی، قتل، قید یا جزیہ (اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے لیا جانے والا ٹیکس) کی صورت میں عذاب دیا جاتا ہے۔ آخرت (روزِ قیامت) میں ان کے لیے جہنم کی صورت میں ایک نہ ختم ہونے والا اور نا قابل برداشت عذاب تیار ہے اور ان کافروں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا جن کو انہوں نے اپنے حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ رکھا ہے وہ انہیں نہ دنیا میں خدا کے عذاب سے بچا سکیں گے اور نہ آخرت میں اس آیت میں کفار کے لیے سخت انتباہ ہے کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد کفر کا راستہ اختیار کرنے کا انجام دنیا اور آخرت دونوں جگہ تباہی ہے۔

ایمان کے تقاضے پورے کرنے والے

وَاَمَّا	اور لیکن	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	وَعَمِلُوا	اور انہوں نے عمل کئے
الصّٰلِحٰتِ	نیک	فَيُوَفِّيْهِمْ	تو (اللہ) انہیں پورے دے گا
اُجُوْرَهُمْ	ان کے اجر	وَاللّٰهُ	اور اللہ
لَا يُحِبُّ	نہیں پسند کرتا	الظّٰلِمِيْنَ	ظالموں کو۔(57)

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے اعمال انجام دیے فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ ان کو ان کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اس آیت میں فرمایا: اور جن لوگوں نے اللہ کے تمام پیغمبروں کو مانا اور ان کے لائے ہوئے پیغام توحید کو تسلیم کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرح اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارا اور اعمال صالحہ بجالا کر ایمان کے تمام تقاضے پورے کیے تو انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا اجر ملے گا اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ مسیح پر ایمان رکھنے کے مدعی بھی اگر ایمان

کے بعد شرک و بدعت میں مبتلا ہو گئے تو آخرت کی پکڑ سے وہ بھی نہ بچ سکیں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو ایمان کے بعد شرک و بدعت میں مبتلا ہوں اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں۔

نبوت کے واضح دلائل

ذٰلِكَ	یہ (واقعات)	نَتْلُوْهُ	ہم انہیں پڑھتے ہیں
عَلَيْكَ	آپ پر	مِنَ الْاٰيٰتِ	نشانیوں میں سے ہیں
وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ		اور حکمت والے ذکر میں سے ہیں۔	

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ یہ آیات ذکر اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں یہ آیات الٰہی میں سے ہیں۔ ذکر حکیم سے مراد قرآن ہے یعنی جو کچھ ہم آپ پر نازل کر رہے ہیں۔ یہ آپ کی نبوت کے واضح دلائل ہیں اور حکمت سے بھرپور قرآن کی آیتیں ہیں۔ قرآن پاک میں آیت کا لفظ کئی معنوں میں آیا ہے۔ آیت کا معنی نشانی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر آیت سے مراد یہ ہے کہ مسیح (علیہ السلام) کے متعلق جو صحیح صحیح واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ آپ کی صداقت کی نشانی ہے۔ اور آیت کا معنی دلیل بھی ہوتا ہے لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ اس میں عقلمندوں کے لیے دلائل ہیں اُولِي الْاَلْبَاب کا مطلب صاحب عقل اور سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کائنات کے نظام، زمین و آسمان کی تخلیق، اور دن رات کی تبدیلی میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کو پہچانتے ہیں۔ اسی طرح آیت کا معنی معجزہ بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا کیا ہے، آیات سے مراد احکام اور مسائل بھی ہوتے ہیں اور قرآن پاک میں کئی مقامات پر یہ لفظ ان معانی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور موجودہ عیسائیت

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
إِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ
فَيَكُونُ ۞٥٩ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ۞٦٠ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ
مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ
وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ۚ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ ۞٦١ إِنَّ هٰذَا
لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۖ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۞٦٢ فَإِنْ
تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ۞٦٣

عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں عقیدہ

إِنَّ	بیشک	مَثَلَ عِيسٰى		مثال عیسیٰ کی	
عِنْدَ اللَّهِ	اللہ کے ہاں	كَمَثَلِ		مانند مثال	
آدَمَ	آدم کی ہے	خَلَقَهُ		(اللہ نے) پیدا کیا اسے	
مِنْ تُرَابٍ	مٹی سے	ثُمَّ قَالَ	پھر کہا	لَهُ	اس کو
كُنْ	تو ہو جا	فَيَكُونُ		تو وہ ہو گیا (انسان۔59)	

إِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی

مثال کی طرح ہے۔ یہ سورت شروع سے لے کر یہاں تک (یعنی پہلی آیت سے 59 تک) وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس وفد نے رسول اللہ ﷺ سے بحث کے دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی "بُنُوَّۃ" (اللہ کا بیٹا ہونے) پر عیسائیوں نے بنیادی طور پر انجیل میں مذکور ان کے لقب "ابن خدا" (Son of God) اور معجزات (بغیر باپ کی پیدائش، مردوں کو زندہ کرنا) سے استدلال کیا۔ وہ انہیں محض ایک نبی نہیں بلکہ الوہی حیثیت دیتے ہیں۔ قرآنِ مجید نے اس استدلال کو سختی سے مسترد کیا ہے۔ اس آیت میں واضح کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے ہاں حضرت آدم علیہ السلام جیسی ہے کہ اللہ نے انہیں بغیر باپ کے مٹی سے پیدا کیا۔ اس کے علاوہ سورۃ الاخلاص میں اللہ کی وحدانیت بیان کی گئی ہے کہ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ ہی کوئی اس کی اولاد ہے، یعنی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی کہ اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا اللہ کا بیٹا ہونے کی دلیل ہوسکتا ہے تو آدم جو ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے وہ بالاولیٰ اللہ کا بیٹا کہلانے کے حق دار ہیں، مگر یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔ اصل میں اللہ تعالیٰ نے آدم کی طرح مسیح کو بھی "کُن" سے پیدا کر کے اپنی قدرت کاملہ کو ظاہر فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۵۹ کہ اسے تھوڑی سی مٹی سے بنایا، پھر اسے فرمایا ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے۔ "مِنْ تُرَابٍ" میں تنوین تقلیل یا تحقیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے "تھوڑی سی مٹی"۔

عیسائی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں وہ عقیدہ رکھتے ہیں جو درست نہیں، ان کے پاس اس کی کوئی قومی یا ضعیف دلیل بھی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ آپ کا کوئی والد نہیں، اس لئے وہ حق رکھتے ہیں کہ انہیں اللہ کا بیٹا اور شریک تسلیم کیا جائے۔ یہ بات دلیل تو درکنار، شبہ بننے کے بھی قابل نہیں۔ کیونکہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو اس طرح پیدا کرنے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکیلا اللہ ہی تخلیق و تدبیر کا مالک ہے اور تمام اسباب اس کی مشیت و ارادہ کے تابع ہیں۔ چنانچہ اس سے ان کے قول کی تردید ہی ہوتی ہے تائید نہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مخلوق کا کوئی فرد اللہ کے ساتھ کسی بھی لحاظ سے شریک بننے کا مستحق نہیں۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا کیا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ عیسائی آدم (علیہ السلام) کے بارے میں

بھی وہی عقیدہ رکھیں جو عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں رکھتے ہیں۔ اگر مسیح (علیہ السلام) کو بغیر باپ کے پیدا کرنے کی وجہ سے اللہ کا بیٹا اور معبود قرار دیا جاسکتا ہے تو آدم (علیہ السلام) کے ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے معبود ہونے کا بالا ولیٰ دعویٰ کرنا چاہیے۔ اس میں اور اس کے بعد والی آیت سے ایک اہم قاعدہ وقانون ثابت ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ عقیدہ یا عمل سے تعلق رکھنے والا جو مسئلہ دلائل سے ثابت ہو جائے تو اس کے خلاف ہر قول کے بارے میں یہ پختہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ باطل ہے۔ اس پر جو بھی شبہ وارد کیا جائے، وہ غلط ہے۔ خواہ بندہ اس کا جواب تلاش کر سکے یا نہ کر سکے۔ شبہ کا جواب نہ دے سکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ یقینی بات قابل تنقید ہے، کیونکہ حق کے خلاف ہر بات باطل ہی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”حق کے بعد سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں“ اس شرعی قاعدہ کی مدد سے انسان کے وہ بہت سے اشکال حل ہو جاتے ہیں جو اہل کلام اور اہل منطق کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی انسان ان کا جواب دے سکتا ہے تو وہ ایک زائد نیکی ہوگی۔ ورنہ اس کا اصل فرض یہی ہے کہ دلائل کے ساتھ حق کو واضح کرے اور اس کی طرف دعوت دے۔ اور یہ عقیدہ بھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حیات ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں یہودیوں سے محفوظ کر کے یقینی طور پر اپنے پاس اٹھالیا، اور آخر زمانے میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور دجال کو قتل کریں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو توڑیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بحفاظت آسمانوں پر اٹھایا جانا اور ان کی حیات اور دوبارہ دنیا میں آنا قرآنِ مجید اور صحیح احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے۔

گمراہ کن عقیدہ لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ

بہر حال قرآن و بائبل میں ایسی تمام باتوں کی جامع تردید ہو جاتی ہے، جو لوگوں نے پیغمبروں کی طرف منسوب کر کے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کرلی ہیں، جن کی رو سے کوئی پیغمبر یا فرشتہ معبود قرار پاتا ہے، ان آیات میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا گیا ہے کہ گو ایسی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی سکھاتی اور بندے کو خدا کے مقام تک لے جاتی ہو وہ ہرگز کسی پیغمبر کی تعلیم نہیں ہو سکتی اور جہاں کسی مذہبی کتاب میں کوئی ایسی بات ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ گمراہ کن

عقیدہ لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

نصاریٰ کی افسانہ طرازی

اَلْحَقُّ		(یہ) حق ہے		مِنْ رَّبِّكَ		آپ کے رب کی طرف سے
فَلَا	لہٰذا نہ	تَكُنْ	ہوں آپ	مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ	شک کرنے والوں میں سے۔(60)	

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہ حق تیرے رب کی طرف سے ہے۔یعنی ہر وہ بات، حکم، یا عقیدہ جو اللہ رب العزت کی طرف سے نازل ہوا ہے، وہی اٹل حقیقت اور سچا "حق" ہے۔انسانی عقلیں اور فلسفے بدل سکتے ہیں، لیکن اللہ کی وحی کبھی غلط نہیں ہو سکتی، حضرت مسیح سے متعلق اصل حقیقت یہی ہے جو قرآن نے واضح کر دی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ سب نصاریٰ کی افسانہ طرازی ہے۔فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۞ ،سو تو شک کرنے والوں سے نہ ہو۔"مُمْتَرِيْنَ" شک اور تذبذب کرنے والوں کو کہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ترین پیغمبر کو بھی یہ حکم دے رہا ہے کہ جب وحی کے ذریعے حق واضح ہو جائے، تو اس میں ذرا برابر بھی شک کی گنجائش نہیں رہتی۔یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تمہارے سامنے جو حق بیان ہوا ہے یہ تیرے رب کی طرف سے ہے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے تمام انسانوں، بالخصوص اہل ایمان کو مخاطب کیا ہے۔اس کا بنیادی مقصد دین اسلام، توحید، اور قرآنِ مجید کی حقانیت پر کامل یقین پیدا کرنا ہے۔مفسرین کرام (جیسے علامہ ابن کثیر اور دیگر) کے مطابق، یہ اندازِ بیان اُمت کو سکھانے اور سمجھانے کے لیے ہے۔چونکہ حق اللہ کی طرف سے ہے، اس لیے اس پر کسی قسم کا شک کرنا انسان کو گمراہی کی طرف لے جا سکتا ہے۔یہ آیت مسلمانوں کو درس دیتی ہے کہ وہ دین کے بنیادی عقائد پر پختہ یقین (یقینِ کامل) رکھیں۔

غلو آمیز عقائد پر مناظرہ

فَمَنْ	پھر جو کوئی	حَآجَّكَ	آپ سے جھگڑے
فِيْهِ	اس (عیسیٰ کے بارے) میں	مِنْ بَعْدِ مَا	بعد اس کے کہ

جَآءَكَ		آ گیا آپ کے پاس		مِنَ الْعِلْمِ		(صحیح) علم سے
فَقُلْ	تو آپ کہہ دیں	تَعَالَوْا	آؤ تم		نَدْعُ	ہم بلاتے ہیں
اَبْنَآءَنَا		اپنے بیٹوں کو		وَاَبْنَآءَكُمْ		اور تمہارے بیٹوں کو
وَنِسَآءَنَا		اور اپنی عورتوں کو		وَنِسَآءَكُمْ		اور تمہاری عورتوں کو
وَاَنْفُسَنَا		اور اپنی جانوں کو		وَاَنْفُسَكُمْ		اور تمہاری جانوں کو
ثُمَّ		پھر		نَبْتَهِلْ		ہم گڑ گڑا کر دعائیں مانگیں
فَنَجْعَلْ		پھر کریں (ڈالیں)		لَّعْنَتَ اللّٰهِ		اللہ کی لعنت
عَلَى الْكٰذِبِيْنَ				جھوٹوں پر۔(61)		

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ پھر جو شخص تجھ سے اس کے بارے میں جھگڑا کرے، اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آچکا سورت کے شروع سے لے کر یہاں تک اللہ تعالیٰ کی توحید، مسیح علیہ السلام کی ولادت کا بیان اور ان کا اللہ یا اللہ کا بیٹا نہ ہونا زبردست علمی دلائل کے ساتھ بیان ہوا۔ اب حکم ہوا کہ جو شخص اتنے واضح دلائل کے بعد بھی نہ مانے تو وہ عناد پر آمادہ ہے، اس سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں، پھر انھیں مباہلہ کی دعوت دو۔ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ تو کہہ دے آؤ! ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو بلالیں اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو اور تمہیں بھی، پھر گڑ گڑا کر دعا کریں۔ یعنی مباہلہ کی صورت یہ بیان فرمائی کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو بلالیں اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو اور تمہیں بھی ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾ پھر گڑ گڑا کر دعا کریں، پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ "بَهَلَ يَبْهَلُ (ف)" کا معنی لعنت کرنا ہے اور "بَاهَلَ مُبَاهَلَةً اور اِبْتَهَلَ يَبْتَهِلُ" کا معنی ایک دوسرے پر لعنت کی دعا کرنا ہے، چونکہ یہ دعا نہایت خلوص اور عاجزی سے ہوتی ہے، اس لیے "اِبْتَهَلَ" کا لفظ عاجزی سے دعا کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت میں مباہلے کا ذکر ہو رہا ہے اس کا معنیٰ سمجھ لیں۔

مُباهَله کا عمومی مفہوم

مُباہَلہ کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ دو مدمقابل افراد آپس میں یوں دعا کریں کہ اگر تم حق پر اور میں باطل ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھے ہلاک کرے اور اگر میں حق پر اور تم باطل پر ہو تو اللہ تعالیٰ تجھے ہلاک کرے۔ پھر یہی بات دوسرا فریق بھی کہے۔ اب واقعہ پڑھئے۔ جب سرکارِ عالی وقار صَلَّی اللہُ تعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے نجران کے عیسائیوں کو یہ آیت پڑھ کر سنائی اور مباہلہ کی دعوت دی تو کہنے لگے کہ ہم غور اور مشورہ کر لیں، کل آپ کو جواب دیں گے۔ جب وہ جمع ہوئے تو انہوں نے اپنے سب سے بڑے عالم اور صاحب رائے شخص عاقب سے کہا کہ ”اے عبدُ المسیح! مباہلہ کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس نے کہا: اے نصاریٰ کی جماعت! تم پہچان چکے ہو کہ محمد نبی مُرسَل تو ضرور ہیں۔ اگر تم نے ان سے مباہلہ کیا تو سب ہلاک ہو جاؤ گے۔ اب اگر نصرانیت پر قائم رہنا چاہتے ہو تو انہیں چھوڑ دو اور گھروں کو لوٹ چلو۔ یہ مشورہ ہونے کے بعد وہ رسولِ کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ حضور انور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی گود میں تو امام حسین رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ ہیں اور دستِ مبارک میں امام حسن رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ کا ہاتھ ہے اور حضرت فاطمہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہا اور حضرت علی کَرَّمَ اللہُ تَعَالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیْم حضور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے پیچھے ہیں اور حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ان سب سے فرما رہے ہیں کہ ”جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ نجران کے سب سے بڑے عیسائی پادری نے جب ان حضرات کو دیکھا تو کہنے لگا: اے جماعت نِصاریٰ! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ اللہ عَزَّ وَجَلَّ سے پہاڑ کو ہٹا دینے کی دعا کریں تو اللہ تعالیٰ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دے، ان سے مباہلہ نہ کرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور قیامت تک روئے زمین پر کوئی عیسائی باقی نہ رہے گا۔ یہ سن کر نصاریٰ نے سرکارِ کائنات صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں عرض کیا کہ ”مباہلہ کی تو ہماری رائے نہیں ہے۔ آخر کار انہوں نے جزیہ دینا منظور کیا مگر مباہلہ کے لیے تیار نہ ہوئے۔ (خازن اٰل عمران، تحت

الآیۃ:۶۱،۱/ ۲۵۸) سرکارِ دوعالم صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ ’’اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، نجران والوں پر عذاب قریب آہی چکا تھا۔ اگر وہ مباہلہ کرتے تو بندروں اور سوروں کی صورت میں مسخ کر دیئے جاتے اور جنگل آگ سے بھڑک اٹھتا اور نجران اور وہاں کے رہنے والے پرندے تک نیست و نابود ہو جاتے اور ایک سال کے عرصہ میں تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔ (ابوسعود اٰل عمران تحت الآیۃ: ۶۱،۱/ ۳۷۳)

مباہلہ کس میں ہونا چاہئے

اِنَّ	بیشک	هٰذَا لَهُوَ	یہی ہے	الْقَصَصُ	بیان
الْحَقُّ	سچا	وَمَا	اور نہیں ہے	مِنْ اِلٰهٍ	کوئی معبود
اِلَّا اللّٰهُ	اللہ کے سوا	وَاِنَّ اللّٰهَ	اور بیشک اللہ	لَهُوَ	ہی ہے
الْعَزِيْزُ	خوب غالب	الْحَكِيْمُ	نہایت حکمت والا۔(62)		

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ یہ بالکل سچے واقعات ہیں اور (حقیقت یہی ہے کہ) اس آیت میں دعوت مباہلہ کے ساتھ بتلا دیا کہ مباہلہ اس پر کیا جاتا تھا کہ جو کچھ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق قرآن میں بیان ہوا وہ ہی سچا بیان ہے۔ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور خدا کی بارگاہ ہر قسم کے شرک اور باپ بیٹے وغیرہ کے تعلقات سے پاک ہے۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ اور اللہ ہی بالادست اور حکمت والا ہے، اپنی زبردست قدرت و حکمت سے جھوٹے اور سچے کے ساتھ وہ ہی معاملہ کرے گا جو اس کے حسب حال ہو۔ ان آیات سے دو مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ مناظرہ سے اوپر درجہ مباہلہ کا ہے یعنی مخالف دین کے ساتھ بددعا کرنی۔ دوسرے یہ کہ مباہلہ دین کے یقینی مسائل میں ہونا چاہیے نہ کہ غیر یقینی مسائل میں لہٰذا اسلام کی حقانیت پر تو مباہلہ ہوسکتا ہے۔ حنفی شافعی اختلافی مسائل میں نہیں۔

عقائد کی صداقت پر وثوق

فَاِنْ	پھر اگر	تَوَلَّوْا	وہ (اب بھی) روگردانی کریں

فَاِنَّ اللّٰهَ	تو بیشک اللہ	عَلِيْمٌۢ	خوب جاننے والا ہے
بِالْمُفْسِدِيْنَ	فساد کرنے والوں کو۔(63)		

اس آیت میں فرمایا: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ پھر اگر یہ نصاریٰ مقابلہ میں نہ آئیں تو اللہ تعالیٰ ایسے مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ بہر صورت اس قضیے کو طے کرنے کی آخری صورت تھی لیکن اگر وہ اس پر بھی راضی نہیں ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ حق کی پیروی نہیں کرنا چاہتے بلکہ حق کی مخالفت کر کے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ شرک تمام فساد کی جڑ ہے۔ اگر زمین و آسمان میں بہت سے معبود ہوتے تو ان کا سارا نظام تکوینی درہم برہم ہو کر رہ جاتا، اسی طرح اگر دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تسلیم کر لی جائے تو اس دنیا کا سارا نظام عدل درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اگر نہ دلائل سے مانیں نہ مباہلہ پر آمادہ ہوں تو سمجھ لو کہ حق مقصود نہیں نہ دل میں اپنے عقائد کی صداقت پر وثوق ہے۔ محض فتنہ و فساد پھیلانا ہی پیش نظر ہے تو خوب سمجھ لیں کہ سب مفسدین اللہ کی نظر میں ہیں۔ اہل نجران نے حق بات کو قبول نہ کیا اور مباہلہ کے بجائے صلح اور جزیہ کو یعنی اہل الذمہ بن کر رہنے کی ترجیح دی۔ تو ان کی حکومت انہی کے پاس رہی۔ اگر وہ مباہلہ کو قبول بھی کرتے اور اپنے اہل و عیال لے کر واپس نہ آتے یا صلح کی پیش کش کے بغیر واپس چلے آتے تو ان کا شمار مفسدوں میں ہوتا اور ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو یہود یوں کا ہوا۔

دعوت وتبلیغ میں حکمت وفراست کی اہمیت/ اصولِ مکالمہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا
نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمَآ
اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىۃُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِہٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَآءِ
حَاجَجْتُمْ فِیْمَا لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰہُ
یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا کَانَ اِبْرٰھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ
حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۶۷﴾

تین مشترکہ باتوں کی دعوت

قُلْ	آپ کہہ دیں	یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ	اے اہل کتاب
تَعَالَوْا	آؤ	اِلٰی کَلِمَۃٍ	ایسی بات کی طرف
سَوَآءٍ	(جو) برابر ہے	بَیْنَنَا	ہمارے درمیان
وَبَیْنَکُمْ	اور تمہارے درمیان	اَلَّا	یہ کہ نہ
نَعْبُدَ	ہم عبادت کریں	اِلَّا اللّٰہَ	سوائے اللہ ہی کی

وَلَا	اور نہ	نُشْرِكَ	ہم شریک ٹھرائیں	بِهٖ	اس کے ساتھ
شَيْـًٔا	کسی چیز کو	وَّلَا يَتَّخِذَ	اور نہ بنائے		
بَعْضُنَا	ہم میں سے کوئی	بَعْضًا	کسی کو		
اَرْبَابًا	رب	مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ کے سوا	فَاِنْ	پھر اگر
تَوَلَّوْا	وہ پھر جائیں	فَقُوْلُوا	تو تم کہہ دو	اشْهَدُوْا	تم گواہ رہو
بِاَنَّا	(اس بات کے) کہ بیشک ہم (تو)	مُسْلِمُوْنَ	(اللہ کے) فرمانبردار ہیں۔(64)		

ارشاد ہوتا ہے قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان برابر ہے، اس آیت میں اہل کتاب کو تین مشترکہ باتوں کی دعوت دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ 1: اللہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی بت کو نہ صلیب کو، نہ آگ کو اور نہ کسی اور چیز کو، بلکہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت رہی ہے۔ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا 2: اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھرائیں۔ وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ 3: اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔۔ یہ ایک تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے حضرت مسیح اور حضرت عزیر علیہما السلام کی ربوبیت (رب ہونے) کا جو عقیدہ گھڑ رکھا ہے یہ غلط ہے، وہ رب نہیں ہیں انسان ہی ہیں۔ دوسرا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے اپنے احبار و رہبان کو حلال و حرام کرنے کا جو اختیار دے رکھا ہے، یہ بھی ان کو رب بنانا ہے جیسا کہ آیت اتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ اس پر شاہد ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے، حلال و حرام کا اختیار بھی صرف اللہ ہی کو ہے۔ (ابن کثیر و فتح القدیر) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ پھر اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ بیشک ہم فرماں بردار ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی کو اپنے ساتھ ملانے کی دعوت دی جائے تو ایسے مسئلہ کی طرف دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہے۔ یعنی اختلاف ختم کرنے کا ایک عمدہ طریقہ بیان کیا ہے کہ جو مشترکہ اور متفقہ

چیزیں ہیں انہیں طے کرلیا جائے تاکہ اختلافی امور ممتاز ہو جائیں اور ان کی تعداد کم ہو جائے اور بحث صرف انہی پر منحصر رہے۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ جب بحث کی جاتی ہے تو کبھی اختلافی موضوع زیرِ بحث آتا ہے اور کبھی اتفاقی پر بحث شروع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت محمد ﷺ نے جب شاہ روم ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ پر دعوت دی جس پر دونوں فریق کو یقین تھا۔ یعنی اللہ کی واحدانیت پر۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرما رہے ہیں: آپ اہل کتاب کو کہہ دیجئے کہ آجاؤ ایسے راستہ کی طرف جو ہم دونوں میں مشترک (ایک ہی) ہے۔ یعنی جس راستہ کی سچائی اور فائدہ کا ہم دونوں قوموں کو یقین ہے اور جس عقیدہ کی تعلیم ہمارے پیغمبر اور تمہارے پیغمبر ہمیشہ دیتے آئے ہیں۔ یہودیت اور نصرانیت دونوں مذہبوں کی بنیاد ہی اصل میں توحید پر ہے۔ اصل توراۃ اور انجیل میں یہی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی صرف "تو اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" اور یہ تو انجیل و تورات میں کہیں بھی نہیں ملتا کہ کچھ پرستش اللہ تعالیٰ کی کرو اور بعض پرستشوں میں ابن اللہ اور روح القدس کو بھی شریک کرلیا کرو۔ مگر ان اہل کتاب نے طرح طرح کے شرک نکال لئے تھے۔ اس آیت سے اسلام کی اصل صفت واضح ہوتی ہے کہ مسلمان ہمیشہ نیکی، راست بازی اور توحید کا ساتھ ہی دیتا ہے اور ہر اس جماعت یا فرد سے پورا پورا تعاون کرنے کو تیار ہوتا ہے جو توحید اور نیکی کی راہوں پر چلنے کو تیار ہو۔ اگر کسی سے تعاون نہیں ہوسکتا تو وہ مشرک، کافر اور منافق ہے۔ کیونکہ مسلمان کا راستہ ان سے بالکل علیحدہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "افضل عمل یہ ہے کہ اللہ کے لئے ہی دوستی رکھی جائے اور اللہ کے لئے ہی دشمنی رکھی جائے"۔ (ابوداؤد)

یہود و نصاریٰ کا دعویٰ

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ		اے اہل کتاب!	لِمَ تُحَآجُّوْنَ		کیوں تم جھگڑتے ہو
فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ		ابراہیم کے بارے میں	وَمَآ		حالانکہ نہیں
اُنْزِلَتِ	نازل کی گئی	التَّوْرٰىةُ	توراۃ	وَالْاِنْجِيْلُ	اور انجیل

اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ	مگر اس کے بعد	اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ	کیا پھر نہیں تم عقل رکھتے۔(65)

فرمایا: یٰۤاَھۡلَ الۡکِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِیۡۤ اِبۡرٰھِیۡمَ اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ نجران کے عیسائیوں اور یہودیوں کے علماء میں حضرت ابراہیم عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے متعلق مناظرہ ہوا۔ یہودی کہتے تھے کہ آپ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام یہودی تھے لہٰذا ہمارا دین بڑا ہے۔ عیسائی کہتے تھے، آپ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام عیسائی تھے لہٰذا ہمارا دین بڑا ہے۔ آخر کار ان دونوں نے سرکارِ عالی وقار صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو اپنا حاکم بنایا، اس پر آیت اتری، (خازن، اٰل عمران، تحت الآیۃ: ۶۵، ۱ / ۲۶۰) وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىۃُ وَالۡاِنۡجِیۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۵﴾ جب کہ تورات اور انجیل تو نازل ہی اس کے بعد کی گئی ہیں، تو کیا تم سمجھتے نہیں۔ یہود و نصاریٰ دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ اس کے باوجود ان میں شدید قسم کے اختلاف تھے۔ مزید یہ کہ یہودیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے مذہب پر تھے یعنی یہودی تھے اور نصاریٰ کا یہ دعویٰ تھا کہ ہمارے مذہب پر تھے یعنی نصاریٰ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا۔ عقل کے اندھو! یہودی وہ ہیں جو تورات کے متبع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور نصاریٰ وہ ہیں جو انجیل کے متبع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ دونوں کتابیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات کے مدتوں بعد نازل ہوئیں تو پھر حضرت ابراہیم یہودی یا نصرانی کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہماری امت میں سے بھی اگر بعد میں بننے والا کوئی گروہ جو: (مَاۤ اَنَا عَلَیۡہِ وَ اَصۡحَابِیۡ) پر قائم نہ ہو اور دعویٰ کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے گروہ سے تھے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ تمہاری تو بنیاد ہی بعد میں رکھی گئی، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے گروہ میں کیسے شامل ہو گئے؟

علمِ تاریخ کی اہمیت

اس آیتِ مبارکہ سے علمِ تاریخ کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے کہ یہاں تاریخ پر ہی حقیقت کا مدار ہے۔ فی زمانہ علمِ تاریخ کی ویسے بھی بہت ضرورت ہے کیونکہ ہمارے زمانے کے بہت سے گمراہ

لوگ تاریخ کو مسخ کر کے ہی لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یونہی علمِ اسماء الرِّجال حقیقتاً تاریخ پر ہی دارومدار رکھتا ہے نیز قوموں کے عروج و زوال اور اس کے اسباب تاریخ ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ اپنے طور پر ہر ایک کو تاریخ کی اجازت نہیں کیونکہ موجودہ تاریخ میں بہت سی گمراہ کن باتیں شامل ہیں۔ بے علم آدمی پڑھے گا تو مارا جائے گا۔ کسی مُستند عالم کی رہنمائی میں تاریخ پڑھنی چاہیے۔

ناحق بحث سے ممانعت

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ		سنو! تم وہی لوگ تو ہو	حَاجَجْتُمْ		(کہ) تم نے جھگڑا کیا
فِيْمَا		اس (بات) میں	لَكُمْ بِهٖ		جس کا تمہیں
عِلْمٌ		کچھ علم (تھا)	فَلِمَ		تو (اب) کیوں
تُحَآجُّوْنَ		تم جھگڑتے ہو	فِيْمَا		اس (بات) میں
لَيْسَ		(کہ) نہیں ہے	لَكُمْ بِهٖ		تمہیں اس (چیز) کا
عِلْمٌ		کوئی علم	وَاللّٰهُ		اور اللہ
يَعْلَمُ	جانتا ہے	وَاَنْتُمْ	اور تم	لَا تَعْلَمُوْنَ	نہیں جانتے۔

تنبیہ کے طور پر فرمایا هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ تم نے اس چیز میں تو جھگڑا کیا جس کا تمہیں کچھ علم تھا۔ یعنی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق تو تمہیں کچھ تھوڑا بہت علم تھا۔ کہ ان پر نازل شدہ کتابیں کسی نہ کسی شکل میں تمہارے پاس موجود تھیں۔ لہٰذا ان کے متعلق تمہارا اختلاف رائے کسی حد تک قبول کیا جاسکتا ہے فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ مگر تم اس چیز کے متعلق جھگڑا کیوں کرتے ہو۔ جس کا تمہیں سرے سے علم ہی نہیں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو کوئی صحیح صحیفہ تمہارے پاس نہیں۔ ان کی کسی تعلیم پر تمہارا عمل نہیں۔ لہٰذا ان کی طرف غلط باتیں کیوں منسوب کرتے ہو۔ کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ کی کہ جن معاملات کا تمہاری کتابوں میں کچھ نہ کچھ ذکر موجود تھا اور تم تک علم پہنچا تھا، وہاں تک تو بحث سمجھ

میں آتی ہے۔لیکن اب تم نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور ملتِ ابراہیمی کے بارے میں ایسی باتیں گھڑ کر بحث کررہے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں، جو سراسر جہالت اور ہٹ دھرمی ہے۔ اس بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔اس آیت سے یہ سنہری اصول معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی موضوع پر گفتگو یا بحث اسی وقت کرنی چاہیے جب انسان کو اس کا مستند علم ہو۔لاعلمی یا سنی سنائی باتوں پر بحث کرنا اور ضد کرنا ناپسندیدہ اور لایعنی عمل ہے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی تین صفتیں

مَا كَانَ	نہیں تھے	اِبْرٰهِيْمُ	ابراہیم	يَهُوْدِيًّا	یہودی		
وَّلَا	اور نہ	نَصْرَانِيًّا	نصرانی	وَّلٰكِنْ	اور لیکن		
كَانَ	تھے وہ	حَنِيْفًا	صرف حق کے پرستار	مُّسْلِمًا	مسلمان		
وَمَا	اور نہیں	كَانَ	تھے وہ	مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ	مشرکین میں سے (67)		

فرمایا: مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی، وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ بلکہ وہ تو حنیف اور مسلمان تھے۔حنیف اس کو کہتے ہیں۔جو سب طرف سے ہٹ کر ایک طرف لگ جائے۔اور اللہ تعالیٰ نے اسی بات کی تعلیم دی۔ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ ۔اللہ کیلیے حنیف بن جاؤ۔ ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی کی اطاعت میں آجاؤ اور مشرک نہ بنو۔اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ تو حنیف مسلم تھے اور مشرک بھی نہیں تھے یہاں نفی اس یہودیت اور نصرانیت کی ہے جس کے مدعی یہود ونصاریٰ تھے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اور مشرکوں سے نہ تھے۔اس آیت میں یہودیت اور نصرانیت کی نفی کرکے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی تین صفتیں بیان فرمائی ہیں اور تینوں سے یہود ونصاریٰ کے دعویٰ کی تردید وتکذیب ہوتی ہے اول یہ کہ وہ حنیف تھے یعنی ادیان باطلہ اور عقائد فاسدہ سے الگ تھے۔دوم یہ کہ وہ مسلم تھے یعنی خدا کی توحید کے معتقد اور احکام خداوندی کے فرمانبردار تھے۔ سوم یہ کہ وہ مشرک نہیں تھے۔خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جلیل القدر پیغمبر اور خلیل

اللہ (اللہ کے دوست) ہیں۔قرآنِ کریم میں آپ کی بے شمار صفات اور کمالات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جن میں سے تین نمایاں ترین صفات: حنیف (سچے موحد): آپ اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرنے والے اور ہر قسم کے شرک سے بیزار تھے۔قرآنِ پاک میں آپ کو خاص طور پر" حنیف" کہہ کر پکارا گیا ہے، جس کا مطلب باطل سے منہ موڑ کر صرف حق (توحید) کی طرف یکسو ہونا ہے۔امّت (پیشوا و رہنما): آپ کو قرآنِ کریم میں ایک مکمل امت (پیشوا) قرار دیا گیا ہے کیونکہ آپ اکیلے ہی وہ تمام خوبیاں اور اوصافِ حسنہ رکھتے تھے جو پوری امت میں ہونے چاہئیں شاکر (شکر گزار): آپ اللہ کی دی گئی تمام نعمتوں پر کثرت سے شکرادا کرنے والے بندے تھے۔قرآن میں آپ کی اس صفت کو خاص طور پر سراہا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سے اپنے پیارے اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے اور تاقیامت مقبول دین کی خدمت لے لے اور اُسی نہج اور اصولوں کو اپنانے کی توفیق دے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکمِ خداوندی اپنی دعوت میں اختیار فرمائے تھے، تاکہ ہماری دعوت عنداللہ مقبول اور عندالناس مفید ہو۔آمین

فن کی آڑ میں فحاشی کا فروغ / تدارک کے لیے اجتماعی ذمہ داری / اہل کتاب کی مذہبی بدبختی کے بنیادی عوامل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ وَھٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰہُ وَلِیُّ
الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۸﴾ وَدَّتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یُضِلُّوْنَکُمْ ؕ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ
اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَاَنْتُمْ
تَشْھَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ
وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

اللہ کے برگزیدہ بندوں کی نسبت

اِنَّ	بیشک		اَوْلٰی	قریب تر	
النَّاسِ	تمام لوگوں میں سے		بِاِبْرٰھِیْمَ	ابراہیم کے	
لَلَّذِیْنَ	البتہ وہ لوگ جنہوں نے		اتَّبَعُوْہُ	ان کا اتباع کیا	
وَھٰذَا	اور یہ	النَّبِیُّ	نبی	وَالَّذِیْنَ	اور وہ لوگ ہیں جو
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	وَاللّٰہُ	اور اللہ	وَلِیُّ	دوست ہے

مومنوں کا (68)	الْمُؤْمِنِيْنَ

فرمایا یاد رکھو !اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ بیشک ابراہیم (علیہ السلام) کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کے دور میں ان کا صحیح اتباع کیا۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت آپ کے ساتھ درست ہے۔ ان کے علاوہ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ آپ پر ایمان لانے والے جو درحقیقت ابراہیم (علیہ السلام) کے متبع ہیں، یہ بھی ان سے مناسبت رکھتے ہیں۔ ان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی نسبت ابراہیم (علیہ السلام) کی طرف کریں۔ یہود ونصاری کو یہ حق قطعاً نہیں پہنچتا۔ فرمایا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۶۸ اللہ ہی مومنوں کا کارساز ہے۔ ولی کا معنی رفیق، سرپرست، دوست اور کارساز ہے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے پھر وہ اس کا کارساز بن جاتا ہے۔ پھر اسے کسی دوسرے دروازے پر جانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس آیت سے 3 باتیں معلوم ہوئیں:

(1)...... نبی سے قرب ان کی اطاعت سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ محض ان کی اولاد ہونے سے، چنانچہ کنعان حضرت نوح عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام سے قریب نہ ہوسکا کیونکہ وہ کافر تھا۔

(2)...... مسلمان ہی سچے ابراہیمی ہیں چنانچہ اسی لئے تمام ابراہیمی سنتیں اسلام میں موجود ہیں جیسے: حج، قربانی، ختنہ، داڑھی وغیرہ۔ یہ سب ابراہیمی سنتیں ہیں اور ان یہود ونصاریٰ کے دین میں نہیں ہیں تو صرف مسلمان ابراہیمی ہوئے۔

(3)...... اللہ کے برگزیدہ بندوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ نعمت ہے۔ جیسے یہاں آیت میں حقانیت کی علامت حضرت ابراہیم عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام سے صحیح نسبت و تعلق کو بیان فرمایا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُلَاةً مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَإِنَّ وَلِيِّي أَبِي وَخَلِيْلُ رَبِّي) "ہر نبی کے لیے نبیوں میں سے کچھ دوست ہیں۔ جن سے اس کا خصوصی تعلق ہوتا ہے اور میرا (خاص تعلق والا) دوست میرا باپ اور میرے رب کا خلیل ہے۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (ترمذی) غالباً اسی

نسبت سے جو درود امت محمدیہ کو نماز میں پڑھنے کے لیے سکھلایا گیا ہے۔ اس میں ایسے ہی الفاظ وارد ہیں اور وہ اسی آیت کی تفسیر ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ، کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی إِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ، إِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ○ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ، کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی إِبْرَاھِیْمَ، وَعَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ إِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ○

ڈیجیٹل دور اور بے راہ روی

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ	چاہتا ہے ایک گروہ	مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اہل کتاب میں سے
لَوْ	کاش کہ	يُضِلُّوْنَكُمْ	وہ تمہیں گمراہ کردیں
وَمَا	اور نہیں	يُضِلُّوْنَ	وہ گمراہ کرتے
اِلَّآ	مگر	اَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ ہی کو
وَمَا يَشْعُرُوْنَ		اور نہیں وہ شعور رکھتے۔(69)	

یہ آیت حضرت معاذ بن جبل، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں نازل ہوئی جن کو یہودی اپنے دین میں داخل کرنے کی کوشش کرتے اور یہودیت کی دعوت دیتے تھے، اس میں بتایا گیا کہ "یہ ان کی ہوس خام ہے، وہ ان کو گمراہ نہ کرسکیں گے۔ (تفسیر قرطبی ال عمران، تحت الآیۃ: ۶۹، ۲ / ۸۴،) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اہل کتاب کا ایک گروہ آرزو کرتا ہے لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ط کہ وہ کسی نہ کسی طرح تم کو گمراہ کریں گذشتہ چودہ سو سال کے عرصہ میں اہل کتاب یہی کچھ کرتے آئے ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے دین سے متنفر کردیں۔ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۶۹ حالانکہ وہ اپنے آپ ہی کو گمراہ کر رہے ہیں اور انہیں اس بات کی سمجھ بھی نہیں آرہی۔ مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عیسائیوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے مرکزی نقطہ سے ہٹا دیا جائے۔ تاکہ وہ بھی گمراہ ہو کر ان ہی کے ساتھ آملیں۔ اگرچہ ان کو جزوی

کامیابی ہوئی ہے۔مگر مجموعی طور پر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں وعدہ کر رکھا ہے۔کہ سچا دین ہمیشہ قائم رہے گا۔اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مسلمان قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل پیرا رہیں۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک مسلمان اپنے دین پر بالکل متفق رہے اور ایک نقطے پر قائم رہے۔آپ کے زمانے میں یہودی سازشیں کرنے لگے۔عبداللہ ابن سبا یمنی یہودی تھا، جو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔مگر مسلمانوں میں فرقہ بندی کی وباء پیدا کر دی۔شیعہ اسی کو مانتے ہیں۔عہدِ نبوی ہی سے یہودیوں اور عیسائیوں کی نامسعود کوشش رہی ہے کہ مسلمان اگر ان کے مذہب میں نہ آئیں تو کم سے کم ایمان کی دولت سے محروم ہو جائیں اور شکوک وشبہات کے کانٹے ان کے دلوں میں بھی چبھ جائیں آج بھی اسلام کے بارے میں مغربی مصنفین کی اکثر تحریروں کا مقصد و منشاء یہی ہے، اس آیت میں غالباً اسی تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔اس میں مذکورہ صحابہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کی عظمت وشان بھی واضح ہوتی ہے۔البتہ یہ یاد رہے کہ کفار کے گروہ مسلمانوں کو اپنے دین میں داخل کرنے کیلئے کوششیں ہمیشہ کرتے رہیں گے۔چنانچہ وقتاً فوقتاً کفر و اِرتداد کی تحریکیں چلتی رہتی ہیں اور اب آج کے ڈیجیٹل دور میں فن اور آزادیِ اظہار کے نام پر تیزی سے پھیلتی فحاشی اور بے حیائی معاشرتی اقدار، اخلاقیات اور ہماری تہذیب کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن چکی ہے۔آج کل میڈیا، فلموں اور سوشل نیٹ ورکس پر "فیشن اور جدیدیت" کے نام پر ایسے مناظر اور مواد پیش کیا جا رہا ہے جو فحاشی کے زمرے میں آتا ہے یہ مواد انسانی نفسیات اور خاص طور پر نوجوان نسل کے اخلاق کو تباہ کر رہا ہے۔انٹرنیٹ اور اسمارٹ فونز نے فحش اور غیر اخلاقی مواد تک رسائی کو انتہائی آسان بنا دیا ہے بے حیائی پر مبنی ویڈیوز اور تصاویر محض تفریح کے نام پر ہر خاص و عام کی پہنچ میں آ چکی ہیں جس سے خاندانی نظام اور رشتوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے، اس رجحان کے باعث معاشرے میں حیا کی قدر کم ہو رہی ہے اور عریانیت کو فیشن کا حصہ سمجھا جانے لگا ہے اسلام میں فحاشی صرف کھلے گناہوں کا نام نہیں بلکہ بری گفتگو، بے پردگی اور عریانی بھی اس میں شامل ہیں۔اس بڑھتی ہوئی بے حیائی کو

روکنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اقدامات اٹھانے کی اشد ضرورت ہے۔ والدین کی کڑی نگرانی، مثبت اور تعمیری تفریح کا فروغ، اور اسلامی اقدار کی پاسداری ہی اس تباہی سے معاشرے کو بچا سکتے ہیں مذہبی و سماجی اسکالرز اور ادارے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر وقت رہتے اس فکری یلغار کو نہ روکا گیا، تو معاشرے کے اخلاقی ڈھانچے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے۔ اہل کتاب خود گمراہ ہیں اس لئے وہ مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کا محافظ اللہ تعالیٰ ہے اس لئے وہ ان کو اپنے جال میں پھنسا کر گمراہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان غلط کوششوں میں پڑ کر وہ صرف اپنے اعمال نامے کو ہی خراب کریں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ اس لئے وہ ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ یہ دشمنی ابھی تک ختم نہیں ہوئی، بلکہ اسرائیلی ریاست کی غلط اور منافقانہ سازشیں ہر وقت مسلمان ممالک اور قوم کی تباہی اور نقصان کی تاک میں تیار ہوتی رہتی ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے ہر وقت ہوشیار رہنا چاہئے اور اپنے بزرگوں کو سامنے رکھتے ہوئے نیکی کی راہیں اپنانی چاہئیں اور جہاد کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

دیدہ دانستہ اللہ کی آیتوں کا انکار

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ	اے اہل کتاب	لِمَ تَکْفُرُوْنَ	کیوں تم کفر کرتے ہو
بِاٰیٰتِ اللّٰہِ	اللہ کی آیتوں کے ساتھ	وَاَنْتُمْ	حالانکہ تم
تَشْھَدُوْنَ	(اُن کی سچائی کی) گواہی دیتے ہو۔(70)		

اللہ تعالیٰ نے فرمایا یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کے ساتھ کیوں کفر کرتے ہو۔ یعنی ان کو کیوں جھٹلاتے ہو۔ اللہ کی آیات سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی وہ بشارتیں ہیں جو پہلے انبیاء سے منقول تھیں۔ یہود ان کو صحیح سمجھتے تھے مگر مانتے نہیں تھے۔ اللہ کی آیات سے رسول اللہ ﷺ کی بشارتوں پر مشتمل آیات کے ساتھ ساتھ عقائد و احکام وغیرہ پر مشتمل دوسری آیات بھی مراد ہو سکتی ہیں، یعنی وہ لوگ صرف آپ ﷺ سے متعلق ہی نہیں،

بلکہ دوسری آیات کو بھی اللہ کا کلام سمجھنے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ کو اللہ کا سچا نبی کیوں نہیں مانتے۔ قرآن پاک کے احکام پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝۷۰ حالانکہ تم گواہ ہو۔ یعنی جب تم اپنی کتابوں میں لکھا ہوا دیکھتے ہو کہ توحید حق اور حضرت محمد ﷺ کا سچا پیغمبر ہے تو پھر دیدہ دانستہ کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو۔ حالانکہ تم خود اپنی کتابوں توریت وانجیل سے پڑھ کر قرآن اور محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تعالٰی علَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی حقانیت کے گواہ ہو اور تمہاری کتابوں میں سرکارِ دوعالم صَلَّی اللہُ تعالٰی علَیہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی صفات موجود ہیں اور تم جانتے ہو کہ وہ نبی برحق ہیں اور ان کا دین سچا دین ہے۔ بحیثیت مسلمان واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی ہر ہر آیت پر ایمان لانا فرض ہے، جان بوجھ کر کسی ایک آیت کا انکار کرنے سے انسان ایمان سے خارج ہوجاتا ہے۔ یعنی اگر معلوم ہو کہ یہ قرآن کی آیت ہے، اس کے باوجود اس کا آیت ہونا تسلیم نہ کرے تو مسلمان نہ رہے گا۔

اہل کتاب کی مذہبی بدبختی

یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ	اے اہل کتاب	لِمَ تَلْبِسُوْنَ	کیوں تم خلط ملط کرتے ہو
الْحَقَّ	حق کو	بِالْبَاطِلِ	باطل کے ساتھ
وَتَكْتُمُوْنَ	اور تم چھپاتے ہو	الْحَقَّ	حق کو
وَاَنْتُمْ	حالانکہ تم	تَعْلَمُوْنَ	جانتے ہو۔(71)

اللہ مالک الملک نے فرمایا۔ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ اے اہل کتاب! حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملاتے ہو۔ اللہ کی نازل کردہ کتابوں میں تحریف کے مرتکب کیوں ہوتے ہو۔ اس کے احکام کو کیوں بدلتے ہو۔ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری کتابوں میں نبی آخر الزمان کی کیا علامتیں ہیں تو اصل علامات کی بجائے غلط ملط علامتیں بتا دیتے ہو وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ اور تم حق بات کو چھپا جاتے ہو۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۷۱ حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو دین صحیح ہے اللہ تعالٰی نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ یہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے

خلاف نفرت پیدا ہو۔اہل کتاب کی مذہبی بدبختیوں کی طرف اشارہ ہے،اس سے پہلی آیت میں علمائے یہود کی یہ بدبختی بیان کی گئی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سچا پیغمبر ہونے کے دلائل جان لینے کے باوجود کفر کر رہے ہیں،اب یہاں بتایا جارہا ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ ملانا اور حق کو چھپانا ان کا عام شیوہ بن چکا ہے۔سورہ بقرہ میں فرمایا:وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ: دوسرا بڑا جرم یہ ہے کہ حق و باطل میں تلبیس کی بجائے سِرے سے حق ہی کو چھپالیا جائے۔یہ بھی بہت بڑا جرم ہے۔زوال کے زمانے میں رجعت پسند مذہبیت اس مرض کا بھی شکار ہوتی ہے اور وہ دین کی سچی تعلیمات کو ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے عام لوگوں سے چھپاتی ہے۔یہودیوں میں بھی زوال کے زمانے میں یہ مرض لاحق ہو چکا تھا۔اس لیے قرآن حکیم نے خاص طور پر بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے حق کو چھپانے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔حق کو چھپانا اتنا بڑا جرم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کی شدید مذمت کی ہے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:''جس آدمی سے کسی ایسے علم کے بارے میں سوال کیا گیا، جسے وہ جانتا ہے، پھر اُس نے اُسے چھپایا تو قیامت کے دن اُس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔''(مشکوٰۃ:223)امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ''ضرورت کے وقت علمِ حق کو چھپانا حرام ہے۔اس لیے کہ ایسا کرنا دین کی توہین ہے۔یہ شریعت کو بھلا دینے کا سبب بنتا ہے۔اس طرح کرنے سے علم کا بڑا حصہ مٹ جاتا ہے۔''(حجۃ اللہ البالغہ، من ابواب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)حقیقت یہ ہے کہ جب دین کے نااہل نمائندے دنیاوی لذات اور خواہشات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور دین کے غلبے کا اہتمام نہیں کرتے اور نہ اُس کی تعلیم دیتے ہیں اور نہ اس پر ٹھیک طرح سے عمل کرتے ہیں، نیکیوں اور معروفات کا نظام نہیں بناتے، منکرات سے نہیں روکتے تو آہستہ آہستہ دین کے خلاف رسومات اور نظام ہائے حیات قائم ہو جاتے ہیں۔یہ سچے علم کو چھپانے اور اُسے پڑھنے پڑھانے سے رک جانے کے نتائج ہوتے ہیں۔اس لیے خاص طور پر حق و باطل کی تلبیس اور سرے سے حق کو چھپانے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اس کو بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔پہلی آیت میں ان کی اپنی گمراہی کا بیان تھا،اس آیت میں دوسروں کو

گمراہ کرنے کا ذکر ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے خوب واقف ہیں مگر اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مسلمانوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس وقت ساری دنیا میں یہود ونصاریٰ کی سازش پھیلی ہوئی ہے۔مگر بہت تھوڑے مسلمان اس سازش کو پہچانتے ہیں۔اور اپنے دین پر قائم ہیں۔ورنہ اکثریت ان کے جال میں پھنس چکی ہے۔کہتے ہیں کہ یہ ترقی یافتہ لوگ ہیں۔جو کچھ کہتے ہیں، درست کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ حق و باطل کی پہچان کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

دشمنانِ اسلام ہمہ وقت محوِفکر وعمل ہیں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَقَالَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْہَ
النَّھَارِ وَاکْفُرُوْٓا اٰخِرَہٗ لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ ۷۲ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَکُمْ ط
قُلْ اِنَّ الْھُدٰی ھُدَی اللّٰہِ لا اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ
رَبِّکُمْ ط قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ ج یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۷۳
یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۷۴

انتہا پسند کفار کی سازشیں

وَقَالَتْ	اور کہا	طَّآئِفَۃٌ	ایک گروہ نے		
مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ	اہل کتاب میں سے (اپنے لوگوں کو)	اٰمِنُوْا	تم ایمان لاؤ		
بِالَّذِیْٓ	ساتھ اس چیز کے جو	اُنْزِلَ	نازل کی گئی ہے		
عَلَی الَّذِیْنَ	اُن لوگوں پر جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے		
وَجْہَ النَّھَارِ	شروع دن میں	وَاکْفُرُوْٓا	اور کفر کرو		
اٰخِرَہٗ	اس (دن) کے آخری حصہ میں	لَعَلَّھُمْ	شاید کہ وہ (مسلمان بھی)		
یَرْجِعُوْنَ	پھر جائیں۔(72)				

وَجْهَ النَّهَارِ سے دن کا پہلا حصہ اور آخِرُ النَّهَار سے دن کا آخری حصہ یعنی شام مراد ہے۔

ارشاد فرمایا وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے (اپنے ساتھیوں سے) کہا کہ جو (قرآن اور دین) ایمان لانے والوں پر نازل ہوا ہے، اس پر دن کے پہلے حصے میں ایمان لے آؤ اور دن کے آخری حصے میں اس کا انکار کر دو، ظاہر ہے کہ نازل ہونے والی چیز قرآن پاک ہے۔ مقصد یہ کہ صبح کے وقت مسلمان ہو جاؤ۔ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ تا کہ شاید یہ (مسلمان) بھی اپنے دین سے پھر جائیں۔

یہودی اسلام کی بڑھتی ہوئی شان وشوکت کو دیکھ کر حسد و بغض سے جل اٹھے تھے اور ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو اسلام سے بدظن کرنے اور اسلام کا وقار ان کے دلوں میں کم کرنے کے لیے اجتماعی منصوبہ تیار کیا اور اس منصوبے کے کرتے دھرتے یہود کے بڑے بڑے عالم تھے چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ صبح کے وقت ظاہری طور پر محض زبانی زبانی اسلام قبول کر لیا کریں اور شام کو دین اسلام سے بیزاری کا اعلان کر دیا کریں اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہم نے اپنی کتابوں کو دیکھا اور اپنے علماء سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ دین (العیاذُ باللہ) سچا نہیں اس لیے ہم نے اس کو چھوڑ کر پھر سے اپنا پہلا دین قبول کر لیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ یہ آیت نازل فرما کر جو غیب وشہادت کا جاننے والا ہے اس نے مسلمانوں پر یہودیوں کا یہ منصوبہ منکشف کر کے اسے ناکام بنا دیا۔ ان کا یہ راز فاش کر دیا اور ان کا یہ مکر نہ چل سکا اور مسلمان پہلے سے خبردار ہو گئے۔ اس بات سے باخبر رہنا چاہیے کہ کافروں کی طرف سے سازشوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ اسلامی تاریخ اور قرآنی تعلیمات کے مطابق، اسلام کے آغاز سے لے کر آج تک اہل کفر کی جانب سے مسلمانوں اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے سازشوں کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے۔ ان سازشوں کا بنیادی مقصد

اسلامی تعلیمات کو مٹانا اور مسلمانوں کو کمزور کرنا رہا ہے۔ اس آیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ باطل قوتیں حق کو نقصان پہنچانے کے لیے ہر دور میں نت نئے طریقے اور فریب استعمال کرتی ہیں، لیکن اہل ایمان کو اپنے دین پر پختہ رہنا چاہیے اور دشمن کی ایسی چالوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے لیے بنیادی حکم یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کی تعلیمات پر عمل پیرا رہیں، اتحادِ امت قائم رکھیں، اور دشمن کی سازشوں کا جواب حکمت، علم اور روحانی طاقت سے دیں۔ کیونکہ دشمن بیرونی حملوں کے ساتھ ساتھ ہمارے اختلافات اور انتشار کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اب وقت ہے کہ اُمت اتحاد، بصیرت اور مضبوط قیادت کے ذریعے اپنی داخلی طاقت کو بحال کرے اور دشمن کے منصوبوں کو ناکام بنایا جائے۔ اس اکیسویں صدی میں تو اِسلام دشمن طاقتیں آج اِسلام کے خلاف متحد ہو کر اِس طرح اُس پر ٹوٹ پڑی ہیں کہ ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ اسلام کے خلاف اس کے دشمنوں کی ایسی یگانگت، ایسا اتحاد، ایسی یک جائی کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ اسلام سے لڑنے، اُس کا پیچھا کرنے، اُس کو گھیرنے اور ہر طرف سے اُس پر راہ بند کر دینے کی ہر تدبیر سے کام لیا جا رہا ہے، ہر ذریعے کو آزمایا جا رہا ہے، ہر طریقۂ پیکار کو استعمال کیا جا رہا ہے اور ایک کے بعد دوسرا محاذ کھول کر فرزندانِ اِسلام کو ہر محاذ پر مشغول کر کے اُن کی طاقت کو منتشر کر دینے اور فیصلہ کن اور آخری مزاحمت سے انھیں باز رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فرزندانِ اسلام غافل اور محوِ استراحت ہیں اور دشمنانِ اسلام ہمہ وقت محوِ فکر و عمل ہیں۔

چھ سو سال تک دنیا میں مسلمانوں کا عروج

وَلَا	اور نہ	تُؤْمِنُوْٓا	تم یقین کرو	اِلَّا	مگر
لِمَنْ	اسی کا جو	تَبِعَ	پیروکار ہے	دِيْنَكُمْ	تمہارے دین کا
قُلْ	کہ دیجئے	اِنَّ	بلاشبہ	الْهُدٰى	ہدایت
هُدَى اللّٰهِ	(تو) اللہ ہی کی ہدایت ہے		اَنْ	(اور نہ یہ مانو) کہ	

يُؤْتٰٓى	دیا گیا	اَحَدٌ	کسی کو	مِّثْلَ	مثل
مَآ	اس کے جو	اُوْتِيْتُمْ	تمہیں دیا گیا	اَوْ	یا (یہ کہ)

يُحَآجُّوْكُمْ	وہ جھگڑے گے تم سے	عِنْدَ رَبِّكُمْ	تمہارے رب کے پاس
قُلْ	کہ دیجئے	اِنَّ الْفَضْلَ	بیشک فضل
بِيَدِ اللّٰهِ	اللہ کے ہاتھ میں ہے	يُؤْتِيْهِ	وہ دیتا ہے یہ (فضل)
مَنْ يَّشَآءُ	جس کو وہ چاہتا ہے	وَاللّٰهُ	اور اللہ
وَاسِعٌ	وسعت والا	عَلِيْمٌ	خوب جاننے والا ہے۔(73)

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ط وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات کا اعتبار نہ کرو۔ یہودی ایک اور کوشش یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو اس بات کی تاکید کرتے تھے کہ خبردار اپنے دین پر پکے رہنا، دوسرے کسی مذہب والے کی پیروی نہ کرنا، تم مسلمانوں کی باتیں سنو مگر قبول وہی کرو جو تمہارے اپنے مذہب کے مطابق ہوں۔ اور خبردار! انہیں تورات کی کوئی ایسی بات بھی نہ بتلانا جو تمہارے اپنے خلاف جاتی ہو۔ ورنہ وہ قیامت کو اللہ کے حضور یہ کہہ دیں گے کہ ان باتوں کا تو یہ یہود خود بھی اقرار کیا کرتے تھے۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ لا آپ ان سے کہئے کہ ہدایت وہ ہے جو اللہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں اپنے پیارے پیغمبر سے فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ تم جو ہدایت کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہو تو یہ تو بتلاؤ کہ یہ ہدایت تمہیں ملی کہاں سے ہے؟ اور اگر اللہ ہی کی طرف سے ملی ہے تو کیا دوسروں کو ایسی ہی ہدایت کے احکام نہیں بتلا سکتا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ تم اللہ کے احکام کے علی الرغم ہر قسم کی بددیانتی پر اتر آئے ہو؟ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ کہ وہ کسی دوسرے کو بھی وہی کچھ دے دے جو تمہیں دیا یا ہدایت وہ ہے جس سے وہ تمہارے پروردگار کے حضور تم پر حجت قائم کر سکیں۔؟ یعنی یہودی اپنے ہی دینی بھائی بندوں کو کہہ رہے ہیں۔ کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی تصدیق نہ کرنا، کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے کو بھی ویسی ہی فضیلت، برتری یا کتاب دے

دی جائے جیسی تم کو دی گئی ہے تمہارا دین ہی برتر اور افضل ہے۔ لہٰذا اسی پر قائم رہنا۔ اور اغیار کی عدم تصدیق کی دوسری حکمت یہ ہے کہ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ یا وہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کے پاس جھگڑا کریں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر تم نے اہل ایمان کی تصدیق کر دی تو پھر بحث مباحثہ میں تم پر غالب آجائیں گے اور یہی یہودیت کی ناکامی کا باعث ہوگا، لہٰذا سلامتی اسی بات میں ہے۔ کہ صرف اسی کی تصدیق کرو جو تمہارے دین کا متبع ہے، اس کے علاوہ کسی دوسرے کی تصدیق مت کرو۔ فرمایا قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ اے پیغمبر ﷺ آپ کہہ دیں کہ فضل تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اس کا مالک ہے۔ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وہ جس کو چاہتا ہے، فضل عطا کر دیتا ہے۔ جب تک بنی اسرائیل اس کے احکام پر عمل پیرا رہے، اللہ نے ان کو فضیلت عطا کی۔ پھر جب ان کی صلاحیت ختم ہوگئی، تو اللہ نے فضیلت والی نعمت بھی ان سے واپس لے لی۔ اور دوسری امت کو دے دو وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾۔ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ ہر امت کی صلاحیت کو جانتا ہے اور پھر اس کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ مسلمانوں کے متعلق حضور ﷺ کا اشارہ تھا۔ کہ میری امت کے عروج کا زمانہ نصف دن سے کم کا نہیں ہوگا۔ اور نصف دن پانچ سو سال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ تقریباً چھ سو سال تک دنیا میں مسلمانوں کو مکمل عروج حاصل رہا۔ پھر جوں جوں ان کی صلاحیت ختم ہوتی گئی، اقتدار بھی ان سے چھنتا گیا۔ اب گذشتہ آٹھ سو سال سے پستی میں جا رہے ہیں۔ اور دوسری اقوام مادی لحاظ سے ترقی پر ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا۔ جب تک صلاحیت موجود رہی برتری حاصل رہی، جب صلاحیت ختم ہوگئی، تو فضیلت بھی چھن گئی۔

فضیلت اور برتری کے اصل حقدار

يَخْتَصُّ	وہ خاص کرتا ہے	بِرَحْمَتِهٖ	اپنی رحمت کے ساتھ
مَنْ	جس کو	يَّشَآءُ	وہ چاہتا ہے
وَاللّٰهُ	اور اللہ	ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ	بہت بڑے فضل والا ہے

فرمایا فضیلت کا مالک وہ ہے یَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے۔اپنے اپنے وقت پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو خاص کیا اور پھر آخری دور میں اپنے آخری پیغمبر اور آخری امت کو اپنی رحمت کے ساتھ خاص کیا۔ان کو فضیلت اور برتری عطا فرمائی،ان کی ان سب کوششوں اور شرارتوں کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا۔بیشک ایک وقت تھا جب اللہ نے تمہیں تمام جہان والوں پر عزوشرف بخشا تھا۔لیکن اب تم مسلسل فتنہ انگیزیوں اور بدعہدیوں کی وجہ سے اس قابل نہیں رہے۔فضل وشرف کا مالک اللہ ہے اور اب جسے اس نے مناسب اور مستحق سمجھا اسے اس نے دے دیا۔فضل وشرف کے ٹھیکیدار تم نہیں ہو۔اللہ تعالیٰ تم جیسا تنگ نظر نہیں ہے کہ فضل وشرف کے اہل لوگوں کو فضل وشرف عطا نہ فرمائے،بلکہ وہ بڑا وسیع النظر ہے۔سب کچھ جاننے والا اور وہی فضل وشرف عطا کرنے والا ہے اور وہ یہ بھی خوب جانتا ہے کہ تم اب اس عزوشرف کے اہل نہیں رہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نبوت ورسالت کے ساتھ جسے چاہے خاص فرمالیتا ہے اور نبوت جس کسی کو ملتی ہے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے فضل سے ملتی ہے اس میں ذاتی استحقاق کا دخل نہیں۔ہاں اب اللہ تعالیٰ نے چونکہ نبوت کا دروازہ بند کر دیا تو اب کسی کو نبوت نہ ملے گی۔کیونکہ: وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۷۴﴾ اللہ تعالیٰ عظیم فضل ورحمت کا مالک ہے۔اس کی رحمت تو ہر آن موجود ہے مگر انسان عدم صلاحیت کی بناء پر اس سے محروم ہو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ ہمارے دین وایمان کو ہر طرح کے ظاہری وباطنی فتنوں سے محفوظ فرمائیں،اللہ کریم قرآن کریم کا اتباع کامل نصیب فرمائیے اور اپنی مخصوص رحمتیں ہم کو عطا فرمائیے۔آمین وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العٰلمین۔

ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے سے نہ کھاؤ/ اسلام میں ایفائے عہد اور وعدے کی پاس داری کی اہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ
بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ قَآىِٕمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ
عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى
مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ
وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓىِٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا
یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۷﴾

دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کا باطل فلسفہ

<table dir="rtl">
<tr><td>وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ</td><td>اور بعض اہل کتاب میں سے</td><td>مَنْ</td><td>وہ ہیں کہ</td></tr>
<tr><td>اِنْ</td><td>اگر</td><td>تَاْمَنْهُ</td><td>آپ امانت رکھیں اُن کے پاس</td></tr>
<tr><td>بِقِنْطَارٍ</td><td>ایک ڈھیر (سونے چاندی کا)</td><td>یُّؤَدِّهٖ</td><td>(تو بھی) وہ ادا کردیں گے</td></tr>
<tr><td>اِلَیْكَ</td><td>آپ کو</td><td>وَمِنْهُمْ</td><td>اور بعض ان میں سے</td><td>مَّنْ</td><td>وہ ہیں کہ</td></tr>
</table>

اِنۡ	اگر	تَاۡمَنۡهُ	آپ امانت رکھیں اُن کے پاس		
بِدِیۡنَارٍ	ایک دینار	لَّا یُؤَدِّهٖۤ	(تو) نہیں وہ ادا کریں گے		
اِلَیۡكَ	آپ کو	اِلَّا	مگر (یہ کہ)	مَا دُمۡتَ	آپ مسلسل رہیں
عَلَیۡهِ	اُن (کے سر) پر	قَآئِمًا	کھڑے	ذٰلِكَ	یہ
بِاَنَّهُمۡ	بسبب اس کے کہ بیشک	قَالُوۡا	انہوں نے کہا		
لَیۡسَ	نہیں ہے	عَلَیۡنَا	ہم پر		
فِی الۡاُمِّیّٖنَ	امیوں (عربوں) کے بارے میں	سَبِیۡلٌ	کوئی گناہ		
وَیَقُوۡلُوۡنَ	اور وہ کہتے ہیں	عَلَی اللّٰهِ	اللہ پر		
الۡكَذِبَ	جھوٹ	وَهُمۡ	اور وہ	یَعۡلَمُوۡنَ	جانتے ہیں۔(75)

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ بعض اہل کتاب ایسے ہیں مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ اگر آپ ان کے پاس ڈھیر مال یا بڑا خزانہ امانت رکھیں یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیۡكَ ۚ تو وہ اس کو واپس لوٹا دے گا۔ یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی اور اس میں ظاہر فرمایا گیا کہ ''ان میں دو قسم کے لوگ ہیں: امانت دار اور بد دیانت۔ بعض تو ایسے ہیں کہ ان کے پاس ڈھیروں ڈھیر مال بھی امانت کے طور پر رکھ دیا جائے تو وہ بغیر کسی کمی بیشی کے وقت پر ادا کر دیں گے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کے پاس ایک قریشی نے بارہ سو اوقیہ یعنی تقریباً 147 کلو سونا امانت رکھا تھا، آپ نے اس کو ویسا ہی ادا کیا وَمِنۡهُمۡ اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِیۡنَارٍ اگر آپ ان کے پاس ایک دینار ایک اشرفی یا ایک پونڈ ہی امانت رکھیں (اس زمانے میں دینار سونے کا سکہ ہوتا تھا، جس کا وزن چار ماشے ہوتا تھا۔ اور درہم چاندی کا سکہ تھا، جو ساڑھے تین ماشے کا ہوتا تھا۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں اور باقی دنیا میں یہی سکہ رائج تھا۔) لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیۡكَ تو وہ اس کو بھی واپس نہیں کرے گا۔ یعنی بعض اہلِ کتاب اتنے بد دیانت ہیں کہ تھوڑے سے مال پر بھی ان کی نیت بگڑ جاتی ہے۔ جیسے کہ فنحاص بن

عَازُورَاءُ نامی یہودی جس کے پاس کسی نے ایک اشرفی امانت رکھی تھی لیکن وہ واپسی کے وقت اس سے بھی مُکر گیا۔(بیضاوی اٰل عمران تحت الآیۃ:۷۵، ۲ / ۵۴) کہ میں نے تمہاری کوئی امانت نہیں رکھی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ پاس ہی اس کا شاگرد تھا۔اس نے کہا،کہ اس شخص کی امانت آپ کے پاس موجود ہے اسے واپس کر دیں۔کہنے لگا ٹھیک ہے میں نے ایک دینار اس سے لیا تھا۔مگر یہ امی (ان پڑھ) لوگ ہیں،ان کا مال ہضم کر جانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ ہمارے لیے جائز ہے۔اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ مگر جب تک تو اس کے اوپر کھڑا رہے،یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا ہم پر ان پڑھوں کے بارے میں (گرفت کا) کوئی راستہ نہیں۔''اُمیین'' سے مشرکین عرب مراد ہیں،یعنی یہ بے جا طریقہ پر مشرکین عرب کا مال ہڑپ لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔یہودیوں نے ایک باطل فلسفہ قائم کر رکھا تھا۔کہ انہوں نے علم حاصل کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔مال صرف کیا ہے تو اس کے عوضانے کے طور پر ان پڑھ لوگوں کا مال ان پر حلال ہے۔جب یہ فلسفہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ یہودیوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا كَذَبَ أَعْدَاءُ اللهِ، دشمنانِ خدا جھوٹ بولتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسا کوئی حق نہیں دیا مَا مِنْ شَيْءٍ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ إِلَّا وَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ۔اللہ جل جلالہ نے جاہلیت کی تمام باتیں (رسومات) میرے پاؤں کے نیچے روند دی ہیں۔ان کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔إِلَّا الْأَمَانَةَ، فَإِنَّهَا مُؤَدَّاةٌ إِلَى الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ سوائے امانت کے کیونکہ امانت خواہ نیک آدمی کی ہو یا برے شخص کی،اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔اس میں دوستی اور دشمنی کو کوئی دخل نہیں۔کوئی شخص کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو،جاہل ہو یا عالم،امانت بہرحال واجب الادا ہوتی ہے۔دھوکہ دہی، چوری،خیانت وغیرہ کا مال قطعاً حرام ہے ہاں اگر کوئی اپنی خوشی سے کسی کو کچھ دے دے تو لینے والے کے لیے جائز ہے۔وگرنہ امانت کی ادائیگی ہر ایک کے لیے لازم ہے۔

تقسیم ہند کے موقع پر لوگوں نے ایک دوسرے کا مال کھلے عام کھایا خوب لوٹ ماری۔ یہ

قطعاً حرام ہے۔اس کا حساب قیامت کو دینا پڑے گا۔ہندو تو ویسے ہی کافر ہے۔اگرکسی مسلمان نے ہندو کا مال کھایا ہے۔تو وہ بھی معاف نہیں ہوگا۔کسی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا کہ ہم جہاد کے لیے جاتے ہیں۔ذمیوں کے علاقے سے گزرتے ہوئے کوئی بھیڑ بکری یا مرغی وغیرہ مل جائے،تو ہم کھالیتے ہیں۔آخر ہم غازی ہیں ذمیوں کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ناراض ہوئے اور فرمایا یہ تو وہی بات ہے جو یہودیوں نے کی تھی۔لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ یعنی امیوں کا مال کھا جانے میں کوئی حرج نہیں۔فرمایا جب ذمی لوگ مسلمانوں کو جزیہ ادا کرتے ہیں تو پھر ان کے مال وجان کی حفاظت ہم پر لازم آتی ہے۔ان کے مال کو ان کی رضامندی کے بغیر کھانا حرام ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ بول رہے ہیں۔ان کے باطل عقیدہ کی نسبت ان کے دین اور ان کی کتاب کی طرف ہوگی۔اور کتاب کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔جس کا مطلب یہ ہوگا۔کہ خدا تعالیٰ نے ان کے لیے امیوں کا مال مباح قرار دیا ہے۔ایسا ہرگز نہیں۔یہ لوگ دیدہ دانستہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔حضور ﷺ نے فرمایا: أَدِّ الْأَمَانَةَ إِلَى مَنِ ائْتَمَنَكَ، وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ (سنن ابی داود:3535) امانت اس کے سپرد کرو جو تم پر اعتماد کرے،اور جو تم سے خیانت کرے،تم اس سے خیانت نہ کرو۔یہ حدیث اسلامی اخلاقیات کا ایک عظیم اصول بیان کرتی ہے۔اسلام میں دیانت داری اور امانت داری کو بنیادی صفات میں شمار کیا گیا ہے۔یہ حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ: سچے مسلمان کو دوسروں کی امانت میں خیانت نہیں کرنی چاہیے۔دیانت کا معیار دوسروں کے کردار سے نہیں، ہمارے ایمان سے جڑا ہوا ہے۔اعلیٰ اخلاق وہی ہے جو برائی کے بدلے بھی بھلائی کرے۔

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ دھوکے اور ظلم کے طور پر کسی کا مال دبالینا حرام ہے اگرچہ وہ کسی دوسرے مذہب کا ہو۔رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ہجرت کی رات

حضرت علی کَرَّمَ اللہ تعالٰی وَجْہَہُ الْکَرِیم کو ان لوگوں کی امانتوں کی ادائیگی کی ذمہ داری دے کر گئے جو حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے قتل کا ارادہ کر رہے تھے اور جن سے تنگ آ کر آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ہجرت کر رہے تھے۔ سُبْحَانَ اللہ۔ (السیرۃ النبویہ لابن ہشام، ہجرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ص ۱۹۲-۱۹۳) اے کاش کہ ہمارے مسلمان بھائی غور فرمائیں کہ وہ تاجدارِ رسالت صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی سنت پر عمل پیرا ہیں یا یہودیوں کے طریقے پر؟ اس وقت عمومی طور پر مسلمان دنیا میں نیک نام نہیں ہیں۔

ایفائے عہد کی اہمیت وفضیلت

بَلٰی	کیوں نہیں؟	مَنۡ	جو شخص	اَوۡفٰی	پورا کرے
بِعَھۡدِہٖ	اپنا عہد	وَاتَّقٰی	اور (اللہ سے) ڈرے	فَاِنَّ	تو بلاشبہ
اللہَ	اللہ	یُحِبُّ	محبت کرتا ہے	الۡمُتَّقِیۡنَ	متقی لوگوں سے (76)

ایفائے عہد'' یعنی عہد کو پورا کرنا، وعدے کی تکمیل اور قول وقرار پر قائم رہنا اسلامی تعلیمات کا امتیاز اور بندۂ مومن کی شناخت ہیں۔ ہر سطح اور ہر مقام پر راست گوئی، دیانت و امانت اور ایفائے عہد اسلام کے نزدیک انسان کی سیرت و کردار میں مطلوب ہیں۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ دنیا کی کوئی سوسائٹی اور کوئی انسانی معاشرہ اُس وقت تک ترقّی نہیں کرسکتا، جب تک اس کے نزدیک وعدے کی تکمیل اور ایفائے عہد کو بنیادی مقام حاصل نہ ہو۔ ''ایفائے عہد'' گویا معاشرے کے استحکام اور اس کے قیام کی یقینی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس جس سوسائٹی اور معاشرے میں وعدے اور عہد کی پابندی نہ ہو، اسے بنیادی اہمیت حاصل نہ ہو، اُس معاشرے کے استحکام کی ضمانت نہیں دی جاسکتی، وہ ایک زوال پذیر معاشرہ ہوگا، جہاں کمٹمنٹ کو بنیادی اہمیت حاصل نہ ہو۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو معاشرہ اپنا اعتماد کھو بیٹھے، وہ اپنا اعتبار اور وقار بھی کھو دیتا ہے۔ اللہ نے فرمایا۔ بَلٰی مَنۡ اَوۡفٰی بِعَھۡدِہٖ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے گا۔ اگر کسی نے امانت رکھی ہے تو اس کو ادا کرے گا وَاتَّقٰی اور ڈرتا

رہے گا۔ کفر شرک نفاق اور معصیت سے بچتا رہے گا۔ امانت میں خیانت نہیں کرے گا۔ بلکہ پرہیزگاری اختیار کرے گا فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ متقیوں کو ہی پسند فرماتا ہے۔ دوسری جگہ موجود ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔ کفار، مشرکین، منافقین، متکبرین اور خائنین اس کی نظر میں بہت بڑے مجرم ہیں۔ غرض! ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی گندی ذہنیت کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ایک باطل فلسفہ خود ہی وضع کر رکھا ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ مالی حقوق تو توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتے جب کہ صاحب حق خود معاف نہ کرے۔ حقوق العباد بڑی اہم چیز ہے۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو کسی سے وعدہ کیا جائے اسے ضرور پورا کیا جائے خواہ رب عَزَّ وَجَلَّ سے کیا ہو یا عام انسانوں سے یا نبی سے یا اپنے پیر سے یا بوقت نکاح بیوی سے یا کسی اور عزیز سے۔

اہل کتاب کی بدعہدی

اِنَّ	بیشک	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جو	يَشْتَرُوْنَ	خریدتے (لیتے) ہیں
بِعَهْدِ اللّٰهِ	اللہ کا عہد	وَاَيْمَانِهِمْ	اور اپنی قسمیں کے عوض		
ثَمَنًا	قیمت	قَلِيْلًا	تھوڑی سی	اُولٰٓئِكَ	یہ (وہ) لوگ ہیں (کہ)
لَا	نہیں (ہے)	خَلَاقَ	کوئی حصہ	لَهُمْ	ان کے لیے
فِي الْاٰخِرَةِ	آخرت میں	وَلَا	اور نہ	يُكَلِّمُهُمُ	ان سے کلام کرے گا
اللّٰهُ	اللہ	وَلَا	اور نہ	يَنْظُرُ	دیکھے گا
اِلَيْهِمْ	ان کی طرف (نظرِ رحمت سے	يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن		
وَلَا يُزَكِّيْهِمْ	اور نہ انہیں پاک کرے گا	وَلَهُمْ	اور ان کے لیے ہے		
عَذَابٌ	عذاب	اَلِيْمٌ	دردناک۔ (77)		

ارشاد ربانی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا بیشک جو

لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی سی قیمت خرید تے ہیں۔عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بازار میں کچھ سامان تجارت لاکر رکھا، پھر اس پر قسم کھا کر کہا کہ میں نے اس سامان کے اتنے روپے دیے، حالانکہ اس نے اتنے روپے نہیں دیے تھے (یا کہا کہ مجھے اس سامان کے اتنے روپے مل رہے تھے، حالانکہ اسے اتنے روپے نہیں مل رہے تھے) قسم کا مقصد یہ تھا کہ کسی مسلمان کو اس میں پھنسائے تو اس پر یہ آیت اتری۔بہر حال فرمایا جارہا ہے أُولَٰٓئِكَ لَا خَلَٰقَ لَهُمۡ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ۔ان کے لیے آخرت میں کچھ نہیں۔دنیا کا مال جس قدر بھی زیادہ ہو۔آخرت کے مقابلے میں بالکل حقیر ہے۔وَمَا ٱلۡحَيَوٰةُ ٱلدُّنۡيَآ إِلَّا مَتَٰعُ۔یہ دنیا کی زندگی تو تھوڑا سا برتنے کا سامان ہے قُلۡ مَتَٰعُ ٱلدُّنۡيَا قَلِيلٌ۔آپ کہ دیں دنیا کا سارا مال واسباب آخرت کے مقابلے میں بالکل قلیل ہے۔لہذا دنیا کے حقیر مال کو ناجائز ذرائع سے حاصل کرنے والوں کو آخرت میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔وَلَا يُكَلِّمُهُمُ ٱللَّهُ اور اللہ ان سے شفقت ومہربانی کے ساتھ کلام نہیں کرے گا۔غصے اور باز پرس کی صورت میں تو ضرور کلام کرے گا۔مگر لطف وکرم کے ساتھ گفتگو نہیں فرمائے گا وَلَا يَنظُرُ إِلَيۡهِمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ اور نہ نگاہ شفقت سے ایسے لوگوں کی طرف دیکھے گا۔وَلَا يُزَكِّيهِمۡ اور ان کو پاک بھی نہیں کرے گا۔یہ ہمیشہ نجاستوں میں لت پت رہیں گے۔وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٞ ﴿٧٧﴾ اور وہ عذاب الیم کا شکار ہوں گے۔

مذکورہ افراد کے برعکس دوسرے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔اور یہ دو طرح کے لوگوں کو شامل ہے ایک تو وہ لوگ جو عہد الہٰی اور اپنی قسموں کو پس پشت ڈال کر تھوڑے سے دینی مفادات کے لئے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان نہیں لائے۔دوسرے وہ لوگ ہیں جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سودا بیچتے یا کسی کا مال ہڑپ کرجاتے ہیں جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔مثلاً نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ "جو شخص کسی کا مال ہتھیانے کے لئے جھوٹی قسم کھائے، وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ اس پر غضب ناک ہوگا" (صحيح بخاري) نیز فرمایا: "تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا، نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا،

ان میں ایک وہ شخص ہے جو جھوٹی قسم کے ذریعے سے اپنا سودا بیچتا ہے"۔(صحیح مسلم) اسلام کے فلسفہ اخلاق میں ایفائے عہد یا قول وقرار کی پابندی کی بہت اہمیت وفضیلت بیان ہوئی ہے۔خود اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: "بے شک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔" (آل عمران:9،الرعد:31) چناں چہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے قول وفعل میں سچا ہے اسی طرح وہ اپنے بندوں سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ اپنے وعدوں اور قرار کو پورا کرنے کی حتی الامکان پابندی کریں اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی کے مرتکب نہ ہوں۔انسانوں کے مابین عہد کی پابندی،خواہ وہ وقت کی ہو،لین دین کی ہو،سیاسی امور میں ہو،معاشرتی معاملات کے ضمن میں ہو یا معاشی امور سے متعلق ہو،ہر پہلو اور ہر جہت سے عہد وپیماں کی پابندی لازمی اور ناگزیر ہے۔اللہ رب العزت ہمیں عہد کرنے سے پہلے سوچنے اور عہد کرتے وقت خلوص نیت اور بعد میں عہد کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

انبیاء کی بعثت انسانیت کی سب سے اہم ضرورت

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا
هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ
عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ
وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰـكِنۡ
كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا
يَاۡمُرَكُمۡ اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرۡبَابًا ؕ اَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡكُفۡرِ بَعۡدَ اِذۡ اَنۡتُمۡ
مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۰﴾

تحریفِ لفظی، تحریفِ معنوی کا معنی ومفہوم

وَاِنَّ	اور بیشک		مِنۡهُمۡ		ان میں سے
لَفَرِيۡقًا	البتہ ایک گروہ (ایسا) ہے		يَّلۡوٗنَ		(جو) مروڑتے ہیں
اَلۡسِنَتَهُمۡ	اپنی زبانیں		بِالۡكِتٰبِ		کتاب (پڑھنے) کے ساتھ
لِتَحۡسَبُوۡهُ	تاکہ تم اسے سمجھو		مِنَ الۡكِتٰبِ		کتاب میں سے
وَمَا	حالانکہ نہیں ہے	هُوَ	وہ	مِنَ الۡكِتٰبِ	کتاب میں سے

وَيَقُوْلُوْنَ		اور وہ کہتے ہیں (کہ)	هُوَ		وہ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ		اللہ کی جانب سے ہے	وَمَا		حالانکہ نہیں ہے
هُوَ		وہ	مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ		اللہ کی جانب سے
وَيَقُوْلُوْنَ	اور وہ کہتے ہیں	عَلَى اللّٰهِ	اللہ پر	الْكَذِبَ	جھوٹ
وَهُمْ		حالانکہ وہ	يَعْلَمُوْنَ		وہ جانتے ہیں۔(78)

ارشاد ہوتا ہے وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اللہ کی کتاب زبان کو مروڑ کر پڑھتا ہے لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ، تا کہ تم گمان کرو کہ یہ اللہ کی کتاب میں سے ہے وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ، حالانکہ وہ اللہ کی کتاب میں سے نہیں ہے۔ اہل کتاب کی اس قبیح حرکت کی مثال سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔جب یہ لوگ حضور کی مجلس میں آتے تھے۔تو لفظ رَاعِنَا کی بجائے زبان کو گھما کر رَاعِيْنَا کہتے تھے حالانکہ دونوں لفظوں کے معانی میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔راعنا کا معنی ہے کہ حضور! ہماری طرف توجہ فرمائیں، اور راعینا کا معنی چرواہا یا احمق ہے۔اس طرح وہ لوگ رسول مقبول ﷺ کی توہین کا ارتکاب کرتے تھے، یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ کتنے خائن لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب اور نبی کے ساتھ بھی خیانت کرتے ہیں۔تحریف کا بنیادی مطلب کسی کلام، عبارت یا اصول کو اس کے اصل مقصد سے پھیر دینا ہے۔اس کی دو بنیادی اقسام ہیں: تحریفِ لفظی: اس سے مراد متن میں الفاظ کو تبدیل کرنا، گھٹانا، بڑھانا، یا ان کی جگہ بدلنا ہے۔یعنی عبارت کی اصل ساخت ہی بدل دی جائے۔تحریفِ معنوی: اس میں الفاظ اپنی جگہ پر درست رہتے ہیں، لیکن ان کا مفہوم اور معنی اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے جو کلام کرنے والے کے اصل ارادے یا منشا کے خلاف ہو۔

مسلمانوں میں اہل بدعت بھی اس بیماری کا شکار ہیں۔یہ قرآن پاک کے الفاظ تو تبدیل نہیں کر سکے مگر مطلب سارا الٹ پلٹ کر دیا ہے۔جس آیت سے چاہتے ہیں، اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔دیکھئے میلاد کا موسم آتا ہے۔پہاڑیاں بنائی جاتی ہیں۔پوچھو بھائی یہ پہاڑیاں کیسی ہیں،

کہتے ہیں قرآن میں صفا و مروہ پہاڑیوں کا ذکر آیا ہے اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ کہ یہ پہاڑیاں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس قسم کی باتیں قرآن پاک میں صریح تحریف ہے۔ قطعاً ناجائز اور گمراہی کا باعث ہے۔ باقی رہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ مبارکہ کا ذکر یا آپ ﷺ کے اوصاف ومحاسن اور عبادات ومعاملات کا ذکر حتی کہ جس چیز کی ادنی نسبت بھی نبی کریم ﷺ کی جانب ہو اس کا ذکر یقیناً فعل مستحسن اور باعثِ اجر وثواب ہے، آپ ﷺ کی دنیا میں آمد دنیا کے لیے ایک عظیم الشان نعمت ہے، اندھیروں میں ایک روشنی ہے، ایک مسلمان کا خوش ہونا فطری امر ہے، جس سے انکار ممکن نہیں، البتہ اس پر خوش ہونے کا وہی طریقہ اختیار کرنا جائز ہے جو محسن کائنات ﷺ سے ثابت ہو، یا صحابہ وتابعین نے اس پر عمل کیا ہو، یہی آپ ﷺ کی آمد کے مقصد کی حقیقی پیروی ہے، چوں کہ مروجہ میلاد کا ثبوت قرآن وحدیث اور صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ائمۂ مجتہدین میں سے کسی سے نہیں ہے، بلکہ یہ ساری چیزیں بعد کے لوگوں کی ایجاد کردہ ہیں، اور بدعات میں شامل ہیں، لہٰذا ان کا ترک کرنا لازم ہے۔ "بدعت" اس عمل کو کہا جاتا ہے جسے نیک کام سمجھ کر کیا جائے، اس کا التزام ہو، اس کے نہ کرنے پر نکیر ہو، اور وہ ایسا عمل ہو کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین کرام اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے زمانے میں اس عمل کی ضرورت ہونے کے باوجود وہ اس پر عمل نہ کریں، یا اس طرح عمل نہ کریں جس کیفیت کے ساتھ اِس دور میں لازم سمجھا جارہا ہے۔ اب دیکھیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو ہم سے بہت سے زیادہ نیکیوں کے حریص، ہم سے زیادہ عبادات کا شوق رکھنے والے اور ہم سے زیادہ آپ ﷺ کے عاشق صادق تھے، انہوں نے اس عمل کو اختیار نہیں کیا، جب کہ انہیں ہم سے زیادہ اس کی ضرورت تھی، اور وہ چاہتے تو یہ کرسکتے تھے، لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ ﷺ سے یہ نہیں سیکھا، حال آں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضورِ اکرم ﷺ کا مزاج سمجھتے تھے، اس لیے عشق ومحبت کے باوجود انہوں نے ایسا عمل نہیں کیا جو حضور ﷺ کو ناپسند ہو، اور حقیقی محبت یہی ہے کہ جس میں محبوب کی راحت رسانی ہو، یہ کمالِ محبت نہیں کہ آدمی اپنی چاہت پوری کر کے محبوب کو تکلیف پہنچائے

اور پھر اسے اپنی محبت کا تقاضا کہے۔ولادت کی خوشی میں یوں کرنا چاہیے کہ آپ کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے کا عزم کرلیں، یہ حقیقی محبت ہے، دن اور وقت متعین کیے بغیر آپ کی دنیا میں آمد پر اللہ کا شکرادا کرنے کے لیے شکرانہ کے نوافل ادا کرلیں، روزے رکھیں، کثرت سے انفرادی طور پر اخلاص کے ساتھ درود شریف پڑھ کر آپ کو اس کا ثواب پہنچائیں، اس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ دونوں ہی خوش ہوں گے۔اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے: شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کی کتاب ''اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم،ص:86 تا98'' ملاحظہ فرمائیں۔

فرمایا اس قسم کی لفظی و معنوی تحریف کرکے، وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللّٰهِ کہتے ہیں۔کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔اللہ نے ارشاد فرمایا وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللّٰهِ ۔حالانکہ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔غلط معانی اور الفاظ کو اللہ کی طرف منسوب کرنا بدترین قسم کی خیانت ہے۔اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔اسی لیے فرمایا۔وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ، وہ اللہ پر افترا باندھتے ہیں۔اور کتمانِ حق بھی کرتے ہیں۔اس طرح یہ لوگ الفاظ تو اب نہیں بدل سکتے مگر مفہوم بدل کر تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے ہیں۔آج کل بھی ایسے لوگ مذہبی سکالروں کے نام سے مشہور ومعروف ہیں جو قرآن کی آیتیں پڑھ کر یونہی بہت سے لوگوں کو سود، پردے، اسلامی سزاؤں اور دیگر کئی چیزوں کے بارے میں کلام کرتے سنا ہے وہ بھی قرآن پڑھتے ہیں اور درمیان میں اصل اسلامی احکام میں ردو بدل کرتے ہوئے اپنی بات اس انداز میں شامل کرتے ہیں کہ سننے والا سمجھے کہ شاید یہ بھی قرآن میں ہی ہے حالانکہ یہ واضح طور پر دھوکہ اور فریب ہوتا ہے، یہ صریح جھوٹ ہوتا ہے۔وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۷۸۔حالانکہ وہ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔بعض باطنی فرقے بھی اس قسم کی تحریف میں ملوث ہیں۔انہوں نے حج سے مراد پیر کی زیارت لیا ہے۔روزہ کا مطلب یہ ہے کہ پیر صاحب جو راز بتائیں اسے چھپا کر رکھا جائے۔یہ صریحاً تحریف ہے۔الفاظ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کا مفہوم بھی وہی لینا چاہئے۔جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے۔اور جس کی وضاحت اللہ کے نبی نے کی۔یا نبی کے صحابہ یا آئمہ دین نے کی، جنہوں نے حقیقتاً اس کا مطلب سمجھا ہے۔اگر

آیات قرآنی کا مطلب وہ لیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے تو درست ہے، ورنہ سراسر گمراہی ہوگی۔ اللہ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہوگا۔

بشریت انبیاء انسانیت کا اعلیٰ ترین معیار

مَا كَانَ	نہیں ہے لائق	لِبَشَرٍ	کسی بشر کے لیے

اَنْ	(یہ) کہ	يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ	دے اُسے اللہ	الْكِتٰبَ	کتاب
وَالْحُكْمَ	اور حکم	وَالنُّبُوَّةَ	اور نبوت	ثُمَّ	پھر
يَقُوْلَ	وہ کہے	لِلنَّاسِ	لوگوں سے	كُوْنُوْا	تم ہو جاؤ
عِبَادًا	بندے	لِّيْ	میرے	مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ کو چھوڑ کر

وَلٰكِنْ	اور لیکن	كُوْنُوْا	(وہ تو کہے گا) تم ہو جاؤ
رَبّٰنِيّٖنَ	اللہ والے	بِمَا	بوجہ اس کے کہ
كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ	تم سکھاتے ہو	الْكِتٰبَ	کتاب
وَبِمَا	اور بوجہ اس کے کہ	كُنْتُمْ	ہو تم (خود بھی)

تَدْرُسُوْنَ	تم پڑھتے ہو۔(79)

مَا كَانَ لِبَشَرٍ کسی بشر یا انسان کی یہ شان نہیں ہے۔ کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے۔ بشر سے مراد انسان، آدمی یا آدم کی اولاد ہے۔ حضرت آدم (علیہ السلام) ابوالبشر یعنی تمام انسانوں کے باپ ہیں اس لحاظ سے تمام انبیاء کرام بھی انسان ہیں مشرکین کا یہ بالکل غلط عقیدہ ہے کہ نبی بشر نہیں ہوتا اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب عطا کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کتاب اس کو دیتا ہے جس کو منصب نبوت عطا کرتا ہے اور یہ سب سے بلند مرتبہ ہے جو کسی انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ فضیلت والی اور کوئی چیز نہیں تمام اولیاء، عابد، زاہد سب نبی سے کم تر درجہ میں ہیں۔ نبوت کا مقام سب سے اعلی ہے اور یہ مقام اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو عطا فرمایا اور

آپ کو قرآن پاک جیسی کتاب عطا کی۔انبیاء کرام (علیہم السلام) صرف انسان ہی نہیں تھے، بلکہ وہ اخلاق، کردار، عقل، اور روحانیت کے اعتبار سے انسانیت کے معراج اور بلند ترین مقام پر فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام برائیوں اور خطاؤں سے معصوم (محفوظ) رکھا تاکہ وہ نوعِ انسانی کے لیے بہترین عملی نمونہ بن سکیں۔ایک انسان ہونے کے باوجود، انہیں یہ امتیازی اعزاز حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی، انہیں لوگوں کی رہنمائی کے لیے چنا، اور معجزات سے نوازا۔خلاصہ کلام یہ کہ وہ کامل ترین انسان تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق تک پیغام پہنچانے اور صراطِ مستقیم پر چلانے کے لیے منتخب فرمایا۔فرمایا۔جس انسان کو اللہ کتاب عطا کرے وَالْحُكْمَ اور حکم عطا کرے۔حکم کا معنی فیصلہ بھی ہوتا ہے اور علم۔آگے فرمایا وَالنُّبُوَّةَ یعنی ایسا شخص جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکم کے علاوہ نبوت بھی عطا فرمادے۔اس کی یہ شان نہیں ہے ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ کہ وہ لوگوں سے کہے كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ اللہ کے علاوہ میرے بندے بن جاؤ۔یہ بات ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تو نبوت اور رسالت عطا فرمائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلانے کی بجائے اپنی بندگی کی طرف دعوت دے۔یا کسی دوسرے انسان یا کسی بھی مخلوق کی عبادت کی تلقین کرے۔یہ نہیں ہوسکتا اگر ایسی بات ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ، اللہ کا انتخاب ہی درست نہیں تھا۔چنانچہ اللہ تعالیٰ پر جہالت لازم آئے گی (نعوذ باللہ) کہ اس نے ایسے شخص کو نبی بنایا جو اس نبوت کا اہل نہیں تھا۔نبی کا منصب تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کاربند ہو اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دے۔دنیا کے معاملات میں بھی جب کسی شخص کو وزارت یا گورنری کے عہدہ پر فائز کیا جاتا ہے۔تو اس سے توقع ہوتی ہے۔کہ وہ حکومت کی پالیسی کے مطابق کام کرے گا۔اگر کوئی شخص خلاف کرے تو اسے ایک منٹ کے لیے کسی اعلیٰ عہدے پر برداشت نہیں کیا جاتا۔ اللہ کا نبی تو اللہ کا کامل وفادار ہوتا ہے۔دنیا میں منشائے ایزدی کی تکمیل اس کا فرض ہوتا ہے۔وہ اللہ کے علاوہ اپنی یا کسی دوسری مخلوق کی عبادت کی دعوت کیسے دے سکتا ہے۔انبیاء علیہم السلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ان میں موجود بشریت کے تمام تقاضے بہترین طور پر سنور جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی تربیت ہی ایسی کرتا ہے۔جس سے ان کے تمام قوی درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ ان سے ایسی بات کا سرزد ہونا جو منشائے الٰہی کے خلاف ہو، ناممکن ہے۔لہٰذا ان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ غیر اللہ کی طرف دعوت دیں۔

رَبّٰنِيّٖنَ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

فرمایا: وَلٰكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ رب والے بن جاؤ۔شیخ الہند نے یہ ترجمہ کیا ہے۔اللہ والے ہو جاؤ رَبّٰنِيّٖنَ۔رب سے مشتق ہے۔جس میں ن اور ی مبالغے کے آتے ہیں بعض ربی بھی کہتے ہیں۔اس کا معنیٰ بھی وہی ہے۔دوسرے مقام پر ربیون کثیر۔کے الفاظ آئے ہیں۔ربّانی" کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم اللہ والا: مفسرین کے مطابق" ربّانی" وہ شخص ہے جس کی نسبت اللہ کی ذات سے جڑ جائے، جو دین الٰہی سے گہری وابستگی رکھتا ہو اور ہر وقت اللہ کی رضا کی جستجو میں رہے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ ربّانی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو حکمت کی باتیں سکھائیں اور ان کی درست اور بہترین تربیت کریں۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ تربیت کے مادے سے ہے۔اور معنی یہ ہے کہ دوسروں کی تربیت کرنے والے ہو۔اور دوسروں کو خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلانے والے ہو۔یعنی ایسے اللہ والے بن جاؤ، جو علم، عقیدے اور عمل میں درجہ کمال پر ہوں۔فرمایا اللہ کا نبی تو کہے گا، اللہ والے ہو جاؤ، رب والے ہو جاؤ۔بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اس وجہ سے کہ تم کتاب سکھلاتے ہو۔اور کتاب سکھلانے والے کی لازماً اصلاح ہونی چاہئے۔اس میں خالص توحید اور جذبہ عبادت ہونا چاہئے۔بلکہ اسے دوسروں کی اصلاح بھی کرنی چاہئے وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۷۹﴾ اور اس وجہ سے کہ تم خدا کی کتاب پڑھتے ہو۔اس کا بھی تقاضا ہے کہ تم اللہ والے بن جاؤ۔یہ آیت عیسائیوں (نصاریٰ) کے اس نظریے کی تردید میں نازل ہوئی تھی جس میں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا مانتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ کسی بھی نبی یا پیغمبر کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں کو اپنے سامنے جھکائے یا اپنی عبادت کرنے کو کہے، بلکہ ہر نبی کی دعوت یہی ہوتی ہے کہ لوگ اللہ کے خالص بندے

(ربّانی) بنیں۔اس آیت سے ربّانی شخصیت کے اہم اوصاف حاصل کرنے کا سبق ملتا ہے کہ 1 اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنا اور ہر قسم کے شرک سے پاک ہونا۔2 دین کی سمجھ (حکمت) کے ذریعے خود کو سنوارنا اور دوسروں کو نیکی کی طرف لانا 3 ہر کام میں اللہ کی خوشنودی کو مقدم رکھنا۔

مخلوق کی طرف عبدیت کی غلط نسبت (شرک)

وَلَا يَأْمُرَكُمْ		اور نہیں حکم دے گا وہ تمہیں (اس بات کا بھی)	
اَنْ تَتَّخِذُوا	کہ تم بنالو	الْمَلٰٓئِكَةَ	فرشتوں کو
وَالنَّبِيّٖنَ	اور نبیوں کو	اَرْبَابًا	پروردگار
اَيَاْمُرُكُمْ	کیا وہ تمہیں حکم دے گا	بِالْكُفْرِ	کفر کا
بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ	بعد اس کے کہ تم (ہو چکے)	مُّسْلِمُوْنَ	مسلمان۔(80)

فرمایا: وَلَا يَأْمُرَكُمْ اللہ کا نبی تمہیں ہرگز یہ حکم نہیں دے گا کہ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ط کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو۔جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے کیا۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔انہوں نے اپنے پیروں اور مولویوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا۔گذشتہ دروس میں گزر چکا ہے۔کہ عدی بن حاتم طائی نے کہا۔کہ حضور! ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے ان کو رب نہیں بناتے تھے۔آپ نے فرمایا کہ جس چیز کو تمہارے پیر اور عالم حرام کہتے ہیں تم حرام سمجھتے ہو، حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ حلال ہے اور جس چیز کو وہ حلال کہتے ہیں تم حلال سمجھتے ہو حالانکہ وہ اللہ کے ہاں حرام ہے۔یہی رب بنانا ہے۔جب تحلیل وتحریم کا منصب غیر اللہ کے سپرد کردیا جائے تو انہیں رب بنانے کے مترادف ہے۔کسی کو سجدہ کیا جائے، نذرونیاز پیش کی جائے، حاضروناظر سمجھا جائے علیم کل سمجھا جائے، مافوق الاسباب، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، یہی شرک ہے۔اس قسم کا جو بھی عقیدہ اللہ کے علاوہ غیر کی طرف منسوب کیا جائے گا شرک ہوگا۔

آیت کا استعجابی انداز

فرمایا پیغمبر کبھی یہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں یا انبیاء کو رب بناؤ اَيَأْمُرُكُم بِالْكُفْرِ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے سکتا ہے؟ بَعْدَ إِذْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝٨٠ ۔ باوجود اس کے کہ تم فرمانرداری میں اختیار کر چکے ہو۔ اللہ کی وحدانیت کو اپنا چکے ہو۔ جب تم اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آچکے ہو تو پھر وہ تمہیں ایسا حکم کیسے دے گا۔ جس سے تم پھر کفروشرک کی تاریکیوں میں غرق ہو جاؤ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اللہ کے نبی سے یہ توقع ہرگز نہیں ہوسکتی آگے ارشاد ہے۔ یعنی کیا ایک سچا نبی، جس کا مقصد ہی انسانوں کو اللہ سے ملانا ہو، وہ تمہیں مسلمان ہونے کے بعد دوبارہ کفر (شرک) کی طرف بلائے گا؟ ایسا قطعی ممکن نہیں۔ اہل کتاب نے نبی (علیہ السلام) سے کہا تھا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی عبادت کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ قانون بتلایا کہ اللہ کا نبی نہ اپنی عبدیت کی طرف دعوت دیتا ہے اور نہ کسی غیر اللہ کی۔ مسیح (علیہ السلام) نے بھی ربوبیت کی نسبت اللہ ہی کی طرف کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ میرا اور تمہارا سب کا رب اللہ ہے۔ میں بھی اسی کی عبادت کرتا ہوں تم بھی اسی کی عبادت کرو اللہ کا ہر نبی یہی دعوت دے گا۔ کہ اللہ والے بن جاؤ۔ رب والے بن جاؤ۔ اس کے سوا کسی انسان کی پوجا نہ کرو۔ یہ آیت کریمہ اس باطل عقیدے کی تردید کرتی ہے جس کے تحت کچھ مذاہب کے پیروکاروں نے بزرگ ہستیوں (جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننا) یا فرشتوں کو معبود یا خدا کا درجہ دے دیا۔ اسلام واضح کرتا ہے کہ انبیاء اور فرشتے اللہ کے انتہائی مکرم اور برگزیدہ بندے ہیں لیکن وہ خالق (رب) نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ دین اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوم کو صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے کا درس دیا اور اس بات سے منع کیا کہ کسی بھی انسان یا فرشتے کو اللہ کی صفات میں شریک کیا جائے۔ اطاعت اور محبت ہر نبی کی فرض ہے، مگر ان کی بندگی (عبادت) کرنا یا انہیں حاجت روا و مشکل کشا سمجھنا شرک ہے۔ اللہ کریم! ہم کو اپنی ذات کی صحیح معرفتِ توحید عطا فرما، اے اللہ العالمین اپنے رسول کریم ﷺ کی سچی محبت، سچی اطاعت، سچی فرمانبرداری عطا فرما، اے اللہ

کریم! اسلام وایمان کی صراطِ مستقیم پر تازندگی قائم رکھ، اللہ کریم ہر طرح کی کجی وگمراہی سے ہماری حفاظت فرمااور تاحیات اپنی عبادت و بندگی کی توفیق مرحمت فرما! آمین یارب العٰلمین۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے کس بات کا وعدہ لیا؟

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ
رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ
عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ط قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ط قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾
فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ
اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

اللہ تعالیٰ کے تین عہد

وَاِذْ	اور (یاد کرو) جب	اَخَذَ اللّٰهُ	اللہ نے لیا	مِيْثَاقَ	عہد
النَّبِيّٖنَ	(تمام) نبیوں سے	لَمَآ	البتہ جو کچھ		
اٰتَيْتُكُمْ	میں تمہیں دوں	مِّنْ كِتٰبٍ	کتاب سے		
وَّحِكْمَةٍ	اور حکمت (سے)	ثُمَّ	پھر	جَآءَكُمْ	تمہارے پاس آئے
رَسُوْلٌ	کوئی رسول	مُّصَدِّقٌ	جو تصدیق کرتا ہو		

لِمَا	اس کی جو	مَعَكُمْ	تمہارے پاس ہے
لَتُؤْمِنُنَّ	(تو) تم ضرور ایمان لانا	بِهٖ	اس (نبی) پر
وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ	اور تم ضرور اس کی مدد کرنا	قَالَ	(اللہ نے) فرمایا
ءَ	کیا	اَقْرَرْتُمْ	تم اقرار کرتے ہو
وَاَخَذْتُمْ	اور تم قبول کرتے ہو		
عَلٰى ذٰلِكُمْ	اس پر	اِصْرِيْ	میرا عہد
قَالُوْٓا	انہوں نے کہا		
اَقْرَرْنَا	ہم نے اقرار کیا	قَالَ	(اللہ نے) فرمایا
فَاشْهَدُوْا	پس تم گواہ رہنا		
وَاَنَا	اور میں (بھی)	مَعَكُمْ	تمہارے ساتھ ہوں
مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ	گواہوں میں سے (81)		

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین طرح کے عہد لئے ہیں۔ایک کا ذکر سورہ اعراف میں (اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۔ ۱۷۲:۷) کے تحت کیا گیا ہے، اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے کیونکہ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر ہے، جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی۔دسرے کا ذکر سورہ آل عمران کی آیت (وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۔ ۱۸۷:۳) سے کیا گیا، یہ عہد صرف اہل کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، بلکہ صاف اور واضح طور پر بیان کریں۔تیسرے عہد کا بیان وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ اور جب اللہ نے سب نبیوں سے پختہ عہد لیا کہ میں کتاب وحکمت میں سے جو کچھ تمہیں دوں۔میثاق سے کیا مراد ہے اور یہ کہاں ہوا؟ میثاق کہاں ہوا؟ یا تو عالم ارواح میں ہوا یا دنیا میں بذریعہ وحی ہوا، دونوں احتمال ہیں۔(بیان القرآن) اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۔ قَالُوْا بَلٰى ۔ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا ہونے والی نسل آدم کو عالم ارواح میں متمثل فرما کر ان سب سے سوال کیا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں" گویا یہ عہد اللہ نے اپنی الوہیت اور ربوبیت کے اقرار کے لیے اس دنیا میں آنے سے پہلے لیا تھا۔اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کا یہ

بندوبست کیا کہ ہرقوم کے لئے مختلف اوقات میں نبی بھیجے جاتے رہے تاکہ لوگوں کو نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرتے رہیں۔اس کے ساتھ ہی یہ وعدہ بھی اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے لیا ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جواس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔کہ تم اپنی قوم کو یہ سبق بھی اچھی طرح دے دینا کہ جو نبی تمہارے پاس آئے تو اس کی کتاب اور شریعت تم خود بھی مانو گے اور تمہاری امت بھی اس پر پورا پورا یقین کرے گی تو اس پر تمام نبیوں نے اللہ سے وعدہ کیا کہ جو بھی نبی ان کے بعد آئے گا وہ اس پر ایمان لائیں گے بلکہ اس کی پوری پوری مدد بھی کریں گے۔مزید تاکید کے لئے اللہ رب العزت نے دوبارہ پوچھا؟ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری عہد قبول کیا؟ ”اِصْرٌ“ کسی چیز کے باندھنے اور زبردستی بند کرنے کو کہتے ہیں، یعنی بھاری بوجھ۔اسی طرح مؤکد عہد کو بھی ”اِصْرٌ“ کہتے ہیں، کیونکہ وہ انسان کو باندھ دیتا ہے۔کیا تم اپنے عہد کا اقرار کرتے ہو؟ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ سب نبیوں نے عرض کیا کہ ہاں ہم اقرار کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۱﴾ اس عہد پر تم بھی گواہ رہو اور تمہارے ساتھ میں بھی گواہ ہوں۔جب محمد ﷺ آئے تو یہود و نصاریٰ نے آپ کو ماننے سے انکار کر دیا۔حالانکہ انکے پاس آپ کے آنے کی تمام نشانیاں موجود تھیں۔

ان آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے یہ پختہ عہد لیا کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرا نبی آئے جو یقیناً پہلے انبیاء اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہوگا، تو پہلے نبی کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے نبی کی سچائی اور نبوت پر ایمان خود بھی لائے اور دوسروں بھی اس کی ہدایت کرے، قرآن کے اس قاعدہ کلیہ سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں بھی اسی طرح کا عہد انبیاء علیہم السلام سے لیا ہوگا آیت میں رسول سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور کوئی نبی بھی

ایسا نہیں گزرا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات والا صفات کے بارے میں تائید ونصرت اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کا عہد نہ لیا ہو، اور کوئی بھی ایسا نبی نہیں گزرا جس نے اپنی امت کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے اور تائید ونصرت کی وصیت نہ کی ہو، اور اگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعثت انبیاء کے زمانے میں ہوتی تو ان سب کے نبی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی ہوتے اور وہ تمام انبیاء آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت میں شمار ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان محض نبی الامت ہی کی نہیں ہے بلکہ نبی الانبیاء کی بھی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر آج موسیٰ (علیہ السلام) بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ جب عیسیٰ (علیہ السلام) نازل ہوں گے تو وہ بھی قرآن حکیم اور تمہارے نبی ہی کے احکام پر عمل کریں گے۔ (تفسیر ابن کثیر) اس سے معلوم ہوا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت عامہ ہے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شریعت میں سابقہ تمام شریعتیں مدغم ہیں، اس بیان سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً کا صحیح مفہوم بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ پچھلے تمام انبیاء کرام (علیہم السلام) کا تعلق ایک مخصوص علاقے، نسل، یا زمانے تک محدود ہوتا تھا۔ لیکن حضرت محمد ﷺ کی نبوت کسی خاص قبیلے یا خطے کے لیے نہیں، بلکہ قیامت تک آنے والی پوری انسانیت اور جن وانس کے لیے ہے اس حدیث کا مطلب یہ سمجھنا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے سے قیامت تک کے لئے ہے صحیح نہیں، بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کا زمانہ اتنا وسیع ہے کہ آدم (علیہ السلام) کی نبوت سے پہلے شروع ہوتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے ہیں کہ " مَتَى وَجَبَتْ لَكَ النُّبُوَّةُ قَالَ وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ " ترمذی، السنن، ج5 ص585، رقم: 3609 آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوگئی تھی؟ تو آقا ﷺ نے فرمایا: کہ ابھی حضرت آدم علیہ السلام کا بشری خمیر ابھی

روح اور جسم کے درمیان تھا۔محدثین کرام کے مطابق، اس حدیث سے آپ ﷺ کی عظمت، شان اور ازل سے مقامِ نبوت پر فائز ہونے کا اظہار ہوتا ہے،اسی طرح محشر میں شفاعت کبری کے لئے پیش قدمی کرنا اور تمام بنی آدم کا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شب معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی امامت کرانا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اسی سیاست عامہ اور امامت عظمیٰ کے آثار میں سے ہے۔(معارف القرآن)

عربی زبان میں فَسَق کا مطلب ومفہوم

فَمَنۡ	پھر جو کوئی	تَوَلّٰى	روگردانی کرے گا
بَعۡدَ ذٰلِكَ	اس (عہد) کے بعد	فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	تو وہی لوگ ہیں
الۡفٰسِقُوۡنَ		نافرمان۔(82)	

فرمایا کہ پختہ عہد کرنے کے بعد۔ فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ۔جس نے اعراض کیا اس کے بعد یعنی عہد کی پابندی نہ کی۔ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔تو ایسے لوگ فاسق اور نافرمان ہوں گے۔فاسق نافرمان، منافق اور کافر کو بھی کہا گیا ہے۔عربی زبان میں "فَسَق" کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کا اپنے دائرے یا راستے سے نکل جانا۔قرآنی اصطلاح میں جب پھل اپنے چھلکے (یا گودے) سے باہر نکلتا ہے، تو اسے "فسق" کہا جاتا ہے۔اسی مناسبت سے جو انسان اللہ کی بندگی کے دائرے اور سیدھے راستے سے نکل کر گناہوں کی طرف چلا جاتا ہے، اسے فاسق کہا جاتا ہے۔قرآنِ مجید میں یہ لفظ مختلف سورتوں میں گناہگاروں، نافرمانوں، اور احکامِ الٰہی کا مذاق اڑانے والوں کے لیے استعمال ہوا اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکاری ہے تو یہ بنیادی فسق ہے۔انسان کافر ہو جائے گا، ورنہ معصیت کا مرتکب خصوصاً کبیرہ گناہ کا مرتکب فاسق ہوتا ہے فرمایا اس عہد کو توڑنے والا فاسقوں میں شمار ہوگا۔اس آیت میں اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) اور دیگر اہل مذہب کو تنبیہ ہے کہ بعثت محمدی کے بعد بھی ان پر ایمان لانے کے بجائے اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنا اس عہد کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے واسطے سے ہر امت سے لیا اور اس عہد سے انحراف کفر ہے۔

فسق یہاں کفر کے معنی میں ہے کیونکہ نبوت محمدی سے انکار صرف فسق نہیں سر اسر کفر ہے۔

اللہ کا دین اور فطرت

اَفَغَيْرَ	کیا؟ پھر سوائے	دِيْنِ اللّٰهِ	اللہ کے دین کے		
يَبْغُوْنَ	یہ (کوئی اور دین) تلاش کر رہے ہیں	وَلَهٗٓ	حالانکہ اسی (اللہ) کے		
اَسْلَمَ	فرمانبردار ہیں	مَنْ	جو کوئی (بھی ہے)		
فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں میں	وَالْاَرْضِ	اور زمین (میں)		
طَوْعًا	خوشی سے	وَّكَرْهًا	اور ناخوشی سے		
وَّاِلَيْهِ	اور اسی کی طرف	يُرْجَعُوْنَ	وہ لوٹائے جائیں گے۔(83)		

دنیا کے تمام ادیان و مذاہب میں دین اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی تمام تعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس روش پر سخت تعجب اور تنبیہ فرمائی ہے کہ وہ خالق کائنات اور کائنات کے مسلمہ نظام کو چھوڑ کر باطل راستے کیوں منتخب کرتا ہے فرمایا: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا تو کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کچھ اور تلاش کرتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے خوشی اور ناخوشی سے اسی کا فرماں بردار ہے۔اللہ تعالیٰ نے 'انسان' اور 'جن' کو شرعی احکام کا مکلف بنایا ہے اور ان کو ارادہ و اختیار کی قوت دی ہے؛ اس لیئے دنیا میں وہ اللہ کی فرمانبرداری بھی کر سکتے ہیں اور نافرمانی بھی، اور اس 'ارادہ و اختیار' کی قدرت کی وجہ سے آخرت میں ان سے ثواب و عذاب متعلق ہوگا، باقی دوسری مخلوقات اس قدرت سے محروم ہیں، وہ تکوینی طور پر خدا کی مطیع و فرمانبردار ہیں، چاہے رغبت و شوق کے ساتھ خدا کا حکم بجالائیں، جیسے: فرشتے، یا اس پر مجبور ہوں، جیسے: سورج، چاند، نباتات اور عقل و شعور سے محروم حیوانات، یہ سب خدا کی مرضیات کو پورا کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں، اگر انسان اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا راستہ اختیار کرتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو خدا کی بسائی ہوئی اس بستی سے ہم آہنگ رکھتا ہے، اور اگر خدا کی نافرمانی کرتا ہے تو

گویا نظام کائنات سے بغاوت کی راہ اپناتا ہے۔ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ﴿۸۳﴾ اور وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اللہ کا دین کیا ہے؟ اللہ کا دین صرف اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔ کائنات کی ہر چیز زمین و آسمان، شمس و قمر، ستارے اور سیارے، فرشتے اور ہوائیں غرض جو چیز بھی موجود ہے خواہ یہ اطاعت اضطراری ہو یا اختیاری، بہرحال وہ اللہ کی مطیع فرماں ہے اور اس کے حکم سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتی۔ انسانوں اور جنوں کو کسی حد تک فرمانبرداری اور نافرمانی کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ان سے مطالبہ صرف یہ ہے کہ جن کاموں میں انہیں تھوڑا بہت اختیار دیا گیا ہے ان میں بھی وہ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے کائنات کی تمام اشیاء کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ یعنی جب آسمان و زمین کی ہر چیز، فرشتے، جن و انس وغیرہ اللہ کے قانون فطرت کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور اختیاری وغیر اختیاری طور پر اس کے حکم کے تابع ہیں تو یہ لوگ اس کے قانون شریعت "دِيْنِ اللّٰهِ" کو چھوڑ کر دوسرا راستہ کیوں اختیار کرتے ہیں، انھیں چاہیے کہ اگر آخرت میں نجات چاہتے ہیں تو اللہ کا دین، جو اس وقت رسول اللہ ﷺ لے کر مبعوث ہوئے ہیں، اسے اختیار کر لیں۔ حاصل کلام: جو کائنات اللہ کے آگے جھکی ہوئی ہے، انسان کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے دین حق کو چھوڑ کر اپنی یا کسی اور کی بنائی ہوئی راہ پر چلے۔ اللہ کریم ہم ان عظیم نعمتوں کی سچی اور صحیح قدر دانی کی توفیق عطا فرما، اور ہم کو اپنے نبی پاک ﷺ کا سچا امتی بن کر زندہ رہنا اور اسی پر مرنا نصیب فرما۔ آمین یارب العٰلمین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

کل انبیاء اور رسولوں کی تعداد/ قرآن مجید میں سابقہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت رسول ﷺ کی پیش گوئیاں

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا
نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۸۴ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا
فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۸۵ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا
كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۸۶ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ
النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۸۷

بنی اسرائیل میں مبعوث ہونے والے انبیاء اور رسولوں کی تعداد

قُلْ	کہہ دیجئے	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے	بِاللّٰهِ	اللہ پر
وَمَآ	اور جو	اُنْزِلَ	نازل کیا گیا	عَلَيْنَا	ہم پر
وَمَآ	اور جو	اُنْزِلَ	نازل کیا گیا	عَلٰٓى	اوپر

اِبْرٰهِیْمَ	ابراہیم	وَاِسْمٰعِیْلَ	اور اسمٰعیل	وَاِسْحٰقَ	اور اسحٰق
وَیَعْقُوْبَ	اور یعقوب	وَالْاَسْبَاطِ	اور اُن کی اولاد کے		
وَمَآ اُوْتِیَ	اور جو دیا گیا	مُوْسٰی	موسیٰ	وَعِیْسٰی	اور عیسیٰ
وَالنَّبِیُّوْنَ	اور (دوسرے) انبیاء کو	مِنْ رَّبِّهِمْ	اپنے رب کی طرف سے		
لَا نُفَرِّقُ	نہیں ہم فرق کرتے	بَیْنَ	درمیان		
اَحَدٍ	کسی ایک کے	مِّنْهُمْ	ان میں سے	وَنَحْنُ	اور ہم
لَهٗ	اسی (اللہ) کے	مُسْلِمُوْنَ	فرماں بردار ہیں۔(84)		

فرمایا: قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم تو اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی اور اس پر بھی جو حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور اس کی اولاد پر نازل ہوئی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دو بیٹے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) اور حضرت اسحاق (علیہ السلام) ہیں۔ پہلے حضرت ہاجرہ کے بطن سے اور دوسرے حضرت سارہ سے۔ دونوں اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ اللہ نے ان کو مستقل شریعت دی۔ حضرت یعقوب (علیہ السلام) حضرت ابراہیم کے پوتے اور حضرت اسحاق (علیہ السلام) کے بیٹے ہیں۔ وہ بھی اللہ کے صاحب شریعت نبی ہیں۔ اور پھر حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اسباط یعنی اولاد ہے۔ اس میں سے اللہ نے جس کو نبوت دی، ان پر وحی نازل فرمائی اور ان کو شریعت بھی دی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد میں سے اللہ نے چار ہزار نبی اور رسول مبعوث فرمائے۔ یہ اتنا عظیم خاندان ہے۔ اسباط سے یہی انبیاء اور رسل مراد ہیں جن میں حضرت داود (علیہ السلام) اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) جیسے عظیم پیغمبر مبعوث ہوئے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ایک مشہور روایت (مستدرک حاکم) کے مطابق، دنیا میں کل انبیاء علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، جن میں سے تین سو پندرہ (315) رسول تھے۔ اس کل تعداد میں سے ایک بڑی اکثریت بنی

اسرائیل کے انبیاء کی ہی تھی۔قرآن مجید میں تمام انبیاء علیہم السلام کے نام یا تعداد بیان نہیں کی گئی، بلکہ صرف 25 انبیاء ورسولوں کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے (مثلاً حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام) حضرت الیاس (علیہ السلام) بھی آپ کی اولاد میں سے ہیں تاہم بعض انبیاء علیہم السلام کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔اکثر کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ان تمام انبیاء (علیہم السلام) پر جو چیز نازل کی گئی۔اس پر ہمارا ایمان ہے۔مستند احادیث اور تفاسیر میں انبیاء علیہم السلام کی مکمل فہرست موجود نہیں ہے، تاہم بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور امت کے لیے ہدایت کے لیے نبی بھیجے، اور ہم بحیثیتِ مجموعی ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ اور ان (کتابوں) پر بھی جو حضرت موسیٰ وعیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دی گئیں۔یعنی جو چیز موسیٰ (علیہ السلام) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کو دی گئی اس پر بھی ہمارا ایمان ہے۔حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر تورات جیسی عظیم کتاب نازل کی گئی۔اس کے علاوہ کچھ صحیفے بھی ہیں۔اور عیسیٰ (علیہ السلام) پر اللہ نے انجیل نازل فرمائی۔جسے بگاڑ کر اہل کتاب نے ایک سوبیس انجیلیں بنالیں۔تاہم ہمارا ایمان اس اصلی انجیل پر ہے۔جو سریانی زبان میں نازل ہوئی تھی۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ان کے درمیان کچھ فرق نہیں کرتے یعنی ہم انبیاء اور سل میں کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے، تفریق کرنے کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح بعض انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے اور بعض پر نہ لائے۔اس قسم کی تفریق صریح کفر ہے کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ضروری ہے۔حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر حضور خاتم النبیین (علیہ السلام) تک جتنے بھی نبی اور رسول آئے ہیں۔وہ سب اللہ کے کامل بندے اور برحق نبی ہیں۔انہوں نے اپنے اپنے دور میں مخلوق خدا کو حق کا پیغام پہنچایا۔اللہ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو کتابیں اور شرائع عطا فرمائیں۔ان سب پر ہمارا ایمان ہے۔مگر یہود ونصاری اللہ کے تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان نہیں رکھتے۔مثال کے طور پر دونوں گروہ حضور ختم المرسلین (علیہ السلام) پر ایمان نہیں رکھتے۔لہذا یہ تفریق بین الرسل کے

مرتکب ہو کر کافر ٹھہرے۔اسی طرح یہودی مسیح (علیہ السلام) کو نہیں مانتے۔بلکہ انہیں دجال کہتے ہیں اوران کی تذلیل وتحقیر کرتے ہیں۔مگر ہم بحیثیت مسلمان کسی نبی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔اور یہی ملت ابراہیمی ہے جس کی تعلیم سارے نبی دیتے آئے ہیں۔وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝۸۴ اور ہم اسی اللہ کے تابع فرمان ہیں۔اس آیت میں مسلمانوں کو اصل ہدایت اور ایمان کی تعلیم دی گئی ہے،یعنی قرآن پاک سے پہلے جتنی آسمانی کتابیں اور جتنے انبیاء ورسل آئے، جن میں سے بعض کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں اور بعض کے نہیں آئے،سب پر مجملاً ایمان لایا جائے کہ وہ سب حق ہیں۔ان کے درمیان فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو مان لیا کسی کو نہ مانا، جیسے یہودیوں نے عیسیٰؑ اور محمد ﷺ کو اور نصرانیوں نے آخری پیغمبر ﷺ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ تفصیلی ایمان صرف قرآن پر ضروری ہے،یعنی اس کے ہر حکم کو ماننا اوراس پر عمل کرنا،کیونکہ 1 قرآن پاک آنے سے پہلی تمام کتابیں منسوخ ہوگئیں۔اس لئے پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت پر عمل کرنا ضروری ہے، جیسے کوئی حکومت جب ایک سکہ منسوخ کرکے دوسرا سکہ جاری کرتی ہے تو جو سکہ منسوخ ہو چکا ہو،اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی،نیا سکہ ہی مقبول ہوتا ہے؛ حالاں کہ جو سکہ منسوخ ہو چکا ہے،وہی اپنے زمانہ میں مقبول اور معتبر تھا،اسی طرح جو شریعتیں منسوخ ہو چکیں،گو اپنے عہد میں وہی مقبول اور ہدایت کا مدار تھیں؛ لیکن اب ان کا یہ مقام نہیں رہا،اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلی شریعتیں ناقص تھیں؛ بلکہ بہ تقاضاء مصلحت یہ اسی زمانہ کے لئے موزوں تھیں۔2 پہلے تمام پیغمبر خصوصاً اپنی قوم کی طرف آتے تھے،جب کہ رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے۔پھر پہلی کوئی آسمانی کتاب محفوظ نہیں رہی، بلکہ ان میں تحریف ہوگئی،جب کہ قرآن مجید ہر طرح سے محفوظ ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ تمام انبیاء (علیہم السلام) پر ان کے رب کی طرف سے جو کچھ بھی اتارا گیا ہے۔اس پر ہمارا ایمان ہے۔مسلمانوں کی صداقت کی یہی نشانی ہے۔کہ وہ انبیاء (علیہم السلام) پر نازل ہونے والی تمام کتب کو مانتے ہیں۔مگر یہ یہود ونصاریٰ اللہ کی سب سے عظیم اور آخری کتاب قرآن پاک کو ماننے کے لیے تیار نہیں

ہیں۔کہتے ہیں کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی طرف سے بنا کر لائے ہیں (العیاذ باللہ) یہ اس قدر متعصب لوگ ہیں۔اور یہی ان کے کذب کے دلیل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرماں برداری اور اطاعت کا راستہ

وَمَنۡ		اور جو کوئی	يَّبۡتَغِ		تلاش کرے گا
غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ		سوائے اسلام کے	دِيۡنًا		کوئی اور دین
فَلَنۡ		تو ہرگز نہیں	يُّقۡبَلَ		قبول کیا جائیگا
مِنۡهُ		اس سے	وَهُوَ		اور وہ
فِى الۡاٰخِرَةِ	آخرت میں		مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ	خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔(85)	

فرمایا: وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہو جانے کے بعد جو شخص آپ کی فرماں برداری اور اطاعت کا راستہ چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا، یا کسی پہلے راستے پر چلتا رہے گا، وہ چاہے کتنا توحید پرست کیوں نہ ہو اور پچھلے انبیاء علیہم السلام پر ایمان رکھنے والا ہو، اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی دین داری اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوگی۔ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾ اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں سے ہوگا۔اور وہ آخرت میں نامراد و ناکام ہوگا۔واضح رہے کہ اگرچہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین اسلام تھا، مگر آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اسلام صرف آپ کی پیروی کا نام ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں بھی اب اسلام سے یہی مراد ہوتا ہے، یعنی دور نبوی کے یہود و نصاریٰ کی زبانوں سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپ جو تعلیم لائے ہیں وہ وہی ہے جو سابقہ انبیاء علیہم السلام کی تھی۔اس کے بعد انہوں نے جو مخالفت کی تو اس کی وجہ محض تعصب اور مفاد پرستی تھی۔لہذا ایسے لوگوں کا کوئی عمل بھی قابل قبول نہ ہوگا اور آخرت میں ان کے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے جس کے بدلے انہیں دردناک عذاب برداشت کرنا پڑے گا۔یہود و نصاری کی اسلام دشمنی تو قابل فہم ہے،

وہ تو دوسرا دین ہی تلاش کریں گے۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ آج کا مسلمان بھی اپنے دین پر اعتماد نہیں کرتا۔ آج کے مسلمان بھی یہی سمجھتے ہیں۔ کہ جب تک غیر اقوام کی شاگردی اختیار نہیں کریں گے، ترقی نصیب نہیں ہوگی۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے۔ کہ جب مسلمان اپنے دین پر یقین کرتے تھے، عروج کی بلندیوں پر تھے۔ کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ مگر اب خود مسلمان انگریزوں سے مرعوب ہیں۔ ان کی تہذیب اختیار کررہے ہیں۔ انہی کے لہو ولعب میں مشغول ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پیروان اسلام کے سوا کسی کو فلاح نصیب نہیں ہوسکتی۔ آخرت میں تو سخت نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے۔

مرتد شخص کافر سے زیادہ مجرم

كَيْفَ	کیسے	يَهْدِي اللّٰهُ	ہدایت دے گا اللہ	قَوْمًا	ایسے لوگوں کو
كَفَرُوْا	(جو) کافر ہوگئے	بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ	اپنے ایمان (لانے) کے بعد		
وَشَهِدُوْٓا	اور (اس کے بعد) انہوں نے گواہی دی (اس بات کی)				
اَنَّ الرَّسُوْلَ	کہ بیشک رسول	حَقٌّ	برحق ہیں		
وَّجَآءَهُمُ	اور اُن کے پاس آئیں	الْبَيِّنٰتُ	واضح نشانیاں		
وَاللّٰهُ	اور اللہ	لَا يَهْدِي	ہدایت نہیں دیتا		
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ	ظالم قوم کو۔(86)				

فرمایا كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط اللہ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا اور (اس کے بعد کہ) انھوں نے شہادت دی کہ یقیناً یہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس واضح دلیلیں آچکیں۔ یعنی جو لوگ حق کے پوری طرح واضح ہوجانے اور رسول اللہ ﷺ کے سچا نبی ہونے کے روشن دلائل دیکھنے کے باوجود محض کبر و حسد اور مال و جاہ کی محبت کی بنا پر کفر کی روش پر قائم رہے، یا ایک مرتبہ اسلام قبول کرلینے کے بعد پھر مرتد ہوگئے تو وہ سراسر ظالم و بدبخت ہیں، ایسے

لوگوں کو راہ ہدایت دکھانا اللہ تعالیٰ کا قانون نہیں ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ مرتد شخص کافر سے زیادہ مجرم ہے۔(ابن کثیر، شوکانی)وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٨٦ اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ وضاحت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہٹ دھرم لوگوں کو زبردستی کبھی ہدایت نہیں دیا کرتا۔اس طرح کی زبردستی اس کے دستور کے خلاف ہے۔جس شخص کو اپنی بیماری کا پتہ نہ ہو اس کو تو دوا بتائی جا سکتی ہے؛لیکن جو اپنے بیمار ہونے سے واقف ہو، پھر بھی بہ ضد ہو کہ اپنا علاج نہیں کرائے گا، اس کو دوا بتانے کا کیا فائدہ؟

ابدی خیر اور سکون سے محروم لوگ

اُولٰٓئِكَ		یہ لوگ	جَزَآؤُهُمْ		ان کی سزا(یہ)ہے
اَنَّ	کہ بیشک	عَلَيْهِمْ	ان پر	لَعْنَةَ اللّٰهِ	اللہ کی لعنت ہے
وَالْمَلٰٓئِكَةِ		اور فرشتوں کی	وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ		اور سب لوگوں کی(87)

فرمایا:اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ ایسے لوگوں کا بدلہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان پر اللہ کی بھی لعنت ہو، عربی زبان میں"لعنت" کا اصل معنیٰ اللہ کی رحمت سے دوری، محرومی اور پھٹکار ہے جب کسی پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص اب ابدی خیر اور سکون سے محروم ہو چکا ہے اور اسے خدا کے غضب کا سامنا ہے، یعنی جو لوگ حق کو سمجھ بوجھ کر محض ضد و حسد کی وجہ سے کفر و انکار کرتے ہیں۔ان پر اللہ کی لعنت وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝٨٧ فرشتوں کی بھی اور سب لوگوں کی بھی۔یہاں سب لوگوں سے مراد مسلمان ہیں اور اس لحاظ سے سب لوگ بھی ہو سکتے ہیں کہ اجمالاً ہر شخص جھوٹے بدعہد اور دغاباز پر لعنت بھیجتا ہے اور آخرت میں تو کافر خود بھی ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور اپنے قصور کا الزام دوسرے کے سر تھوپیں گے۔۔اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو حق بات اور کھلے دلائل (جیسے کہ آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت) پہنچ جانے کے بعد بھی کفر کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔چونکہ انہوں نے جان بوجھ کر ہدایت کو ٹھکرا دیا، اس لیے ان کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ انہیں ہمیشہ کے لیے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جائے۔

خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا کے تناظر میں بنیادی پیغام

خٰلِدِیۡنَ	(وہ) ہمیشہ رہیں گے	فِیۡهَا	اس (لعنت) میں
لَا یُخَفَّفُ	نہیں ہلکا کیا جائے گا	عَنۡهُمُ	ان سے
الۡعَذَابُ	عذاب	وَلَا	اور نہ
هُمۡ	انہیں	یُنۡظَرُوۡنَ	مہلت دی جائے گی۔(88)

خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ "وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے، نہ تو ان سے عذاب میں تخفیف (کمی) کی جائے گی اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔ایسی آیات عموماً کفر، شرک اور اللہ کی آیات کا انکار کرنے والوں کے انجام بد کو بیان کرتی ہیں۔دنیا میں حق کا راستہ ترک کر کے اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کو آخرت میں اس ابدی سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جہنم کا عذاب دائمی ہوگا۔کفر اور شرک پر مرنے والوں کے لیے اس جہنم سے نہ کبھی رہائی ہوگی اور نہ ہی موت آئے گی۔ان کی یہ سزا لامتناہی اور ہمیشہ کے لیے ہے۔وَلَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ اور نہ ہی انہیں مہلت دی جائے گی اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان سے نہ تو عذاب کو وقتی طور پر ہٹایا جائے گا، نہ ہی کوئی وقفہ دیا جائے گا، اور نہ ہی انہیں توبہ یا معافی مانگنے کا مزید کوئی موقع یا مہلت ملے گی۔قرآن مجید کی ان آیات کا بنیادی مقصد انسان کو دنیا کی عارضی زندگی میں غافل رہنے سے بچانا، کفر و شرک کی ہلاکت خیزی سے آگاہ کرنا اور اس ابدی اور سخت ترین عذاب سے ڈر کر نیک اعمال کی طرف راغب کرنا ہے۔

توبہ کی قبولیت کا قانون/ سچی توبہ کی قبولیت کی بنیادی شرائط

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٨٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ
كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ
الضَّآلُّونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ
مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۗ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِينَ ﴿٩١﴾

توبہ کے بعد اصلاح کی شرط!

إِلَّا	مگر	الَّذِينَ	وہ لوگ جنہوں نے
تَابُوا	توبہ کی	مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ	اُس کے بعد
وَأَصْلَحُوا	اور (اپنی) اصلاح کرلی	فَإِنَّ اللهَ	تو بلاشبہ اللہ
غَفُورٌ	بہت بخشنے والا	رَّحِيمٌ	نہایت رحم کرنے والا ہے۔(89)

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ اس کے بعد بھی اگر کوئی توبہ کرلے گا تو اس کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے مطلب یہ کہ مرتد ہونے کے بعد بھی اگر کوئی سچے دل سے توبہ کرے گا، تو وہ قبول ہو سکتی ہے۔ جب تک سورج مشرق کی بجائے مغرب کی طرف سے طلوع نہیں ہوتا، توبہ قبول ہوگی، انسان

خواہ کتنا بھی گنہگار ہو۔ پھر یہ ہے کہ توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ۔ وَاَصۡلَحُوۡا اور (اپنی) اصلاح کرلی اصلاح بھی کرلیں اور نیک اعمال انجام دیں۔ کیونکہ اصلحوا میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کیا جائے۔ اگر اللہ کے حقوق یعنی فرائض منجملہ نماز، روزہ وغیرہ قضا ہوا ہے۔ تو اس کو ادا کیا جائے اور اگر بندوں کے حقوق ضائع ہوئے ہیں تو پہلے انہیں ادا کیا جائے یا بندوں سے معاف کرایا جائے۔ اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے، جو غلطی ہوئی ہے، اس کا اعادہ نہ کیا جائے۔ اگر ان شرائط پر پورا اترا، تو توبہ قبول ہوگی فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۸۹﴾ پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ جب اس کی رحمت جوش میں آتی ہے، تو سچے دل سے تائب کی سابقہ برائیاں نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ الغرض! کسی بھی گناہ کی معافی کے لیے درج ذیل شرائط کا مجموعہ ضروری ہے تاکہ توبہ بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت پاسکے 1 جس گناہ سے توبہ کی جارہی ہے اسے اسی وقت چھوڑ دیا جائے 2 اپنے کیے پر دلی افسوس اور شرمندگی ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کیوں ہوئی۔ 3 آئندہ زندگی میں کبھی وہ گناہ دوبارہ نہ کرنے کا پکا ارادہ کیا جائے 4 اگر گناہ کا تعلق کسی دوسرے انسان کے حق (مثلاً چوری، جھوٹ، غیبت، یا مالی نقصان) سے ہے، تو اس کا ازالہ کرنا، معافی مانگنا یا حق لوٹانا لازمی ہے۔ حدیث میں آتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! اللہ سے توبہ کرو اور بخشش چاہو، بیشک میں دن میں اللہ تعالیٰ سے سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ مسلمان کی گناہ سے توبہ یہ ہے کہ پھر کبھی اس گناہ کی طرف نہ جائے۔ (بیہقی)

جن لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی

اِنَّ	بیشک	الَّذِيۡنَ	وہ لوگ جنہوں نے
كَفَرُوۡا	کفر کیا	بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ	اپنے ایمان (لانے) کے بعد
ثُمَّ ازۡدَادُوۡا	پھر وہ بڑھتے گئے	كُفۡرًا	کفر میں
لَّنۡ تُقۡبَلَ	ہرگز نہیں قبول کی جائے گی	تَوۡبَتُهُمۡ	ان کی توبہ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ	اور یہی لوگ ہیں	الضَّآلُّوۡنَ	گمراہ۔(90)

فرمایا اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ ۔جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُهُمۡ ۚ ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں توبہ کی توفیق ہی نصیب نہیں ہوگی۔ورنہ توبہ کا عام اصول یہ ہے۔کہ جب تک انسان کے ہوش وحواس قائم ہیں اور اس پر غرغرے کی حالت طاری نہیں ہوتی،اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ہاں!اَلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ جولوگ برائیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔حتی کہ موت نظر آجاتی ہے۔ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔جب موت کے فرشتے نظر آنے لگیں، غیب کا پردہ اٹھ جائے تو پھر توبہ کا دروازہ بھی بند ہوجاتا ہے۔توبہ کی عدم قبولیت کا یہی معنی ہے۔ فرمایا وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾ یہی لوگ گمراہ ہیں۔انہیں توبہ کی توفیق ہی نصیب نہیں ہوئی۔

یہ آیت ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت موسیٰ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پر ایمان لانے کے بعد حضرت عیسیٰ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور انجیل کے ساتھ کفر کیا،پھر کفر میں اور بڑھے اور سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم اور قرآن کے ساتھ کفر کیا۔مطلب یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ جانتے تھے کہ یہی آخری نبی ہیں مگر آخر تک ایمان نہ لائے،بلکہ اپنے غلط عقیدوں کی وجہ سے لوگوں کو راہ راست سے بھٹکانے کی پوری کوشش کرتے رہے اور دین اسلام کے بارے میں غلط رویہ اختیار کرتے رہے لیکن جب موت کو قریب دیکھا تو توبہ کرنے لگے۔اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ اس وقت کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔پھر ان لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے کفر کی راہیں اختیار کیں اور پھر ایمان قبول کیے بغیر کفر کی ہی حالت میں فوت ہو گئے تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں جو موت کے بعد آئے گی اور جس میں حساب کتاب ہوگا تو وہ بڑا سخت ہوگا۔اسلامی تعلیمات کے مطابق،گناہوں سے سچی توبہ ہر وقت قبول ہوتی ہے،لیکن اس کی قبولیت دو مخصوص حالات میں ختم ہو جاتی ہے۔پہلا،جب انسان نزع کے عالم میں موت کے آثار دیکھ لے۔دوسرا،جب قیامت کے دن مغرب کی جانب سے سورج طلوع ہو۔موت کا وقت قریب آنے سے مراد وہ کیفیت ہے جسے "غرغرہ" کہا جاتا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"اللہ

تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک کہ اس کی جان گلے میں نہ پڑ جائے (یعنی نزع کا عالم شروع نہ ہو جائے)۔" اس کے علاوہ، جو لوگ کفر پر مرتے ہیں، ان کے لیے آخرت میں توبہ کا کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔

توبہ بندگی سے مشروط

اہل اللہ نے تائب کے لئے بعض امور کا بجالانا ضروری قرار دیا ہے۔ جن میں چند اہم ترین یہ ہیں: 1 نافرمانوں کی صحبت سے اجتناب کیا جائے۔ 2 تائب کو ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے۔ 3 کسی گناہ کو بھی معمولی خیال نہ کرے اور فضول کاموں سے الگ رہے۔ 4 جس گناہ سے توبہ کی اس کو کچھ اس طرح یاد رکھے کہ اس گناہ کا احساس اسے پریشان رکھے تاکہ آدابِ بندگی بجالاتا رہے اور کبھی بھی اس کی حلاوت محسوس نہ کرے بلکہ اس کی کڑواہٹ محسوس کرے اور اس سے سخت نفرت کرے۔ 6 حقوق العباد میں سے اگر کسی سے ناانصافی یا ظلم کر بیٹھے تو اولاً اس کے حقوق ادا کرے اور اگر یہ توفیق نہیں پاتا تو پھر اس سے معافی کا خواستگار ہو اور اللہ تعالیٰ سے عفو و درگزر کے لئے دست بہ دعا رہے۔ صحیح توبہ وہی ہے جو انسان کے شب و روز، افعال و اعمال اور حالات و کیفیات کو یکسر بدل کر رکھ دے۔ بندہ عبادت و ریاضت کا پیکر بن جائے اور رضائے الٰہی کا حصول اس کی خواہشات کا مرکز و محور بن جائے۔ توبہ اپنے محبوب کے ساتھ پھر سے جُڑ جانے کا نام ہے۔ گناہ نے محبت کی حرمت کو مجروح کیا تو گناہگار احساسِ گناہ سے بوجھل ہو گیا، محبوب سے شرم آنے لگی، عفو و بخشش کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ہاتھ کانپ گئے، پھر آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ایسی ہی توبہ مقبول ہے۔

روزِ قیامت دنیاوی مال و دولت، سفارش یا فدیہ کام نہ آئیگا

اِنَّ	بیشک	الَّذِيْنَ	وہ لوگ جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا

وَمَاتُوْا	اور وہ مر گئے	وَهُمْ كُفَّارٌ	اس حال میں کہ وہ کافر تھے
فَلَنْ يُّقْبَلَ	تو ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا	مِنْ اَحَدِهِمْ	ان میں سے کسی ایک سے
مِّلْءُ الْاَرْضِ	زمین بھر	ذَهَبًا	سونا (بھی)

وَّلَوِ	اور اگر چہ	افْتَدٰى	وہ فدیے میں دے دے		
بِهٖ	اس کو	اُولٰٓئِكَ	یہی لوگ ہیں	لَهُمْ	ان کے لیے
عَذَابٌ	عذاب	اَلِيْمٌ	دردناک	وَّمَا	اور نہیں (ہوگا)
لَهُمْ	ان کے لیے	مِّنْ نّٰصِرِيْنَ	کوئی مددگار۔		

فرمایا یاد رکھو اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ ۔ جن لوگوں نے کفر کیا اور پھر کفر کی حالت میں ہی ان کی موت واقع ہوئی، تو پھر ان کی حالت یہ ہوگی فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ کہ ان میں سے اگر کوئی شخص سونے سے بھری ہوئی زمین بھی فدیہ میں دینا چاہے گا، تو اس سے قبول نہیں کی جائے گی۔ اول تو یہ بات ویسے ہی محال ہے۔ کہ قیامت کے دن کسی شخص کی ملکیت میں زمین بھر سونا ہو اور وہ اسے اپنی جان کی خلاصی کے لیے دینا چاہے۔ تاہم اگر ایسا ہو بھی جائے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٩١﴾ یہ لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں اور کفر ہی کی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں۔ آخرت میں تو صرف وہ اعمال کام آئیں گے جو کسی نے اپنے لیے آگے بھیجے ہوں گے۔ اعمال کے سوا وہاں نہ مال و دولت کام آئے گا۔ نہ قرابتداری اور نہ سفارش۔ آیت مذکورہ میں جو صورت پیش کی گئی ہے۔ وہ بفرض تسلیم ہے۔ یعنی اگر کسی کافر کے پاس سونے کے ڈھیروں کے ڈھیر حتیٰ کہ زمین بھر سونا ہو تو اس کی آرزو یہی ہوگی کہ سب کچھ دے کر عذاب جہنم سے اپنی جان چھڑا لے۔ مگر وہاں یہ بات ناممکن ہوگی۔ چنانچہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ: آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب سے کم عذاب والے دوزخی سے فرمائیں گے اگر تیرے پاس دنیا و مافیہا ہو تو کیا تو اسے اپنے فدیہ میں دے دے گا؟ وہ کہے گا ہاں اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ جب تو دنیا میں تھا تو میں نے تجھ سے اس سے آسان تر بات طلب کی تھی۔ (کہ توحید پر قائم رہنا) اور کہا تھا کہ پھر میں تجھے جہنم میں داخل نہ کروں گا مگر تو شرک پر اڑا رہا (مسلم) آخرت

کی نجات ایمان پر خاتمے پر ہے۔اگر کوئی شخص تمام عمر مومن رہااور مرتے وقت کافر ہوگیا تو اس آیت میں شامل ہے اور اگر کوئی شخص ساری عمر کافر رہا لیکن مرتے وقت مومن ہو کر مرا تو وہ اس آیت سے خارج ہے۔اسی لئے صالحین یعنی نیک لوگ سب سے زیادہ فکر ایمان پر خاتمے ہی کی کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

بہت خاص ہوتی ہیں وہ زبانیں جو قرآن کریم کی دن رات تلاوت کرتی ہیں۔ یا اللہ ہمیں بھی ایسی زبان عطا فرما جو تیرے کلام پاک کی تلاوت سے تر رہے۔بہت خاص ہوتے ہیں وہ سینے جن میں قرآن محفوظ ہوتا ہے۔اللہ کریم ہمیں بھی ایسا سینہ عطا فرما جس میں تیرا کلام محفوظ ہو۔بہت خاص ہوتی ہیں وہ جوانیاں جو قرآن کریم سیکھنے میں گزر جاتی ہیں۔ یا ارحم الراحمین ہمیں بھی ایسی جوانی عطا فرما جو تیرا قرآن پاک سیکھنے سکھانے پر لگی رہے۔بہت خاص ہوتے ہیں وہ دل جو قرآن کی طرف جھکتے ہیں اور جڑ جاتے ہیں۔اللہ کریم ہمیں بھی ایسے دل عطا فرما جو تیرا فرمان سن کر اطاعت وفرمانبرداری کے لئے جھک جائیں۔بہت خاص ہوتی ہیں وہ آنکھیں جو قرآن کریم کو سنتے ہوئے آنسو بہاتی ہیں۔ یا اللہ ہمیں بھی ایسی آنکھیں عطا فرما جو تیرے خوف سے رونے والی ہوں۔بہت خاص ہوتی ہیں وہ سوچیں جو قرآن کریم کے لیے تدبر اور غور وفکر کرتی ہیں۔ یا اللہ ہماری سوچ کو بھی قرآن کریم میں غور وفکر کرنے والا بنا دے۔بہت خاص ہوتے ہیں وہ ہاتھ جو قرآن کریم لکھتے، سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔اے الہ العالمین ہمارے ہاتھوں کو قرآن کریم کی خدمت میں لگا دے۔

بہت خاص ہوتے ہیں وہ لوگ جو قرآن کریم کے احکامات کے مطابق ڈھلنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ یا اللہ ہمیں بھی اپنے کلام کے مطابق ڈھال دے اور ان مبارک اور مقدس فرامین پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عنایت فرما۔

اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي بِالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ وَاجْعَلْهُ لِي إِمَامًا وَنُورًا وَهُدًى وَرَحْمَةً، اللّٰهُمَّ ذَكِّرْنِي مِنْهُ مَا نَسِيتُ، وَعَلِّمْنِي مِنْهُ مَا جَهِلْتُ، وَارْزُقْنِي تِلَاوَتَهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَاجْعَلْهُ لِي حُجَّةً يَارَبَّ الْعَالَمِينَ○

ترجمہ: اے اللہ! قرآن کی برکت سے مجھ پر رحم فرما اور اسے میرے لیے رہنما، نور، ہدایت اور رحمت بنا دے۔ اے اللہ! اس میں سے جو میں بھول گیا ہوں مجھے یاد دلا دے اور جو نہیں معلوم وہ مجھے سکھا دے، اور مجھے رات کے اوقات اور دن کے اوقات میں اس کی تلاوت کی توفیق عطا فرما، اور اسے میرے حق میں حجت (دلیل) بنا دے، اے تمام جہانوں کے رب۔

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ تَعَلُّمِ الْقُرْآنِ وَتَعْلِيْمِهٖ

ترجمہ: اے اللہ قرآن سیکھنے اور سکھانے میں ہمارے لئے برکت عطا فرما۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو سنوارنے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العٰلمین

☆☆☆☆

ہماری دیگر مطبوعات

www.umarlibrary.org